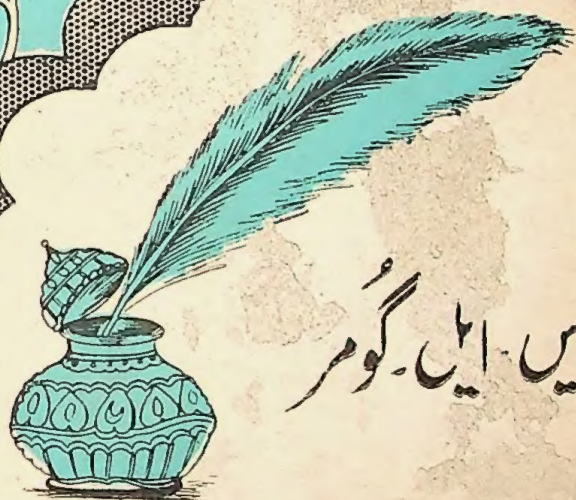


# تاریخ ادبیات ایران



ایں ایل گومر

کیوڑ برادر س سمرینگر









جملہ حقوق محفوظ ہیں

جدید ترین طبع

تاریخ ادبیات ایران  
آئینہ ادب فارسی  
مصنفہ

پروفیسر ایس۔ ایل۔ گومر، ایم۔ اے  
(یونیورسٹی گولڈ میڈلسٹ)

ناشران: میسٹر کمپور برادر سہک سہیلرز و سہیلشیرز  
پک ڈنگ جموں لال چوک سرنگر کشمیر

قیمت دس روپیہ

رہنما برس دہلی



## عرض حقیقت

ادبیات ایران کی تاریخ سے متعلق فارسی اور انگریزی زبان میں تصانیف کی کمی نہیں۔ لیکن اردو زبان میں ایسی کتابوں کی تعداد محدود ہے۔ اس موضوع پر اکثر تالیفات مخصوص مضامین اور عقیدوں اور پر مشتمل ہیں۔ اردو میں ایک ایسی کتاب کی کمی نہایت سے کھٹاک رہی تھی جو ہر لحاظ سے جامع ہو۔

بندہ نے یہ کتاب ”آئینہ ادب فارسی“ کے نام سے لکھی ہے۔ اور اس میں ادبیات ایران کے آغاز سے جدید دور تک بحث کی ہے۔ کمزور شعراء اور ادیبان پر کم اور بلند درجہ شاعروں اور شنگاروں پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ گو کتاب ہذا عام علم دوست حضرات اور تاریخ ادبیات فارسی کے شائقین کی دلچسپی کا موجب ہے لیکن طلباء کالج کے لیے بالخصوص مفید ہے۔ امتحان کے نقطہ نگاہ سے ان کی تمام ضرورتیں پوری ہوئی ہے۔ طلباء کی سہولت کے لئے مواد کو بصورت سوال و جواب مرتب کیا گیا ہے۔ جو اب بات نہ زیادہ طویل ہیں اور نہ ہی مختصر بلکہ سوال کے تقاضوں کے عین مطابق۔

چند قابل ذکر خصوصیات مذکورہ ذیل ہیں:-

- ۱۔ کتاب سادہ اور سلیس مگر بامحاورہ زبان میں لکھی گئی ہے۔
- ۲۔ طرز بیان دلکش اور موثر ہے۔

۳۔ تمام نامور اور عظیم الشان شعراء کے حالات زندگی کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کے کلام پر صبر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے

۳۔ شیخ ویر اور بلند درجہ انشا پر دازوں کے سوانح حیات کے ذکر کے علاوہ ان کی ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

۵۔ نثر و نظم کی تاریخ و تنقید کے ساتھ ساتھ ادبی تحریکات پر بھی توجہ دی گئی ہے۔

۶۔ ادبیات پر بحث کے دوران تاریخی تسلسل کو قائم رکھا گیا ہے۔

۷۔ کتاب کی تالیف میں متعدد مستند تصنیفات (اردو۔ فارسی اور انگریزی) سے استفادہ کیا گیا ہے اور تحقیق و تدقیق کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۸۔ گو کتاب کی ضخامت زیادہ نہیں لیکن تمام ضروری اذراہم مطالبہ و مضامین تفصیلاً بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اور کوئی کام کی بات نظر انداز نہیں کی گئی۔ گویا یہ کتاب ایسا نہ ہوگا کہ گزریں میں دریا بند ہے۔

اساتذہ کرام سے استدعا ہے کہ اگر کتاب ہذا کی کئی خامی یا غلطی ان کی نظر سے گزرے تو بندہ کی توجہ اس پر مبذول کر کے اپنی رائے صاحب سے مستفیض و ممنون فرمائیں۔ جدید ترین طبع پیش خدمت ہے۔

نیا نکشیں  
ایس۔ ایل۔ گوہر

دلی ۱۹۸۰ء عیسوی



## آئینہ ادب فارسی

## تاریخ ادبیات ایران

## فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۹	ایران پر عرب حملہ و غلبہ اثرات		۷	تعارف	
۳۴	دور سامانیہ		۱۳	زبان کی ابتدا اور ارتقا	۱
۱۳۴	ابوشکر بلخی - رودکی - دقیقی	۱	۱۳/۱۵	یک سجائی - پیوندی - ملتصق	۲
۴۵	سامانی دور کا نثری ادب	۲		اور منصرف زبانیں	
۴۸	غزنوی دور		۱۶	رسم الخط: ابتدا اور ارتقاء	
۴۸	سلطان محمود غزنوی	۱	۱۱۶/۱۸	خطاتی تقیری - مفہوم نویسی	۱
۵۱	عنصری - عسجدی - عسجدی	۲		سجائی یا تقطعی اور الف بائی	
	فرشی - منوچہری			رسم الخط	
۶۷	فردوسی شاہنامہ کی خصوصیات	۳	۱۸	ایرانی قدیم رسم الخط: اور ارتقا	۲
۷۳	غزنوی دور کے ادیب و علماء	۴	۱۹	ایران کی قدیم زبان اور ادب	
	مشہور		۱۹	مثنوی خدا اور کتبہ قدیم فارسی	۱
۷۷	سلجوقی دور		۲۳	اوستا	۲
۷۷	سلجوقی دور کی قصیدہ گوئی	۱	۲۵	پہلوی ادب	۳
	برکات		۲۶	خالد بن ابی یاسر کی کتابیں	۴
۸۱	سلجوقی خاندان - مشہور ادیب	۲	۲۶	سامانی خاندان	

نمبر شمار	مضمون	صفحه	نمبر شمار	مضمون	صفحه
۳	کلیله و دمنه سیاست نامه	۱۸۵	۱۸۰	تصوف کی تعریف و اهمیت	
	غرقه اسماعیلیه		۱۸۴	منگول اور تیموری دور	
۴	نحر یک اسماعیلہ حکیم ناصر خسرو	۱۹۳	۱۸۶	منگول جملہ ادبیات و آثار	
۵	صوفی شعراء اسماعیلیہ ابو الخیر			پراثرات	
	عبد اللہ انصاری		۱۸۹	منگول یا الیخانی دور کے	
	حکیم سنائی بابا باطاهر عطار	۱۰۱		تاریخ نگار	
۶	سلجوقی دور کے دیگر نامور	۱۱۱	۱۹۲/۲۰۰	شیخ سعدی محمود شبستری	
	شعراء اسدی - قطران		۲۰۲	مولانا رومی ہاشمی مثنوی	
۷	مسعود سعدی عمر خیام رباعیات	۱۱۵	۲۰۸/۲۱۲	کمال الدین اسماعیل و ہمدانی	
	خیام	۱۲۰	۲۱۱/۲	ابو خیام و عبد زکائی	
۸	ابو بحر علی - ابوری ادیب صابر	۱۲۳		خواجه کرمانی	
۹	رشید طوطا ظہیر قاریابی	۱۳۵	۲۱۶/۲۲۸	عراقی - ابن مبین سلطان ساوجی	
	جمال الدین اصفہانی		۲۳۶	خواجه حافظ - نور الدین جامی	
۱۰	ابوالفرج رونی - سوزنی	۱۴۶	۲۵۲	مغلیہ اور تیموری دور کا	
	عقرب بخاری			نثری ادب	
۱۱	خاقانی - بکیر الدین منلیقانی	۱۵۲	۲۵۳	تاریخ جہانگشاہ طبقات	
	نظامی			ناصری -	
۱۲	سلجوقیہ دور کا نثری ادب	۱۶۶	۲۵۴	نالیجی مبینی جہانگیر التواریخ	
	تصوف - تاریخ - ادب -		۲۵۵	تاریخ و تصانیف - تاریخ گزشتہ	
	اخلاق طغیہ سیاست		۲۵۵	زبدۃ التواریخ - مجلس قصصی	
۱۳	ادام غزالی - خوازم شامان	۱۷۶	۲۵۶	ظفر نامہ - رؤفۃ الصفا	
	پارنا		۲۵۷	لیلیا - اللیالیاب - المعجم	



شماره	مضمون	صفحه	شماره	مضمون	صفحه
۷	روضه الشهید اخلاق ناصری	۲۵۸	۵	ابواب الجنان - عین الحیات	۳۱۶
۸	اخلاق جمالی - اخلاق محسنی	۲۵۹		و غیره	
۹	انوار سبیلی	۲۶۰	۶	حج السلفاء - تسکین مسافر	۳۱۷
	صفوی اور قاجاری دور	۲۶۰		محاسن المؤمنین	
۱	قاسمی - وحشی - یزدی - قادری	۲۶۲	۷	ہفت اقلیم - آتش کده	۳۱۸
۲	نیشانی - فاضل - طاهر و جید فیض	۲۶۳		ریاض العارفین	
۳	مختصر کاشانی - عرفی - شیرازی	۲۶۵	۸	جمع الفصحی - نجوم السمار	۳۱۹
	شیخ یعقوب صرغی	۲۶۶		بزم آرا و غیرہ	
۴	صائب - نظری - فغانی	۲۶۷	۹	زبدۃ التواریخ - جمیع السیر	۳۱۹
	طاهر غفری - سیر و سیر	۲۶۸		نخل التواریخ	۳۲۰
۵	طائب - آملی - البطالب - کلیم	۲۸۵	۱۰	تاریخ عالم آرا - تاریخ نادری	۳۲۰
۶	ذبیحی - ہاتف - مجتہد - اصغری	۲۹۳		ناسخ التواریخ	۳۲۱
۷	نشاط - اصغری - فتح علی خاں قصبی	۲۹۸	۱۱	تخریب و تخریب گردانی	۳۲۲
۸	وصال شیرازی - مقام مقام	۳۱۱/۱۲	۱۲	تحریک بانی - تحریک بہائی	۳۲۳
۹	شیخ علی حشرین - لطف علی بیگ	۳۱۲/۵	۱۳	سیاحت نامہ	۳۲۳
۱۰	قاسمی - محمود خان ملک الشعراء	۳۰۶		شاعر اعظم غلام محمد قبال	۳۳۲
	صفوی اور قاجاری دور کا	۳۱۴		مرزا ابوالکاسم خاں پور داؤد	۳۳۳
۱	بریل خان طالع - نبات اللغات	۳۰۸	۱۴	ملک الشعراء بہار	۳۳۴
۲	فرنگ جہانگیر - فرنگ شیدی	۳۱۵	۱۵	اشرف گیلانی	۳۳۴
	رضا علی خاں ہدایت - رشید یاسمی	۳۱۶	۱۶	پروین اعتصامی	۳۳۶
۳	جمع الفرس - آملی - آرا	۳۱۷	۱۷	فارسی غزل کا ارتقا	۳۳۸
۴	جامع عباسی - اسرار الحکم	۳۱۹	۱۸	تالیفات	۳۳۸

## تعارف

ایران جس کا قدیم نام فارس (PERSIA) ہے ہندوستان کے ساتھ صدیوں پرانے روابط رکھتا ہے۔ بعض مورخین کا عقیدہ ہے کہ ان تعلقات کا آغاز ۵۲۲ ق۔ م سے ہوا جب ایران کے عظیم المرتبہ بادشاہ دارا نے اپنی سلطنت کو وسعت دی اور ہندوستان کی حدود تک اسے پہنچا دیا۔ کچھ محققین اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور ایرانیوں اور ہندوستان کے آریوں کو ایک ہی نسل یا قوم سے منسوب کرتے ہیں جو وسطی ایشیا میں رہتی تھی اور مختلف قبیلوں میں منقسم ہو کر ادھر ادھر پھیل گئی۔ اس کی ایک شاخ ایران میں آباد ہو گئی اور دوسری شاخ ہندوستان میں وارد ہوئی۔

تاریخ نگاروں نے اس قوم کے ابتدائی زمانہ، اصلی وطن، تہذیب اور تمدن اور زبان کے بارے میں بہت سے مختلف نظریے پیش کئے ہیں۔ ان نظریوں سے پیدا ہونے والی آخری اور قرین قیاس عقیدہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ قوم مذکور سے آریا، ایریا یا آریج قوم مراد ہے جس کا لفظی مطلب ہے ”دوست یا با وفا“ اس قوم کا اصلی وطن شمالی یورپ تھا اور یہیں سے یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے۔ ان لوگوں کو اٹھ بڑی بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ انہی شاخوں سے ایک شاخ ایران پہنچی اور اس خطے کو یہ نام دیا۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ آریا لوگ ایران میں دو ہزار برس قبل مسیح کے



لگ بھگ وارد ہوئے۔ بعضوں کا عقیدہ ہے کہ یہ آریہ چودھویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوئی۔ تاریخی تحقیقات اور اوستا نیز قدیم کتبوں کی روشنی میں یہ امر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندو کش کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہونے والے آریہ اور ایران، افغانستان، سیستان، خراسان، گرگان، البرز اور رے میں آباد ہونے والے آریہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے زیادہ اختلاف نہ رکھتے تھے۔

صرف زبان ہی کو لیجئے سنسکرت اور قدیم فارسی کے صدہا الفاظ اب بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ان زبانوں کے بولنے والے ضرور زمانہ قدیم میں اکٹھے مل جل کر رہتے تھے۔ مثال کے طور پر چند مترادف کلمات ذیل میں دیئے جاتے ہیں:-

سنسکرت	قدیم فارسی	موجودہ فارسی	اوستائی
ماتری	ماتر	مادر	x
بھراتا	براتا	برادر	براتا
نام	نام	نام	نیم
کرتم	کرتم	کریدہ (شدہ)	کرتم
داریہ	داریوش	داریوش	داریو
پس چاؤ	پساؤ	پس	پس جات
آب دم	آب دم	بودم	بوتم
آس	آا	بود	آس
سماتا	ہماتا	ہم مادر	ہمات

یوں تو نویں صدی قبل مسیح سے بہت پہلے تک کے متعلق مشہور ہے کہ باختر (BACTRIA) میں ایرانی سلطنت قائم تھی لیکن اسلام سے قطع نظر کسی ایرانی سلطنت کے قیام کے بارے میں سب سے پہلا تاریخی اشارہ نویں صدی قبل مسیح ہی میں ملتا ہے جبکہ اسیریا کے بادشاہوں کی توجہ میڈز کے علاقہ اقتدار کی طرف مبذول ہونے لگی۔ ایران کی تاریخ باقاعدہ طور پر کجیبر و اعظم (CYRUS THE GREAT) یعنی کوروش بزرگ سے شروع ہوتی ہے جس نے پہلے ہل بابل (BABYLON) اور اس کے قریب وحوار پر اپنا تسلط جما کر کجی منشلی خاندان کی بنیاد ڈالی ہخامنشی خاندان (ACHAEMENIAN DYNASTY) کے ارتقا کا آغاز فارس (PARS: PERSIS) سے ہوا جس کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ آج تک فارس سے مراد ایران کا ملک لیتے ہیں حالانکہ فارس ایران کا صرف ایک صوبہ یا حصہ تھا۔

کجیبر و اعظم نے جو ایرانی سلطنت کا بانی تھا ۵۵۹ ق۔ قبل مسیح سے ۵۲۹ ق۔ م تک حکومت کی۔ اس کا علاقہ سلطنت جنوب میں خلیج فارس سے لے کر شمال میں کوہ ارارات تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں فلسطین، شام اور اسیریا کے بادشاہوں کی عظیم سلطنت کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔

کجیبر و کے بعد اس کا بیٹا کیوجیبر (CMBYSUS) ۵۲۲ ق۔ م تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے باپ کی سلطنت کو وسعت دینے کے لئے مصر اور سیرینکا (CYRENAICA) کو فتح کیا۔ اس کے بعد اس نے حبشہ (ETHIOPIA) پر بھی چڑھائی کی لیکن ناکام ہوا۔ اس کی



وفات ۵۲۲ ق م میں ہوئی۔  
 اس سے داریوش (DARIUS) کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ دارا  
 داریوش نے سلطنت کو اور بھی وسیع کیا اور اپنی جہاد کو راجپوتانہ کے  
 ریگستان تک پھیلایا۔ امن و امان قائم کرنے کے بعد دارا نے اپنی  
 سلطنت کو چھوٹے چھوٹے حصوں یا صوبوں میں منقسم کر دیا۔ ہر حصے  
 کا نام سٹری (SATRAPY) رکھا اور اس حصے کے حکمران یا صوبہ دار  
 کو (SATRAP) کہا جاتا تھا۔ تجارت کی ترقی و سہولت کے لئے  
 دارا نے سونے اور چاندی کے سکہ جاری کیے۔ یونانیوں کا مقابلہ کرنے  
 کے لئے دارا نے ہندوستان کی فوجیوں سے بھی کام لیا۔ دارا کا شہری  
 زمانہ کئی باتوں کے لئے مشہور ہے جنہیں اولیات داریوش کہتے ہیں  
 مثلاً (۱) سندھ سے لیکر سیورین تک (۲) پہلا بحری سفر (۳) بحیرہ قزوین کا دریائے  
 نیل کے ڈیلٹا سے ملایا جانا (۴) ہندوستان میں ایک نائب (گورنر)  
 (SATRAP) کا قیام۔ (۵) تھریس اور مقدونیہ وغیرہ کو فتح کرنا۔ (۶)  
 سکرکین کی تعمیر۔ حکمہ ڈاک اور سرانرسائی کا قیام (۷) ایشیا کی یورپ کے  
 خلاف سب سے پہلی مہم یعنی بحیرہ اسود کے شمالی علاقہ پر حملہ وغیرہ۔  
 داریوش اول اعظم نے چھتیس سال حکومت کی یعنی ۵۲۲ ق م سے  
 ۴۸۵ ق م تک۔

اس کے بعد خشش (XERXES) تخت نشین ہوا۔ اس کو  
 یونانیوں کے ساتھ کئی معرکے لڑنے پڑے۔ اسی کے زمانے میں مشہور  
 عالم جنگ تھرموپلے بھی ہوئی جس میں سپارٹا والوں کو شکست ہوئی۔ بعد  
 میں اسے یونانیوں کے ہاتھوں سلیمیس (SALAMIS) کے مقام پر

شکست ہوئی اور قتل ہو گیا۔ اس کے بعد ملک میں فسادات اور قتل و غارت کا آغاز ہوا اور سلطنت کمزور ہو گئی۔ آخر دارا پوش سوم جو چھٹا منشی خاندان کا آخری بادشاہ تھا سکندر اعظم کے ہاتھوں ہار گیا۔ اور سائنہ ق م میں ملک پر یونانیوں کا قبضہ ہو گیا۔

آخر تیسری صدی عیسوی میں ایرانی نسل کا ایک حکمران اردشیر مہر ض وجود میں آیا۔ اور اس نے ایران کی عظمت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے مگر کیں تعمیر کیں۔ کئی شہر آباد کئے اور زرتشت کا مذہب پھیلایا جب عربوں نے ایران پر حملہ کیا تو کئی اہل زرتشت یعنی آتش پرست (پارسی) ایران سے بھاگ کر ہندوستان آ گئے۔ سورت کے راجہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور رہنے کی اجازت دے دی۔ یہ لوگ یعنی پارسی (اہل فارس) اب ہندوستان کے شہری ہیں۔ بھارتی زبان بولتے ہیں اور بمبئی اور سورت میں آباد ہیں ۶۵۰ء میں مسلمان عربوں نے ایران پر پورا پورا تسلط جما لیا اور تمام ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

گیارھویں صدی عیسوی میں عرب سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ ترکوں نے پے در پے اس پر حملے کئے۔ اس کے بعد منگوں نے حملہ کر دیا۔ ترکوں اور منگوں نے ایک مدت تک حکومت کی۔ آخر شاہ اسماعیل نے صفوی خاندان کی بنیاد رکھی اور امن و امان قائم کیا۔ اس کی حکومت سے ملک کو خوشحالی نصیب ہوئی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں پھر ایران بیرونی حملوں اور فتنہ جنگی کاشکار رہا۔ اور اس قدر کمزور ہو گیا کہ پہلے روسیوں اور پھر انگریزوں کے سایہ حفاظت میں رہا۔

۱۹۳۵ء میں فارس (PER SIA) کا نام سرکاری طور پر ایران رکھا گیا  
 برطانیہ نے وہاں تیل نکالنے اور صادرات کرنے کے حقوق حاصل کر لئے۔  
 ۱۹۴۱ء میں برطانیہ اور روس نے ایران پر قبضہ کر لیا اور رضا شاہ پہلوی کو تخت  
 سے اتار دیا اور موجود حکمران محمد رضا شاہ پہلوی کو اس کا جانشین مقرر کر دیا  
 موجودہ شہنشاہ عوام کی بہبودی اور ترقی کے لئے انتہائی کوشش کر رہے تھے  
 صنعت و حرفت خوب ترقی پ رہی۔ زرعی اصلاحات عمل میں آ رہی تھیں۔ زمین کو  
 کسانوں میں بانٹا جا رہا تھا۔ تعلیم کی اشاعت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی  
 جمہوری نظام حکومت قائم کر دیا گیا۔ لیکن عوام کی امیدیں پوری نہ ہوئیں۔  
 حالات بگڑ گئے۔

حال ہی میں (۱۹۷۹ء) ایرانی انقلاب پسندوں نے شاہ ایران کے  
 خلاف آیات اللہ روح اللہ خمینی کی زیر رہنمائی بڑے پیمانے پر بغاوت کر دی  
 قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔

شاہ ایران محمد رضا شاہ اپنی بیگم فرح دیبا اور بچوں کے ہمراہ ملک سے  
 بھاگ نکلا اور مشکل سے جان بچائی۔ اب وہ غیر ملکوں میں پناہ گزیں ہے  
 باغی انقلابی حکومت نے سینکڑوں سابق شاہ پرستوں، جرنیلوں، وزیروں  
 اور امیروں رئیسوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ شاہ اذراس کے  
 لواحقین کو بھی موت کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ جوہنی ان کی گرفتاری عمل  
 میں آئی انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔  
 سوال: زبان کی ابتدا اور ارتقا پر بحث کیجئے۔

جواب: زبانیں بھی انسانوں کی طرح وجود میں آتی ہیں۔ زندگی بسر کرتی  
 ہیں اور کئی ایک وجوہ یا حادثات کے سبب مدغم ہستی سے مٹ بھی جاتی



ہیں: علم الاسنہ کے علما کا عقیدہ ہے کہ اب کوئی نئی زبان عالم وجود میں نہیں آئے گی۔ کیونکہ اب روئے زمین پر کوئی فرد بشر یا قبیلہ موجود نہیں جو ایسی ابتدائی حالت میں ہو کہ بات چیت کرنے کے بھی قابل نہ ہو لہذا موجودہ زبانیں ہی ترقی کریں گی اور ہر زبان کے نئے سے کسی شاخیں پیدا ہوں گی۔ یہ زبان کی اندرونی ترقی ہوگی۔ البتہ کسی زبان میں دوسری زبان یا زبانوں کے اثر سے تغیر و تبدل ممکن ہے جس سے اس زبان کی قدیم اور جدید صورت میں نمایاں فرق ہو سکتا ہے۔

جو زبانیں متروک ہو چکی ہیں اور جن کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ان سے متعلق کوئی دستاویز دستیاب نہیں ہے محققین کا عقیدہ ہے کہ ابتدائی آدمی سوائے فریاد کرنے اور اشاروں کے اپنا مطلب کسی اور طریقے سے بیان نہیں کر سکتا تھا اس کے بعد جب اس نے ترقی کی تو اس کی زبان میں الفاظ شامل ہونے لگے۔ یہ الفاظ زیادہ تر ناموں اور قدرت کی آوازوں کی پیروی تھی۔ چنانچہ اب بھی موجودہ قوموں کی زبانوں میں اس تقلید کے آثار باقی ہیں۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ جوں جوں انسان ترقی کرنا گیا اس کی بولی کے الفاظ میں اضافہ ہونا گیا۔

فلاوجی (PHILOLOGY) (علم زبان) کے علما کا خیال ہے کہ

موجودہ دنیا کی تمام زبانیں تین زمروں یا گروہوں میں منقسم ہیں:-

(۱) ایک ہجائی یا ایک رکنی زبانیں:- ان زبانوں کو ایک ریشہ والی زبانوں کے نام سے بھی نامزد کرتے ہیں۔ کیونکہ ان زبانوں کے الفاظ ایک ریشہ یا مادہ پر مشتمل ہیں۔ ان سچوں یا مادوں کے شروع یا آخر میں کسی سابقہ یا لاحقہ کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ چینی۔ انامی اور سیامی زبانیں

اسی گروہ سے شمار ہوتی ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ ایک رشتہ والی زبانوں میں الفاظ کا ذخیرہ محدود ہے۔ چنانچہ جیتی لوگ اپنے خیال یا مطلب کے اظہار کے لئے مجبور ہیں کہ لفظوں (بچوں یا مادوں) کو آگے پیچھے کریں یعنی ان کو مختلف معیروں میں ترتیب دیں لب و لہجہ کی تبدیلی سے بھی مطلب سمجھا۔ تے میں مدد لی جاتی ہے۔

(۳) بیوندی یا ملتصق زبانیں۔ یہ زبانیں یک سجاوئی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان زبانوں کی لغت میں مشتقات (کلمات مشتق) بنانے کے لئے مادہ میں بچوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ان بچوں کے اضافہ سے مادہ یا ریشہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنی اصلی حالت میں قائم رہتا ہے۔ جس بچے کا اضافہ کیا جاتا ہے وہ پہلے بچے یا مادہ کے آخر میں محض چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ یہ ملتصق یا بیوندی زبانیں مندرجہ ذیل اقوام میں رائج ہیں:-

(۱) اورال کی زرد جلد والی قومیں مثلاً مغل۔ تاتار۔ ترک۔ ساموید وغیرہ۔

(ب) جاپانی و اہل کوریا۔

(ج) ہندوستان کے دراوڑ اور بانسک۔

(د) افریقہ میں نوبی لوگ (مصر کے جنوب میں) ہوت تہننت۔ کافر

سیاہ جلد والے لوگ۔

(ه) آسٹریلیا میں اصلی باشندے۔

(و) امریکا کے اصلی لوگ۔

(۴) منصرف زبانیں:- ان زبانوں کی لغات (الفاظ) میں مادہ یہ

بچوں کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن صرف آخر میں ہی نہیں بلکہ شروع میں بھی  
دوسری بات یہ ہے کہ بچوں کے اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادہ یا رشتہ  
تبدیل ہو جاتا ہے۔ بچوں کے اضافہ اور مادہ کے تغیر و تبدل سے زبان  
میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہر قسم کے خیالات و جذبات  
کے اظہار کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس گروہ میں دو قسم کی زبانیں شامل ہیں۔  
(۱) ہند و اروپائی، ہندوستان، یورپ، ایران وغیرہ کی زبانیں۔  
(۲) سامی زبانیں، عبرانی، زمانہ قدیم کی یابل کی زبانیں، آسوری  
فنیقی، قترانہ کے باشندوں کی زبان جمیری، عربی۔  
انڈوپوروپین (ہند و اروپائی) زبانوں سے مراد انڈو آریں، یونانی،  
اطالوی، سنسکرت، فارسی، انگلش وغیرہ ہیں۔

بعض فلاسفی کے ماہرین کا عقیدہ ہے کہ تیسرے گروہ کی زبانیں  
یعنی منصوفت زبانیں پہلے اور دوسرے گروہ کی زبانوں کے مرحلوں سے  
گذر کر اس درجے (تیسرے مرحلے) تک پہنچی ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ  
تمام زبانیں مذکورہ بالا تین مرحلوں سے نہیں گذریں۔ کیونکہ ایسی  
زبانیں بھی مشاہدہ میں آئی ہیں۔ جو پہلی یا دوسری منزل پر ہی رہ گئیں  
یا تیسری منزل تک پہنچنے سے پہلے پہلے صفحہ ہستی سے محو ہو گئیں۔  
پھر ملیں وہ زبانیں بھی ملتی ہیں جو کہ درمیانی مرحلہ پر واقع ہیں۔ پس  
ہمیں ان کو مختلط زبانیں کہنا چاہئے۔

سوال :- رسم الخط (SCRIPT) کی ابتدا اور ارتقا پر بحث کیجئے۔  
جواب :- علمائے السنہ کے عقیدے کے مطابق رسم الخط بھی زبان  
کی طرح طویل زمانہ کے دوران آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے وجود میں



آریا ہے۔ اور رفتہ رفتہ آخری یعنی موجودہ مرحلہ تک پہنچا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام اقوام نے رسم الخط کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے میں شرکت کی ہے۔ کیونکہ بہت سی اقوام نے دوسری اقوام سے اسے اختیار کیا ہے۔ اگر ہم رسم الخطوں کی تاریخ بیان کریں تو ہم اصل مضمون سے دور چلے جائیں گے۔ کیونکہ یہ بحث ایک علیحدہ مضمون ہوگا۔ ان مرحلوں کے درمیان جن سے رسم الخط گذر کر موجودہ درجہ تک پہنچا ہے پانچ نمایاں منزلیں ہیں :-

(۱) وہ مرحلہ جب انسان اپنے تخیالات کی ترجمانی کے لئے اشیاء کو علامات کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ مثلاً اب بھی ملایا کے بعض لوگوں کے درمیان یہ مروج ہے کہ نمک کو محبت کی علامت اور مرج سیاہ کو بغض و کینہ کی علامت جانتے ہیں۔ امریکہ کے وحشی باشندے ان گائیکوں سے جو وہ دھاگے میں دیتے ہیں یا سوراخوں کے ساتھ جو وہ درختوں کے پتوں میں کرتے ہیں اپنا مفہوم سمجھاتے ہیں۔ اس قسم کی علامات اکثر قوموں اور گروہوں میں مروج تھیں۔ ان میں سے ایک رسم الخط لکڑی کا تھا۔ جس کو بغیر سیاہی کے قدیم زمانے میں برتتے تھے۔

(۲) تصویری خط :- دوسرے مرحلے میں کسی چیز کو بیان کرنے پر مطالب ظاہر کرنے کے لئے اس چیز کی تصویر کھینچ دی جاتی تھی۔ مثلاً آفتاب رقم کرنے یا ظاہر کرنے کے لئے اس کی تصویر کھینچ دینے تھے کسی جانور کا نام لکھنے کے لئے اس کی شکل بنادی جاتی تھی۔ امریکہ کے بعض اصلی باشندوں میں اب بھی یہ خط مروج ہے۔

(۳) تیسرا مرحلہ مفہوم نویسی یا فکر نگاری (IDEOGRAPHY)

کا ہے۔ جوں جوں وقت گزرنا گیا دوں دوں کسی چیز کی تصویر کھینچنے کی وقت کو محسوس کیا گیا۔ اور اس مشکل کو دور کرنے کے لئے بجائے تمام یا پوری شکل کھینچنے کے اس کا صرف ایک حصہ ہی ظاہر کرنے لگے اس کے بعد جب یہ کام بھی مشکل نظر آنے لگا تو آہستہ آہستہ شکل کو اور کھٹاتے گئے اور مختصر سے مختصر کر کرتے گئے یہاں تک کہ تصویر صرف علامت میں بدل گئی۔ اور اس کو بھی حقیقی معنوں سے بڑھا کر مجازی معنوں میں استعمال کرنے لگے۔

اس ترتیب سے جو علامت اور حرکت تحریر کرتے وہ کلمہ یا مفہوم پر دلالت کرتا۔ قدیم مصریوں کا خط ایسا ہی تھا۔ قدیم سومری۔ بابلی اور ایرانی رسم الخط اگرچہ اس مرحلے سے گزر چکے ہیں اور ترقی کر گئے ہیں۔ پھر بھی ایسی علامتیں موجود ہیں جو کلمات پر دلالت کرتی ہیں۔ ایرانی (میخی) رسم الخط میں چار علامتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کسی کلمہ پر دلالت کرتی ہے حساب میں خاص طور پر مفہوم نویسی کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ وہ علامات ارقام میں مستعمل ہیں مثلاً ہم جب "+" لکھتے ہیں تو اسے "جمع" پڑھتے ہیں۔ جب علامت ÷ لکھتے ہیں تو اسے تقسیم پڑھتے ہیں۔

۴۔ چوتھا مرحلہ ہجائی یا تقطیعی رسم الخط ہے۔ اس مرحلہ میں ہر سچے کے لئے ایک علامت ہے۔ یہ علامت آواز کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ ایک سچے یا چند حروف کے مجموعے کو اس رسم الخط کو سمجھنے کے لئے موجودہ (الف بانی) رسم الخط کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ جبکہ اسے بغیر اعراب (زیر۔ زبر۔ پیش) کے لکھیں۔ اگرچہ یہ خط بچوں اور الف با سے مرکب ہے تاہم زیادہ تر بچوں والا ہے۔ سومری اور بابلی رسم الخط، بچوں والے تھے

اور مفہوم نویسی پر مبنی تھے۔

(۵) الف باقی رسم الخط :- یہ وہ رسم الخط ہے جس میں ہر آواز کے لئے ایک علامت یا حرف ہے۔ جیسے کہ عام جدید رسم الخط عربی۔ سنسکرت فارسی۔ انگریزی وغیرہ ہیں یورپ کے موجودہ رسم الخط الف باقی ہیں۔ قدیم رسم الخطوں میں اوستا کا رسم الخط پورے طور سے الف باقی تھا۔ فنیقیوں نے عبرانیوں سے رسم الخط مستعار لیا اور پھر برعظم یورپ میں پھیلایا بعض کی رائے ہے کہ انہوں نے یہ خط اہل مصر سے لیا۔ آرامیوں اور قبطیوں نے عبرانی خط اخذ کیا۔ اور اس کو مختلف شکلیں دیں۔ آرامی رسم الخط سے پہلوی اور قبطی رسم الخط پیدا ہوئے۔ ان رسم الخطوں سے ایسا رسم الخط وجود میں آیا جو ایشیا اور افریقہ میں مروج ہوا چینی رسم الخط ان خطوں سے مستثنیٰ ہے اور کسی دوسرے منبع سے نکلا ہے۔ جاپان۔ سیام اور کوریا کے باشندوں کے رسم الخط چین کے رسم الخط سے ماخوذ ہیں۔ سوال :- ایرانی رسم الخط (قدیم) کی ابتدا اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالئے۔ جواب :- اسلام کے غلبہ سے پہلے ایران میں تین قسم کے رسم الخط مروج تھے۔ (۱) منی خط (۲) اوستائی خط (۳) پہلوی خط۔ قدیم ایرانی بادشاہوں کے کتبے منی خط میں تھے۔ پہلوی زبان کی کتابیں پہلوی رسم الخط میں لکھی گئیں۔ اور قدیم آتش پرستوں کی مذہبی کتاب اوستا، اوستائی زبان اور اوستائی خط میں مرقوم ہوئی۔ اسلام کی فتح کے بعد ایران میں عربی زبان کو ترقی ملی اور قدیم رسم الخطوں کی جگہ عربی رسم الخط مروج ہو گیا۔ گو فارسی زبان نے عربی زبان اور ادب کے اثرات قبول کئے مگر اپنی اصل اور ماہیت کو قائم رکھا موجودہ فارسی زبان ایران کی اپنی قومی زبان ہے لیکن



رسم الخط غیر ملکی یعنی عربی ہے۔ ایران کے قدیم قومی رسم الخط کا ذکر حسب ذیل ہے:-

(۱) میخی خط :- اس رسم الخط کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس خط کے اجزاء یا حروف کی صورت میخ یا کیل سے ملتی جلتی ہے۔ شروع شروع میں یہ خط بھی تصویری (HIEROGLYPH) تھا۔ بعد میں علامت نگار - پھر مفہوم نگار (IDEOGRAPH) اور آخر میں الف بائی یا حرف نگار (ALPHABETICAL) بن گیا۔ یورپی محققین کا عقیدہ ہے کہ ہخامنشی خاندان کے آغاز میں ایرانیوں نے اسیریا کے رسم الخط سے جو مفہوم نگاری (IDEOGRAM) کے مرحلے میں تھا اپنا رسم الخط وضع کیا۔ اور اپنے میخی خط کو دوسرے تمام میخی خطوں مثلاً بابلی وغیرہ سے زیادہ سادہ اور صحیح بنایا اور بابلی (مفہوم نگار) خط کو ایسی حروف یا حروف تہجی میں تبدیل کر لیا۔ بابلی خط میں بہت سی اصلاح تھی۔ ٹیڑھی میڑھی میخوں یا خطوط کو ترک کر دیا۔ اور صرف سیدھی سادی لکیروں یعنی افقی اور عمودی میخوں کو اپنالیا۔ ہخامنشی دور کے قدیم کتبے اسی رسم الخط میں ہیں اس رسم الخط کے حروف تہجی کی تعداد چھتیس (۳۶) ہے۔ ان چھتیس حروف کے علاوہ ایک ٹیڑھی میخ بائیں سے دائیں بنائی جاتی ہے۔ جو خط فاصل کی علامت ہے۔ نیز ایرانی میخی خط میں پانچ مفہوم نگار علامات بھی ہیں۔

(۲) اوستائی خط :- یہ رسم الخط ایرانیوں نے سامی خط سے اخذ کیا تھا چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران میخی خط کے ساتھ ساتھ اوستائی خط بھی مستعمل تھا۔ میخی خط پیغروں پر کتبے کندہ کرنے کے لئے مخصوص تھا جبکہ

اوستائی خط تحریروں میں کام آتا تھا اور ایران قدیم کی غریبی کتاب "اوستا" اسی خط میں لکھی گئی تھی۔ یہ خط بھی سامی خط کے مانند بائیں سے دائیں لکھا جاتا ہے اس خط کے حروف تہجی کی تعداد چوبیس (۲۴) ہے۔ ان حروف میں تمام آوازیں اور اعراب (زیر، زیر، پیش) داخل ہیں۔ یہلوی حروف میں یہ نقص تھا کہ ایک حرف کی مختلف آوازوں کو ظاہر کرتا تھا جس سے پڑھنے لکھنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ قدیم ایرانی عالموں نے اس نقص کو دور کر دیا۔ اور ایک حرف صرف ایک آواز کے لئے وقف کر دیا جس سے رسم الخط آسان اور صحیح ہو گیا۔

(۳) پہلوی خط۔ اہل تحقیق کے مطابق "پہلوی" میں یاے نسبتی ہے یعنی پہلو سے تعلق رکھنے والی "پہلو" بگڑی ہوئی صورت ہے "پہلو" کی "پہلو" "پیشو" سے نکلا ہے۔ اور ش بدل کر ہ بن گئی۔ "پیشو" دراصل "پیشو" تھا۔ کیونکہ "ر" بدل کر "ل" کی صورت ہو گئی۔ "پیشو" پر "شو" پر "پیشو" کا نام ہے۔ جب اس اشکانی قوم "پیشو" کا اقتدار ملک ایران پر چھا گیا تو فارسی زبان کا نام بھی اسی قوم کے نام پر پہلوی ہو گیا اور اس زبان کا رسم الخط بھی پہلوی خط کہلایا۔ پہلوی زبان اشکانی اور ساسانی دور کی زبان تھی جو درحقیقت قدیم فارسی زبان اور موجودہ فارسی زبان کے درمیان کی گڑھی ہے۔ اگر موجودہ فارسی زبان سے عربی الفاظ نکال دیئے جائیں تو اس کی صورت بہت حد تک پہلوی زبان سے ملتی ہے۔ شاہنامہ فردوسی کی زبان بھی پہلوی زبان کے قریب ہے۔

پہلوی رسم الخط آرامی خط سے ماخوذ ہے۔ یہ خط دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے۔ پہلوی خط کی دو صورتیں ہیں۔ ایک قدیم خط یا خط کلدہ

جو کتبوں کے سوا کہیں باقی نہیں۔ دوسری صورت کتابی یا ساسانی خط ہے۔ اس خط میں ساسانی عہد کی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ساسانی یادداشتوں کی بنائی ہوئی یادگاروں۔ تختوں سنگیوں۔ چھروں اور سنگوں وغیرہ پر بھی پہلوی تحریریں موجود ہیں۔

پہلوی رسم الخط کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس خط میں سامی زبان کے جوہر سے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ وہ فارسی یعنی پہلوی زبان میں پڑھے جاتے ہیں۔ ایسی مثال اردو میں بھی موجود ہے۔ مثلاً عربی علامت عہ جس کا مطلب عشر ہے عربی صورت میں لکھی جاتی ہے لیکن اسے پڑھنے میں ”دس“ کہا جاتا ہے جو اردو عہ ہے۔ پہلوی زبان میں پڑھنے کے اس طرز کو ”ہزدارش“ کہتے ہیں۔

سوال: ایران کی قدیم زبان اور ادب (قبل اسلام) پر مفصل نوٹ لکھئے۔

جواب: یعنی خلا اور کتب قدیم فارسی ہیں: ایرانی ادب کا آغاز تاریخی طور پر داریوش اعظم (۵۵۰ ق۔ م تا ۴۸۵ ق۔ م) کے وقت سے وجود میں آتا ہے۔ داریوش اعظم اپنے پیشرو ہخامنشی بادشاہوں پر کئی ایک لحاظ سے گئے سبقت لے گیا۔ اس کی وسیع فتوحات اور امور سلطنت کی تنظیم قابل ذکر ہے۔ اس نے عظیم الشان تعمیرات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ تخت جمشید (PERSEPOLIS) کے مقام پر کی دیواریں اور ستون اس کی عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ تخت جمشید شیراز کے شمال مشرق میں چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اسی جگہ داریوش اعظم نے اپنی فتوحات کی بے نظیر یادگاریں قائم کیں۔ اس نے



اس جگہ اور کئی مقامات پر شاہی احکام کندہ کروائے۔ یہ تمام کتبے اور نقوش قدیم فارسی زبان اور مہی رسم الخط میں ہیں۔ دار یوشن اعظم کے ہانشین بادشاہوں خشا پاشا۔ اردشیر اول۔ اردشیر دوم۔ کوروش خرد اور اردشیر سوم نے بھی اپنے اپنے کتبے۔ احکام اور واردات مہی خط میں چٹانوں۔ پتھروں وغیرہ پر کندہ کروائے۔ ان مہی کتبوں میں زیادہ مشہور اور قابل ذکر کتبے تخت جمشید۔ نقش رجب۔ نقش رستم۔ دشت مرغاب کمرانشاہ سے قریب کوہ بے ستون اور ہمدان سے قریب کوہ الوند میں موجود ہیں۔ صحیح معنوں میں ادبیات ایران کی بنیاد انہی کتبوں پر ہے ان کتبوں میں دار یوشن نے اپنے فرمان۔ اپنی عظیم فتوحات کے تذکرے اور اپنے شجرہ نسب کے ساقہ کی دوسرے امور اور واقعات کھدوائے۔ آج کے ایران کی زبان انہی کتبوں کی قدیم فارسی زبان سے نکلی ہوئی ہے۔

مشہور جرمن محقق ڈارمیٹر کے بیان کے مطابق ان کتبوں میں مختلف الفاظ کی مجموعی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں۔ ان کتبوں کے مضامین سے ہخامنشی وقتوں کے ایرانیوں کا مذہب صاف ظاہر ہے۔ وہ تو حید الہی کے قائل تھے۔ ان کا سب سے بڑا پاک ترین خدا آہرامزدا (AHURA MAZDA) تھا اور ہر کام شروع کرتے وقت وہ اس خدا سے امداد کی دعا کرتے تھے۔ اور کامیابی کو اسی کی عنایت کا نتیجہ جانتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کتبوں کے بغیر ہمارے لئے قدیم پارسی یا فارسی کا تاریخی مطالعہ اور آج سے قریباً اڑھائی ہزار سال پہلے کے

ایرانیوں کا مذہب معلوم کرنا ایک مشکل بلکہ ناممکن کام ہو جاتا۔

میںجی زبان (قدیم فارسی) اور کتبوں کے علاوہ قدیم ایران کی زبان  
’اوستا‘ تھی جو اصل میں قدیم فارسی سے رشتہ رکھتی تھی۔ جہاں قدیم فارسی  
کتبوں میں مستعمل تھی وہاں اوستا کتابی زبان تھی۔ یہ زبان ایران کے شمال  
میں رائج تھی اور زیادہ تر مذہبی پیشواؤں اور مقدس کتابوں کی زبان تھی۔

اوستا:۔ ایران قدیم کے سب سے پہلے پیغمبر زرتشت (ZORASTER)  
نے دین آتش پرستی کی بنیاد ڈالی۔ اس کی تعلیم اوستا میں شامل ہے جس میں خدا  
برتر میں کی تعریف کے ساتھ ساتھ دعا کے گیت بھی ملتے ہیں۔ زرتشت کی امت  
اوستا کو الہامی کتاب مانتی ہے۔ اصلی اوستا موجودہ کتاب سے بہت زیادہ  
ضخیم تھی۔ پارسی روایات کے مطابق آساسانی بادشاہوں کے وقت میں اوستا  
کے حصے اکیس کتابوں پر مشتمل تھے۔ ہم تک صرف ایک مکمل کتاب اور چند  
متفرق غیر مکمل حصے پہنچے ہیں۔ اوستا کا وہ حصہ جس میں چھوٹی چھوٹی  
دعاؤں میں خوردا اوستا کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مقدس گیت

(GATHAS) ہی زرتشت کے اپنے دماغ کا نتیجہ ہوں۔ پروفیسر جیکسن  
کو ان میں خاص شہرت نظر آتی ہے۔ ان کی تعداد سترہ ہے۔ اوستا کا قدیم  
ترین حصہ ہی ہیں۔ انہیں صحیفہ صغرا بھی کہا جاتا ہے۔ ڈارمیسیٹر کا عقیدہ ہے  
کہ سکندر اعظم کے حملہ کے دوران اوستا ضائع ہو گئی تھی اور موجودہ اوستا  
پارتھین اور آساسانی بادشاہوں کے حکم سے جمع اور مرتب کی گئی۔  
اوستا کو عام طور پر چھ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:-

(۱) یسنا (YASNA) اس میں گیت (گائٹھان) بھی شامل ہیں۔ یسنا

سے مراد پوجا اور لگیہ ہے۔

(۲) و سپرد (VISPERED) اس کے لفظی معنی ”جمہور یا عوام“ کے ہیں۔ اس میں عام لوگوں کے لئے مذہبی رسوم و قواعد ہیں۔  
(۳) یشت (YASHTS) اس میں خدائے برتر میں کی حمد میں اکسین بکھین ہیں۔

(۴) خرد اوستا (MINOR TEXTS)

(۵) وندیداد (VENDIDAD) مذہبی قوانین اور قصے کہانیاں اور شیاطین کے خلاف قانون۔  
(۶) بد و ہوکت نسک کے اجزاء۔  
اوستا میں جس مذہب کی تلقین کی گئی ہے اس کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے۔

خیالات پسندیدہ (HUMATA)

اقوال پسندیدہ (HUOCHTA)

اعمال پسندیدہ (HUWURSHTA)

اوستا کی ادبی خصوصیات:۔ اوستا کے کچھ حصے ادبی محاسن کے حامل ہیں۔ ان میں خدا کی تعریف فصیح اور دلکش الفاظ اور انداز میں کی گئی ہے۔ ان میں قدرت کے مناظر کا بیان بھی قابلِ داد ہے بعض حصے منظم اور منقفی ہیں گاتھا (گیت) میں نغمے۔ دعائیں اور بلند و نرمہ اخلاقی اشعار ہیں۔ پہلوی زبان اور ادب:۔ ساسانی خاندان کے عہد کی ایرانی زبان کیو بہاوی کہتے ہیں دراصل یہ قدیم فارسی کی ایک شاخ ہے۔ اسے درمیان پارسی بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ قدیم فارسی اور مہرودہ فارسی کے درمیان ایک کڑی کا کام کرتی ہے۔ اگرچہ کل کی فارسی زبان سے



عربی زبان کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو اس خالص فارسی زبان کی قدیم اور متروک شکل پہلوی زبان کے قریب پہنچ جائے گی۔ شرف میں تو لفظ "پہلوی" اس رسم الخط کے لئے وضع ہوا تھا جس میں ساسانی عہد کی درباری زبان لکھی جاتی تھی مگر عام استعمال نے اس لفظ کا مفہوم رسم الخط کی بجائے خود ایرانی زبان ہو گیا۔

پہلوی زبان کا ادب مکمل طور پر زرتشت کے مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اکثر اخلاقی اور مذہبی اصولوں کے اظہار پر مشتمل ہے اور ادب کے متن۔ اوستا کی شرح اور دوسرے دینی مسائل سے متعلق ہے۔

پہلوی ادب :-

(۱) اوستا کے پہلوی ترجمے۔ تقریباً ۲۷ کتابیں یا غیر مکمل رسالے جو ایک لاکھ اکیالیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہیں۔

(۲) مذہبی موضوع پر کتابیں۔ تعداد میں تقریباً پچپن۔ چار لاکھ چھیالیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہیں :-

(الف) دینکرت۔ آتش پرستوں کے اصولوں۔ رسم و رواج روایات۔ تاریخ و ادب کے متعلق اطلاعات کا ذخیرہ۔

(ب) ہندامشن۔ مذہب کے متعلق ضخیم واقفیت۔

(ج) مینوے نورد۔ لڑائی کے قول کے مطابق کتابی پہلوی کی تعلیم شروع کرنے کو یہ ایک بہترین کتاب ہے۔

(د) خالص ادبی یا تاریخی کتابیں۔ تعداد میں گیارہ۔

(الف) پارسیوں کے اجتماعی نظام کے اصول۔

(ب) شاہنامہ ہیلوی یا شاہنامہ گشتا سب (تاریخی ناول)  
 (ج) کارنامک از خستہر بابکاں - تاریخی ناول -  
 دقیقہ اور فردوسی نے شاہنامہ لکھنے میں اتنی دو تاریخی ناولوں  
 سے استفادہ کیا۔

(د) خسرو کا وفات اور اس کے ساتی کی کہانی۔

(۵) خطوط نولسی کے نمونے۔

(۶) شطرنج کی تاریخ وغیرہ۔

سوال: ساسانی خاندان پر ایک مختصر نوٹ لکھئے :-

جواب: ساسانی خاندان (۲۲۶ء تا ۶۵۱ء) سکندر اعظم کے  
 ہاتھوں ہجرت منشی خاندان کا صفایا ہو جانے کے بعد ایران پر پارٹھیا  
 کا اقتدار ہو گیا۔ آخر پارٹھیا کا اقتدار بھی ختم ہونے لگا۔ ایران میں مغرب  
 کے اثرات کے خلاف ایک سیاسی اور قومی بغاوت سی نمودار ہوئی  
 جس نے زرتشت کے مذہب کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔ خالص ایرانی  
 جذبات تمام ملک پر چھا گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۲۶ء میں اردشیر بابکاں  
 ساسانی خاندان کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایرانی یا پارٹھیاؤں  
 کی نسل سے تھا اور اپنا شجرہ نسب ہجرت منشی خاندان کے ساتھ  
 ملانے میں جائز فخر کرتا۔ اردشیر کا سب سے بڑا کارنامہ شاید یہ ہے  
 کہ اس کے عہد میں اوستا کو نئے سرے سے ترتیب دی گئی۔

ساسانی خاندان کی شوکت میں ہجرت منشی وقار کی جھلک جا بجا پائی  
 جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس خاندان کی تاریخ بھی روشن  
 ہے اور مستند۔ ساسانی عہد کے نفوش اور یادگاریں عرب اور ایرانی

مورتوں کی کوششوں کو خوب چمکار رہی ہیں۔ مختلف قوموں کے افسانہ نگاروں نے ساسانی عہد کے متعلق بیش قیمت شاہکار پیش کئے ہیں اس خاندان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اردشیر کا باپ ساسان تھا۔ جو داریوش بزرگ کی اولاد سے تھا۔ ساسانی عہد کے ایران میں بادشاہ کو خدا کا نائب اور حکومت کا واحد اور جائز حصار خیال کیا جاتا تھا۔ شاید اسی عظمت اور وقار کے حاصل کرنے کے ساسانیوں کا شجرہ نسب حضرت زرتشت کے محافظ گشتاسپ سے ملا دیا گیا تھا۔

اردشیر کے وقت سے ایران کی باقاعدہ تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اردشیر کے بعد اس کا بیٹا شاہپور اول تخت پر بیٹھا۔ اس نے یونانیوں پر بہت سی فتوحات حاصل کیں اور ان فتوحات کی خوشی میں نقش رستم اور شاپور کی سی یادگاریں قائم کیں۔ مانی جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا شاپور کے وقت ہی میں ہوا ہے۔ پہلے تو بادشاہ اس پر مہربان تھا۔ آخر کسی بات پر ناراض ہو گیا۔ اور مانی کو ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔

شاہپور اول کے بعد ہرمس واس۔ بہرام اول اور بہرام ثانی وغیرہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے بعد شاپور اعظم تخت پر بیٹھا۔ اس کا عہد عظیم فتوحات اور جہموں کے لئے مشہور ہے شاپور اعظم کے وقت میں عیسائی مذہب پر بہت سی سختیاں کی گئیں۔ شاپور اعظم نے ستر سال تک حکومت کی۔ اور مکہ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اردشیر ثانی شاپور سوم اور بہرام چہارم۔ یزدجرد اور بہرام گور وغیرہ تخت پر بیٹھے۔ ان کے بعد قباد بادشاہ بنا۔ مزدک جس نے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا

تھا۔ قباد کے وقت میں سب سے پہلے قباد کے بعد نو شیر واکاں عادل نے تخت ساسانی کو زینت بخشی۔ اس کا نام انصاف۔ سیاسی تنظیم اور فتوحات کے لئے زندہ جاوید ہے۔

تمام ساسانی بادشاہ زرتشت کے مذہب پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کا زمانہ ملکی اور ملی تاریخ میں ایک روشن انقلاب کا زمانہ ہے۔ ایرانی فوج نے اپنی عظیم طاقت کا سکہ سارے یورپ کے دل پر بٹھایا۔ سترگوں۔ پیلوں۔ شہروں اور رفاہ عامہ کے دوسرے کاموں کی طرف ساسانی بادشاہ خاص توجہ دیتے تھے۔ لڑائی کے فن نے بہت ترقی کی یہ عہد پہلی زبان کے عروج کا عہد ہے۔ بہت سی کتابوں کے پہلوی میں ترجمے کئے گئے۔ مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں۔

اس عہد کی تعمیریں بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ فیروز آباد محل۔ طاق کسری۔ قصر شبریں۔ نقش رستم۔ خسرو پرویز کے شکار کے مناظر۔ شاپور اول کا بت۔ سوسے چاندی کا کام اور کئی دوسرے قنون لطیفہ ساسانی آرٹ کی خوب ترجمانی کرتے ہیں۔ خسرو پرویز کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔

یزدجرد سوم تھا تو جنگ جو بادشاہوں کی اولاد سے۔ لیکن اس کی بزدلی ساسانی خاندان کے ماتھے پر ایک بدنامہ صبیہ ہے۔ یوں تو اس کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے ہی ساسانی ستون متزلزل ہونے لگے تھے مگر عرب جرنیلوں کے ہاتھوں اس عظیم خاندان پر جو ضرب کاری لگی وہ یزدجرد کی قسمت میں لکھی تھی۔ اس نے ۶۵۱ء میں وفات پائی۔ سوال۔ ایران پر عرب حملہ اور غلبہ کے اثرات واضح کیجئے۔



جواب: ۱۵۹ء میں ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدجرد سوم نے عرب فاتحین کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اہل عرب کی فتوحات اسلام کی ترقی اور اشاعت کا موجب بنیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اہل فارس کو بادل ناخواستہ اپنا قدیم مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنا پڑا۔ عربوں کے اثرات ایران کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑے۔ پہلوی زبان نے عربی کے لئے جگہ خالی کر دی۔ نو مسلموں کے لئے عربی زبان کی تعلیم ناگزیر ہو گئی۔ دفاتر اور دربار کی زبان بھی عربی ہو گئی۔ بادشاہی فرمانوں سے لے کر دفعوں کے احکام تک اسی زبان میں جاری ہوئے لگے۔ اُسی میں خط و کتابت ہونے لگی۔ الفقہ جملہ علوم و فنون نے عربی چولہا پہن لیا۔ یہاں تک کہ ایران دوست اہل فہم کی زبان پر بھی عربی کے الفاظ روانی اور بے تکلفی سے پھرنے لگے۔ بہت سے ایرانی عاملوں نے عربی زبان میں شعر بھی کہے۔ عربوں کے غلبہ کے بعد صدیوں تک عربی زبان میں مذہبی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ گویا عربی ایران کی نہ صرف سرکاری بلکہ ادبی زبان بھی بن گئی۔ فارسی کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوتی گئی۔ کیونکہ اس زمانے میں مسلمان قرآن کے سوا ہر کتاب کو اور عربی زبان کے سوا ہر زبان کو ناقابل توجہ سمجھتے تھے۔ فارسی کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پہلوی کے مقابلے میں عربی زبان زیادہ وسیع اور فصیح ہے اور ہر قسم کے خیال ادا کرنے پر حاوی ہے۔ عربی جاننے اور لکھنے والے ایرانیوں میں ذیل کی شخصیتیں قابل ذکر ہیں۔

عرب دور حکومت میں ابن مقفع کا نام صفتِ اول کے ایرانی علمائے

عربی میں شامل ہے۔ وہ پہلوی اور عربی دونوں زبانوں کا عالم تھا۔ اس نے ”تخلیہ و دمنہ“ نام کی کتاب پہلوی سے عربی میں منتقل کی۔ یہ سنسکرت کی کتاب ہتھوایش کا ترجمہ ہے۔ اور عربی کے نثری ادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔ ابن مقفع نے ایک اور پہلوی تصنیف ”خداینامک“ کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ مگر سوائے اقتباسات کے یہ کتاب مفقود ہو چکی ہے۔ وہ یونانی فلسفہ سے بھی واقف تھا۔

عربی کے ایک اور عظیم المرتبہ ایرانی عالم ہوئے ہیں جن کا نام امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت ہے۔ آپ حنفی مذہب کے بانی اور علم فقہ کے بڑے عالم شمار کئے جاتے ہیں۔

سیبویہ نحوی نام کے ایک اور ایرانی عالم ہوئے ہیں۔ انہوں نے صرف و نحو کے مسائل پر ایک نہایت اہم اور مستند کتاب لکھی جس کا نام ”الکتاب“ ہے۔ اس میں عربی زبان کے اصول و قواعد کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایران نے عربی زبان کے شاعر بھی پیدا کئے ان میں بشیر اور ابونواس کے نام قابل ذکر ہیں۔ بشیر پیدائش سے ہی اندھا تھا اور عباسیوں کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے قصیدے لکھے اور قصیدہ گو کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ابونواس کے دلکش اشعار اور دیوان باقی ہے۔ یہ بھی عباسی خلفا کا درباری شاعر تھا۔

خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں موسیٰ بن شاہر خوارزمی ایک اعلیٰ پایہ کا منجم تھا۔ یہ ایرانی علم ہندسہ کا ماہر تھا۔ اس کے بیٹے محمد۔ احمد اور حسن بھی تیسری صدی ہجری کے بزرگ ترین علما میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے یونان کی علمی کتابیں جمع کیں اور بڑی محنت و زحمت کے ساتھ انہیں

عربی زبان میں ڈھالا۔ علم ہندسہ۔ حساب۔ اقلیدس اور محیطی کے استناد تھے۔ احمد نے ماموں کے حکم پر محیط زمین کی مساحت کی کئی اس کی اہم ترین کتاب "کتاب الجہل" ہے۔ یہ طبعی علوم اور صنائع سے متعلق ہے۔

عربوں کے دور حکومت میں پہلوی زبان پر عربی کا اثر نمایاں ہے پہلوی زبان میں بے حد تغیرات رونما ہوئے۔ پہلوی اور عربی کے میل جول سے موجودہ فارسی پیدا ہوئی۔ پہلوی اور موجودہ فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ موجودہ فارسی زبان کا رسم الخط عربی ہے۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے بے شمار الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے۔ عربی الفاظ کا استعمال علم و ادب کی شان سمجھا جاتا تھا۔ عربی الفاظ کے علاوہ عربی زبان کی وسط سے یونانی۔ آرامی اور لاطینی وغیرہ کے الفاظ بھی اسی زمانے میں فارسی میں استعمال ہونے لگے۔

مثالیں :-

یونانی الفاظ : دینار۔ الماس۔ پیالہ۔ سدر۔ دہیم۔ فحان۔  
 آرامی : کنشت (کنیسہ) چلیبا (صلیبا) جزیرہ (گزیرت) مسجد  
 (مرگت) تابوت۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل الفاظ بھی غیر زبانوں سے ماخوذ ہیں :-  
 قیصر۔ قانون۔ طلسم۔ کیمیا۔ چاشق (کا تولیک)

پہلوی زبان کے اکثر الفاظ کی صورت موجودہ فارسی میں بہت بدل گئی ہے۔ مثلاً

اباک = با۔ ابر = بر۔ اپورناک = برنا۔ اردمیک = رومی  
 زیوندک = زندہ۔ ہماگوں۔ ہمایوں۔ پتنگر = پتھر۔

پیغام = پیغام   پیوستن = پیوستن   اکاس = آگاہ۔  
 بکر = بکر   نکاس = نگاہ   گزرتک = گروہ   نامک = نامہ  
 ورتک = ورد (گل)

سوال: فارسی شاعری کی ابتدا اور ترقی کب اور کیسے ہوئی؟ یا کیا  
 یہ صحیح ہے کہ فارسی شاعری کی ترقی کی ابتدا سامانی خاندان سے  
 منسوب ہے۔؟

جواب: خاندان سامانیہ سے پہلے شعر کا پتہ نہیں چلتا اور اگر کوئی  
 ایک آدھ شعر مل بھی جاتا ہے تو وہ لوازم شعری سے کورا ہوتا ہے تقریباً  
 تمام فارسی تذکرہ نویسین ذیل کے شعر کو بہرام گور کے نام سے منسوب  
 کرتے ہیں:-

منم آں شیر گزہ و منم آں پیل یلہ   نام من بہرام گور بوجیلہ  
 شعر کے الفاظ اس طرح الٹ پلٹ کر دیئے گئے ہیں کہ بحر اور  
 وزن بالکل بدل گیا ہے۔

غوفی نے جس طرح لکھا ہے وہ نثر سے ملتی جلتی بحر ہے جو عرب  
 کا مذاق ہے۔ بخلاف اس کے اور تذکرہ نویسوں نے اس کو آج کل  
 کی مروجہ فارسی بحروں کے موافق کر دیا ہے۔

عرض بہرام گور کے چند موزوں کلمات کو شاعری کا سنگ بنیاد  
 نہیں کہہ سکتے۔ اصل یہ ہے کہ ایران میں خالص عرب کی حکومت  
 نے فارسی شاعری کو دبا دے رکھا۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں:- سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان  
 گذرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے۔ طاہریہ عربی النسل تھا۔ اس



لئے فارسی شاعری کو اس زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا۔ صفاریہ  
نیز دولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر  
نہ تھی (خانہ ان صفاریہ کا بانی یعقوب بن لیث الصفاری یعنی . . . .  
(COPPERSMITH) یاد رکھنا تھا، لیکن سامانی خاندان نسل  
کیان کی یادگار تھا۔ ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی۔  
قدر دان علم و فن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال اور  
سخن سخن تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے  
بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاعرانہ قوتیں بالکل  
غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں۔ خراسان اور بخارا میں سینکڑوں  
ہزاروں شعرا موجود ہیں جو نسلاً عجمی ہیں لیکن دارالخلافہ بغداد کے اثر سے  
جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں۔ ان اسیاب سے اس خاندان نے  
اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاید توجہ کی۔ شاعرانہ پیش قدمیاں  
مقرر کیں۔ خاص خاص مضامین پر اشارہ دار لکھوائے۔ نصر بن احمد سامانی  
نے رودکی کو حکم دیا کہ بیکلہ و دمنہ کو فارسی میں نظم کر دے۔ عجم کی تاریخ اب  
تک نامرتب اور پریشان تھی۔ اس لئے دقیق (دخات مستند) کو اس  
کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ شاہنامہ (فرہ رومی)  
کا پہلا سنگ بنیاد تھا۔

شعراے سامانیہ میں ذیل کے شعرا خاص حیثیت رکھتے ہیں:  
ابوالعباس۔ ابوشکور بلخی۔ ابوالسحاق۔ جوہاری۔ ابوالحسن نسائی  
نسیمی بلخی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رائقہ وغیرہ۔  
رائعہ۔ رودکی کی بہتر تھی اور اعلیٰ درجہ کے شعراے صوفیہ میں شمار



لئے فارسی شاعری کو اس زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا۔ صفاریہ  
نوی دولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر  
نہ تھی (خاندان صفاریہ کا بانی یعقوب بن لیث الصفاری یعنی . . . .  
(COPPERSMITH) یاد رکھنا تھا) لیکن سامانی خاندان نسل  
کیان کی یادگار تھا۔ ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی۔  
قدر دان علم و فن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال ادب  
سخن سخن تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لہر پچر اور ملکی خصوصیات سے  
بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاعرانہ قوتیں بالکل  
غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں۔ خراسان اور بخارا میں سینکڑوں  
ہزاروں شعرا موجود ہیں جو سلاطین ہیں لیکن دارالخلافہ بغداد کے اثر سے  
جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں۔ ان اسیاب سے اس خاندان نے  
اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاید توجہ کی۔ شعر کی بیش قرار خواہش  
مقرر کیں۔ خاص خاص مضامین پر اشارہ لکھوائے۔ نصر بن احمد سامانی  
نے رودکی کو حکم دیا کہ بیکلہ و دمنہ کو فارسی میں نظم کر دے۔ عجم کی تاریخ اب  
تک نامرتب اور پریشان تھی۔ اس لئے دقیق (وفات ۹۷۵ء) کو اس  
کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ شاہنامہ (فرہ دوس)  
کا پہلا سنگ بنیاد تھا۔

شعراے سامانیہ میں ذیل کے شعرا خاص حیثیت رکھتے ہیں:  
ابوالعباس۔ ابوشکور بلخی۔ ابوالسحاق۔ جوہاری۔ ابوالحسن نسائی  
نسیب بلخی۔ رودکی۔ دقیق۔ رائقہ وغیرہ۔  
رائعہ۔ رودکی کی بہتر تھی اور اعلیٰ درجہ کے شعراے صوفیہ میں شمار

پنغام = پیغام    پیوستن = پیوستن    اکاس = آگاہ -  
 نیکر = جگر    نکاس = نگاہ    گزرتک = گزروہ -    نامک = نامہ  
 ورتک = ورد (گل)

سوال: "فارسی شاعری کی ابتدا اور ترقی کب اور کیسے ہوئی؟ یا کیا یہ صحیح ہے کہ فارسی شاعری کی ترقی کی ابتدا سامانی خاندان سے منسوب ہے۔"

جواب: خاندان سامانیہ سے پہلے شعر کا پتہ نہیں چلتا اور اگر کوئی ایک آدھ شعر مل بھی جاتا ہے تو وہ یوازم شعری سے کورا ہوتا ہے تقریباً تمام فارسی تذکرہ نویس ذیل کے شعر کو بہرام گور کے نام سے منسوب کرتے ہیں:-

منم آب شیر گلہ و منم آب پیل یلہ    نام من بہرام گور بوجیلہ  
 شعر کے الفاظ اس طرح الٹ پلٹ کر دیئے گئے ہیں کہ بحر اور وزن بالکل بدل گیا ہے۔

عوفی نے جس طرح لکھا ہے وہ نثر سے ملتی جلتی بحر ہے جو عرب کا مذاق ہے۔ بخلاف اس کے اور تذکرہ نویسوں نے اس کو آج کل کی مروجہ فارسی بحروں کے موافق کر دیا ہے۔

غرض بہرام گور کے چند موزوں کلمات کو شاعری کا سنگ بنیاد نہیں کہہ سکتے۔ اصل یہ ہے کہ ایران میں خالص عرب کی حکومت نے فارسی شاعری کو دبائے رکھا۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں:- سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گذرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے۔ طاہریہ عربی النسل تھا۔ اس



لئے فارسی شاعری کو اس زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا۔ صفاریہ  
 نو دولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر  
 نہ تھی (خاندان صفاریہ کا بانی یعقوب بن لیث الصفاری یعنی . . . .  
 (COPPERSMITH) یاد رکھنا تھا) لیکن سامانی خاندان نسل  
 کیان کی یادگار تھا۔ ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر بانی  
 قدر دان علم و فن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال اور  
 سخن سنج تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لہر پجر اور ملکی خصوصیات سے  
 بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاعرانہ قوتیں بالکل  
 غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں۔ تراسان اور بخارا میں سینکڑوں  
 ہزاروں شعرا موجود ہیں جو سلاطین کی ہیں لیکن دارالخلافہ بغداد کے اثر سے  
 جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں۔ ان اسیاب سے اس خاندان نے  
 اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاید توجہ کی۔ شاعرانہ پیش ترار تخواہ  
 مقرر کیں۔ خاص خاص مضامین پر اشارہ رکھوائے۔ نصر بن احمد سامانی  
 نے رودکی کو حکم دیا کہ بیکلہ و دمنہ کو فارسی میں نظم کر دے۔ عجم کی تاریخ اب  
 تک نامرتب اور پریشان تھی۔ اس لئے دقیق (وفات ۹۵۷ھ) کو اس  
 کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ شانہ نامہ (فردوسی)  
 کا پہلا سنگ بنیاد تھا۔

شعراے سامانیہ میں ذیل کے شعرا خاص حیثیت رکھتے ہیں:  
 ابوالعباس۔ ابوشکور بلخی۔ ابوالسحاق۔ جوہاری۔ ابوالحسن۔ نسائی  
 شبید بلخی۔ رودکی۔ دقیق۔ رائقہ وغیرہ۔  
 رائقہ۔ رودکی کی بہتر تھی اور اعلیٰ درجہ کے شعراے صوفیہ میں شمار

ہوتی ہے۔ گویا سامانیہ کے دور میں شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیلنے لگا تھا۔ ایرانی ادب کی ترقی کے متعلق مولانا آزاد کے الفاظ کس قدر سوزوں ہیں :-

زبان فارسی کے لئے قدرتی سامان یہ ہوا کہ سامانیوں نے ماورائے  
میں قومی سلطنت کا نشان قائم کیا۔ امیر اسماعیل سامانی نے ترکستان -  
خراسان - اصفہان وغیرہ پر حکومت پھیلا دی۔ جب تک خاص عرب  
ہاکم تھے تب تک عربی زبان نے ملکی زبان کو دبائے رکھا۔ اب حاکم وقت  
خود سامی خاک کا پتلا ہوا۔ وہ بہرام چوہیں کی اولاد سے تھا جس طرح عرب  
کو اپنی عربی سے محبت تھی۔ اُسے اپنے باپ دادا کی زبان کی عزت ضرور  
ہوئی۔ غرض خود اُس محبت سے خواہ ملکی تھلکت سے اس نے عربی زبان  
کی وہ پابندی نہ رکھی ہو گی جواب تک تھی ۳۴۰ھ میں تمام دفاتر فارسی  
ہر گئے۔ ۳۵۰ھ کے قریب یہاں تک نسبت پہنچی کہ منصوص سامانی  
کے وزیر نے تاریخ طبری کا ترجمہ فارسی میں کیا اور رشود کی شاعر جیسے  
نظم فارسی کا آدم اول گنا چاہے درباروں اور جلسوں میں غزلیں  
اور قصیدے گانے لگائے۔ جدید تحقیقات کے مطابق: گو فارسی  
شاعری کا آغاز اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ تذکرہ نویسوں کے قول  
کے مطابق اولین فارسی شعراء وہیں - حکیم اب جفص سفدی اور  
عباس مروی - یہ دونوں شاعر ایران کی آزادی کے زمانے سے  
پہلے ہوئے ہیں۔ سفدی نحوی بھی تھا اور لغوی بھی۔ وہ موسیقی سے  
بھی واقف تھا۔ عباس کو عربی زبان پر بھی عبور حاصل تھا اس کے  
فارسی اشعار وہ مشہور ہیں جو اس نے مرو میں خلیفہ ماموں کے ورود

پر لکھے۔ اور ان میں اس کی مدح کی۔

سامانی خاندان سے پہلے طاہری اور صفاری خاندان ہوئے ہیں۔ ان کے عہد حکومت میں بھی فارسی کے شعرا ہوئے ہیں۔ طاہر نے خلیفہ مائون کی اپنے بھائی کے خلاف مدد کی تھی جس کے صلے میں طاہر کو خراسان کی امارت مل گئی۔ طاہر چونکہ فارسی النسل تھا۔ اس لئے اس نے فارسی زبان اور ادب کے فروغ میں دیکھسی لی۔ طاہریوں کے دور کا مشہور ترین شاعر خنظلہ بادغیسی تھا۔ وہ صاحب دیوان تھا۔

صفاری دور (۲۴۵ھ تا ۲۵۹ھ) میں فارسی زبان اور ادب کو طاہری عہد کی نسبت زیادہ ترقی نصیب ہوئی۔ صفاری خاندان کا بانی یعقوب بن لیث عربی زبان سے ناواقف تھا۔ اس لئے اس کی مدح میں جو عربی قصیدے لکھے گئے اس نے ناپسند کئے اور فارسی میں لکھنے کی تاکید کی۔ اس لئے یعقوب کی سرپرستی سے فارسی زبان اور ادب کو بڑی وسعت ملی۔ صفاریوں کے دربار کے مشہور ترین شاعروں میں فیروز مشرقی کا نام قابل ذکر ہے۔ اس نے فارسی شاعری میں اصلاح کی۔ اس کی وفات ۲۸۲ھ میں ہوئی۔ اس دور کا ایک اور شاعر ابوسلیک گرگانی ہے۔ یہ بھی فیروز مشرقی کی طرح عمر بن لیث کا ہم عصر تھا۔ صفاری دور کا ایک اور شاعر محمد بن وصیف ہے۔ یہ یعقوب کا دبیر تھا۔ اور اس نے اس کی مدح میں فارسی شعر لکھے تھے۔

# دور سامانیہ

(۸۷۷ء تا ۹۹۹ء)

سوال :- ابوشکور بلخی کی زندگی اور شاعری سے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

جواب :- ابوشکور بلخی سامانی دور کے وسط دور (۹۵۵ء) میں ہوا ہے وہ نوح بن نصر کے دربار سے وابستہ تھا۔ ابوشکور بلخی کو رباعی کا مجدد تسلیم کیا جاتا ہے اور رباعی وہ صنعت شاعری ہے کہ بعد کی صدیوں میں اس سے نہایت مفید اور دلکش کام لئے گئے ہیں۔ اگرچہ ابوشکور کے کلام میں عرفان، فلسفہ اور تصوف کے دقیق مسائل بیان نہیں کئے گئے۔ تاہم اس کی روانی، تازگی، اور سلاست قابلِ داد ہیں۔ ابوشکور کے منظومات ہیں ایک مثنوی بھی شامل ہے جس کا نام آفرین نامہ ہے۔ اس مثنوی کو شاعر نے ۳۳۳ھ میں شروع کر کے ۳۴۳ھ میں ختم کیا۔ بعض محققین کی رائے میں وہ پہلا مثنوی گو شاعر ہے۔ آفرین نامہ کے متفرق اشعار باقی رہ گئے ہیں۔ ان میں سے چند نمونہ کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں:-

(۱)

خردمند گرید خرد پایا دشا است      کہ ہر خاص و ہر عام فرماں است  
خرد راتن آدمی لشکر است      ہمہ شہوت و آرزو چاکر است  
ان اشعار میں شاعر نے عقل کی قوت اور سرداری بیان کی ہے



انسان کی تمام خواہشات اس کی عقل کے تابع ہیں۔ گویا عقل حاکم ہے اور جسم محکوم۔ عقل سے ہی انسان خاص و عام پر حکومت کرتا ہے۔

(۲)

کسے کو بدانتش برد روزگار نہ اوباز ماند نہ آموزگار  
اس شعر میں بھی عقل کی فضیلت واضح کی گئی ہے۔ انسان پر واجب ہے کہ کامیاب زندگی کے لئے عقل سے کام لے اور بھونک بھونک کر قدم رکھے۔ ذیل کے شعر سے علم و ہنر کی اہمیت ملاحظہ ہو:  
چوں دینار باید مرا یاد رم فرا زاد رم من ز نوک قلم  
ابوشکور نے ذیل کے شعر میں ایک پتے کی بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ دشمن پر بھی اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ اس حقیقت کی تاثیر کے لئے تاریخ شاہد ہے:-

یادشمن برت جہرانی مباد کہ دشمن درختے است تلخ از نہاد  
مندرجہ ذیل اشعار میں موروثی خصلت کے اثر کو دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے:-

درختے کہ تلخیش بود گورہا اگر حرب و شیریں دیں مرو را  
ہماں میوہ تلخت آرد دیدید از و خرب و شیریں نخواہی مزید  
یونانی حکما کے فلسفہ کا ایک اہم نکتہ ذیل کے شعر سے ملاحظہ ہو:-  
اس کا مطلب یہ ہے کہ علم و دانش کے سمندر کی کوئی تھلا نہیں۔  
اور انسان خواہ کتنا ہی عالم ہو آخر نادان ہی رہتا ہے:-

تا بدینجا رسیدہ دانش من کہ بدانم سہمی کہ نادانم  
سوال: حکیم کسائی مروزی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ لکھئے:-

جواب: حکیم کسائی مروزی سامانی عہد حکومت کا ایک بلند درجہ شاعر تھا۔ اس کے سہ ہجڑے حکماء اور شاعر اس کی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بعد میں آنے والے شعرا و مشہور شاعر ناصر خسرو نے بھی اپنے کلام میں اس کی عظمت کا دم بھرا ہے۔ ایک شاعریوں اس کا ذکر خیر کرتا ہے: یہ من چاکر و غلام کسائی کہ او بگفت جان و نرد دروندہ بر این طرح آخضرند ذیل کے شعر میں عمارہ مروزی نے روز کی کی کنایت تعریف کے ساتھ کسائی کی بھی مدح سرائی کی ہے: یہ

زیبا بودار مرو بسنازد بکسائی چونانکہ جہاں جملہ باستاند سمرقند  
حکیم کسائی کا پورا نام ابوالحسن محمد الدین اسحاق کسائی ہے۔ وہ ۳۴۱ھ میں پیدا ہوا اور لک بھگ سو سال کی عمر پائی جیسا کہ اس کے حضرت علی کی مدح میں کہے گئے اشعار سے ظاہر ہے وہ مذہب شیعہ تھا کسائی کی شاعری کے عام موضوع دینیات حکمت۔ پند و نصیحت سیرت و اخلاق ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اس نے ناصر خسرو کے لئے میدان تیار کیا۔ چنانچہ ناصر خسرو نے مذہبی عقاید علم و حکمت اور زہد و تقویٰ سے متعلق لمبے لمبے قصیدے لکھے ہیں۔ اور جابجا کسائی کا ذکر کیا ہے۔

حکمت اور اخلاق اور دینیات کے علاوہ کسائی نے حسن فطرت پر بھی توجہ دی ہے قدرت کے نظاوت سے بہت بھائے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ نیلوتر سے اسے خاص طور پر عشق ہے۔ اُسے وہ تیغِ آبدار سے مشابہ کرتا ہے۔ پھولوں کے پکنے اور خاک میں ملنے پر اُسے بے حد افسوس ہوتا ہے۔ حسن فطرت کے

بیان میں وہ تشبیہات اور استعارات سے بھی کام لیتا ہے۔ جو سادہ اور  
انوکھے ہیں۔ ان سے اس کے کلام کی تاثیر اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔  
نہوتے کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

نیلو فر کہودنگ کن میان آب      چوں تیغ آب دادہ ویا قوتِ ابدار  
ہم رنگِ آسمان و بگردارِ آسمان      ز دلش در میان چو بادہ و چہار

گل نغمے است پدید فرستادہ از ہنشت      مردم کریم تر شود اندر نسیم گل  
اے کافر و دش گل چو فرشتی بجائے نسیم      و ز گل عزیز تر چو ستانی بسیم گل  
کسائی دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری سے متاثر تھا۔ اور  
اس کا ذکر جا بجا اپنے قصیدوں میں کیا ہے۔ خاص طور پر اس قصیدے  
میں جو اس نے اپنے حال پر لکھا ہے اس فانی دنیا اور ناپائیدار زندگی  
کا شدید رنج کے ساتھ رونار دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

درم خریدہ از م ستم رسیدہ حرص      نشانہ خدا نم تنکار ذلِ سوال  
در یغِ فرجوانی در یغِ غمِ لطیف      در یغِ صورتِ نیکو در یغِ حسنِ جمال  
کجا شد آں ہمہ خوبی کجا شد آں ہمہ شق      کجا شد آں ہمہ نیر و کجا شد آں ہمہ حال

سوال :- رودکی سمرقندی کی زندگی اور اس کے کلام پر تبصرہ کیجئے۔  
جواب :- ابو عبد اللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے قریب قصبہ رودکی میں  
پیدا ہوا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں یہ صاحب ایجاد رہنے والا قصبہ رودکی  
علاقہ سمرقند کا تھا۔ اگرچہ مادر زاد اندھا تھا ڈاکٹر ایچ کو اس میں شک  
ہے، لیکن چھوٹی عمر میں بقدر ضرورت علم حاصل کیا۔ چونکہ خوش آواز

تھا علم موسیقی کی طرف رغبت ہوئی اور بریطیجانے میں کمال حاصل کیا۔  
 اس ذریعہ سے چوتھی صدی ہجری کے شروع میں اس نے امیر نصر  
 بن احمد سامانی کی قدردانی سے رتبہ عالی حاصل کیا اس کی  
 کثرت انعامات کے باب میں مولوی جامی نے کہا ہے: یہ  
 رود کی آنکھ دُر سے سفید تھی مدح سامانیاں ہمے گفتم  
 صلہ شعر ہائے ہنجو درش بود دربار چار صد شترش  
 اس کے علاوہ عنصری۔ ذہبی۔ نظامی عروضی وغیرہم نے  
 اپنے اپنے کلام میں اس کی نظم کی تعریف کی ہے۔ دولت شاہ  
 کہتا ہے: رود کی دو سو غلام چھوڑ کر مرا تھا۔ اس سے اس کے  
 مال و اسباب کو قیاس کر لینا چاہئے۔

اسماعیل بن احمد کا وزیر ابو الفضل البلععی کہا کرتا تھا کہ اہل  
 عرب یا اہل ایران میں رود کی کا کوئی ہم پایہ شاعر نہیں ہے۔  
 تمام تذکرہ نویسوں کو اس بات پر اتفاق ہے کہ رود کی ہی نے  
 سب سے پہلے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا۔ سامانیوں کا  
 نام آج تک رود کی کی بدولت ہی زندہ ہے: یہ

ازاں چندیں تقسیم جاودانی کہ ماند از آل ساسان آل سمان  
 ثنائے رود کی ماندست و وحش نوائے بارید ماندست و دستان  
 رود کی نے کلیلہ و دمنہ کو فارسی ثنوی میں نظم کیا۔ اور اس کے  
 صلے میں چالیس ہزار درہم انعام پایا۔

علامہ شبلی رود کی کی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں: "رود کی کی  
 شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی۔ پند و موعظت اور حسن تاثیر ہے۔"



عرب جاہلیت کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیے جاتے تھے۔ فارسی شاعری تفریح طبع کے سوا کسی کام کی نہ تھی۔ یعنی اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہ آیا۔ لیکن رودکی اس دھڑے سے پاک ہے۔ اس کی شاعری میں اس قدر تاثیر تھی کہ اس کے شعر سنتے ہی دل پر اثر ہوتا تھا۔

ایک تاریخی واقعہ بیان کرنا واجب ہے۔ نصر بن احمد سمانی اپنے ایک سفر میں اپنے وطن بخارا کو بالکل بھلا بیٹھا۔ درباریوں کو گھر کی یاد نے ستایا۔ لیکن ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود اپنے حاکم سے وطن کو لوٹنے کے لئے کہیں۔ چنانچہ رودکی سے درخواست کی گئی کہ وہ امیر کو بخارا واپس جانے پر آمادہ کرے۔ رودکی نے جھٹ کچھ شعر لکھے اور صبح کو امیر کی خدمت میں پیش کئے۔ اس قصیدے کا مطلع

یہ ہے :-

بوئے جوئے مولیاں آید ہے یاد یارِ ہریاں آید ہے  
امیر کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ موزے پہنے بغیر بخارا کی طرف  
جل پڑا۔ بقول نظامی عروضی سمرقندی ”ابھی تک کسی سے اس قصیدے  
کا جواب نہ ہو سکا۔ اس کی فصاحت، حقیقت آرائی، روانی، ادبی  
اور حسن تاثیر اور جوش قابلِ داد ہیں۔“

رودکی نہایت پر گو تھا۔ رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار  
کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔ جب اس کی طبیعت شعر گوئی پر مائل  
ہوئی تو اس نے قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ اور مثنوی سب  
کچھ ایجاد کیا۔

”مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ واقع نگاری، خیال بندی، پند و موعظت، عشق و محبت، طرح و ثنا، صنائع بدائع سب چیزیں اس کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔“

”رودکی نے تین تاریخی افسانے بھی نظم کئے۔ ان میں ”وامق و عازرا“ مشہور ترین ہے۔ اس کا ماخذ ہیلوی ادب تھا۔ کئی اہل فن نے اس بیش قیمت نظم کی پیروی کی ہے۔ رودکی کا دیوان ایران میں چھپ چکا ہے۔ تقریباً تمام تنقید نگار رودکی کو ”بابائے ادبیات فارسی“ تسلیم کرتے ہیں۔ مشہور یونانی حکیم ایپیکیورس کے فلسفہ کو فارسی میں سب سے پہلے غالباً رودکی ہی نے روشناس کیا۔ اس فلسفے کا لب لباب یہ ہے:

خوش باش۔ ندانی ز کجا آمدہ ای  
مے نوش ندانی کہ کجا خواہی رفت  
رودکی کے کچھ اشعار سے حظ اٹھائیے گا۔

شاد زری با سیاہ چشماں شاد	کہ جہاں نیست بجز فسانہ و باد
ز آمدہ شاد ماں نہ باید بود	وز گذشتہ نکرد باید یاد
نیک بخت آن کسے کہ داد و بخورد	شور بخت آنکہ او نخورد و نداد
یاد و ابرست اس جہاں فسوس	بادہ بیش آرہر چہ بادا باد

ہتران جہاں ہمہ مردند	مرگ را سرفرو ہمے کردند
زیر خاک اندروں شدند زبان	کہ ہمہ کو شکھا بر آوردند
از ہزاران ہزار نعمت و ناز	نہ باخر بجز کفن بردند

بود از نصرت آنچه پوشیدند و آنچه دادند و آنچه را خوردند

زمانہ پند کے آزاد وار داد مرا زمانہ را چو نگو بنگری ہمہ پند است  
 بروز نیک کسان گفت غم مخور ز بہار بسا کسا کہ بروز تو آرزو مند است  
 سوال۔ دقیق کی زندگی کے حالات اور اس کے کلام پر روشنی ڈالئے۔  
 جواب۔ ابنصور محمد بن احمد معروف بہ دقیق بعض محققین کے عقیدہ  
 کے مطابق طوس کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۳۶۷ھ کے لگ بھگ  
 وفات پائی۔ اس کی موت ایک غلام کے ہاتھوں ہوئی کچھ مورخوں  
 نے دقیق کے ایک آدھ شعر کی بنا پر اسے آتش پرست قرار دیا ہے۔  
 مگر اہم اعلیٰ یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ دقیق کے شاہکاروں میں قصائد  
 اور مقطعات کے علاوہ ایک مثنوی بھی شامل ہے جس کا موضوع ہے  
 زلفشت پیغمبر کا ظہور اور ایران کے بادشاہ گشتاسب کی نورانی حکمران  
 اور جاسپ کے خلاف لڑائیوں کا حال اس مثنوی کے متعلق ہی قول صحیح  
 معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہزار کے قریب اشعار ہیں سچ تو یہ ہے کہ  
 دقیق نے مثنوی لکھ کر شاہنامہ فردوسی کی سی یادگار زمانہ نظم کے لئے  
 میدان تیار کر دیا۔ اگر دقیق اپنے غلام کے ہاتھوں قتل نہ ہوتا تو ممکن ہے  
 کہ وہ اس مثنوی میں اور بھی بہت کچھ اضافہ کرتا۔ زبان اور انداز بیان  
 کے لحاظ سے دقیق کے کلام اور فردوسی کے شاہنامہ میں بہت مشابہت  
 پائی جاتی ہے فردوسی اگر اپنے اشعار میں دقیق اور اس کی مثنوی کا ذکر  
 صاف صاف نہ کر دیتا تو ہو سکتا ہے کہ دقیق کے اشعار خود فردوسی کی  
 طرف منسوب کر دیئے جاتے۔

دقیقی کے یہاں بہاریہ عشقیہ، ماحبیہ، غرض ہر قسم کے مضامین موجود ہیں۔ دقیقی کے کلام سے وطن پرستی کا جوش و خروش پوری بلند آہنگی کے ساتھ چھلک رہا ہے اس کے خیالات میں بلندی ہے اور مضامین میں جدت خالص فارسی کی مکمل فصاحت اس کے کلام کا خاص جوہر ہے جو اس کی بختگی طبع پر اعتراف کی مہر ثبت کرتا ہے۔

دقیقی کے بعض قصیدے اور قطعے غزل کی طرح پُر لطف ہیں۔ ان میں حسن و عشق، ناز و ادا، اور شراب و مستی کے موضوع باندھے گئے ہیں تشبیہات رنگین اور نرالی ہیں۔ خیالات لطیف اور دلپذیر ہیں۔ بہار کے نظاروں کی تصویر کشی بھی قابلِ داد ہے۔ قصیدہ گوئی میں دقیقی کی اپنی روش اور اپنا رنگ ہے قصاید میں پند و موعظت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی جذبات غالبہ مثلاً جرات و دلیری، کرم و سخاوت اور غیر و دانش کے حصول کی تلقین ہے۔

دقیقی سامانی خاندان کے عہد حکومت میں رودکی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہوا ہے اسے منصور بن نوح اور نوح بن منصور (سامانی حکمران) کے دور میں شہرت نصیب ہوئی اس شہرت کا زیادہ مدار اس شاہنامہ پر ہے جو اس نے سامانی امیر نوح بن منصور کے فرمان پر نظم کرنا شروع کیا۔ لیکن بد قسمتی سے صرف ایک ہزار شعر ہی لکھ سکے تھے کہ اپنے غلام کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

دقیقی کے کلام کے نمونے کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:-  
چنان گشت آزاد سرو بلند کہ بر گرد او برنگشتے کند



بگیرید یکسر رہ زرد ہشت بسوئے بہت چلیں بر آرید پشت

ز گل بوئے گلاب آید بر انسان کہ پنداری گل اندر گل سرشتی  
دقیقی چاند صفت برگزیدہ است بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی  
لب یا قوت رنگ و نالہ جنگ مے چوں رنگ و کیش زرد و شستی

دو چیز است کہ را بند اندر آر یکے تیغ ہندی دگر زر کانی  
بہ شمشیر باید گرفتن مر اورا بدینا بستنش پاے ارتوانی  
خرد باید آنجا وجود و شجاعت فلک مملکت کے دہہ را نگانی

سوال : سامانی دور کے نثری ادب پر جامع نوٹ لکھئے۔  
جواب : سامانی حکمران علم و ادب کے سرپرست تھے۔ انھوں نے  
صرف شاعروں کی حوصلہ افزائی کی بلکہ نثاروں کی بھی۔ ان کے  
دربار شاعر و شاعری اور نثر نگاری کی ترقی کے مراکز تھے۔ اس میں  
شک نہیں کہ فارسی شاعری کی نسبت فارسی نثر کی ترقی کم ہوئی  
فارسی کے مقابلے میں عربی نثر نے زیادہ رواج پایا۔ اس لئے عربی زبان  
میں نثر کی بہت زیادہ کتابیں تالیف کی گئیں۔ ان تصنیفات میں سے  
کچھ تو انقلاب زمانہ کی نثر ہو گئیں اور کچھ نچ گئیں۔ ان میں سے ایک  
شاہنامہ (فارسی) کا مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ ۲۶ ص ۱۱ میں حاکم طوس ابو  
منصور بن عبد الرزاق کے فرمان پر لکھا گیا۔ اس کے بعد دوسری اہم  
تصنیف تاریخ طبری (عربی) کا فارسی میں ترجمہ امیر منصور کی فرمائش

پر کیا۔ یہ ترجمہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں کیا گیا ہے۔ روانی اس کی خاص خوبی ہے۔

سامانی دور کے فارسی نثری ادب میں ایک اور قابل قدر اضافہ تفسیر طبری کا ترجمہ ہے یہ کتاب بھی امیر خسرو بن نوح کے حکم سے لکھی گئی۔ مترجم کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ان تالیفات کے علاوہ قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے۔

عربی نثر کی تصنیفات: سامانی عہد میں ایرانی علما نہ صرف فارسی اور عربی میں شہرہ کھتے تھے بلکہ عربی نثر میں بھی تصنیف و تالیف کرتے تھے۔ ابن قتیبہ سامانی دور میں ایک مشہور مورخ اور ادیب گذرا ہے۔ اس نے ۳۷۶ھ میں وفات پائی۔ اس کی قابل ذکر تصنیفات یہ ہیں۔ کتاب المشہر والشہر۔ عیون الاخبار، ادب الکاتب۔

محمد جریر طبری ایک شہرہ آفاق مورخ اور مفسر ہوا ہے۔ اس نے ۳۵۰ھ میں انتقال کیا اس کی مشہور کتاب تاریخ طبری ہے۔ قرآن شریف کی تفسیر بھی اس نے لکھی۔

دینیوری نے سیاست۔ تاریخ اور ادب پر کتابیں لکھیں۔ اس کی مشہور ترین کتاب اخبار الطوال ہے۔

ابن فقیہ ہمدان کا رہنے والا تھا۔ اس کی مشہور حنفیہ کی کتاب "کتاب البلدان" ہے جو ۳۹۹ھ میں تالیف کی گئی۔

حمزہ اصفہانی مشہور تاریخ دان اور لغات نگار تھا۔ اس نے تاریخ پر "سنی ملوک العجم" کے نام کی کتاب لکھی۔ اس کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی۔

محمد بن یعقوب کلینی سامانی دور کا عظیم المرتبہ محدث تھا۔ مذہب کا شیعہ تھا۔ اس کی اہم تصنیف کتاب کافی ہے۔ اس نے ۳۲۹ھ میں انتقال کیا۔

اسحاق موصلی ایک نجیب النسل ایرانی تھا۔ موصل کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک بڑا عالم موسیقی ہوئے۔ علم ریاضی اور موسیقی سیکھے بغیر اس نے صلاحتِ طبعی کے زور سے بے نظیر اصول موسیقی وضع کئے۔ اس کے علاوہ حدیث سے بخوبی واقف تھا۔ شعر و شاعری کا بھی مذاق سلیم رکھتا تھا اور خوب شعر کہتا تھا۔ چالیس سال کی عمر یا کر ۳۳۵ھ میں وفات پائی۔

ابوبکر محمد بن زکریا رے کا رہنے والا تھا۔ ۳۴۰ھ میں پیدا ہوا۔ وہ اسلامی دنیا کا ایک مشہور حکیم اور ادیب ہو گزرا ہے۔ علم طب میں کمال حاصل کیا۔ آپ رے اور بغداد میں طبابت کرتے تھے۔ طب پر آپ کی مشہور تصنیف "حادی" ہے۔ ایک اور کتاب "کتاب الطب المنصوری" ہے۔ آپ نے ۳۷۰ھ میں انتقال کیا۔

ابومعشر بلخی ایک اعلیٰ پایہ متبحر اور عالم تھا۔ حساب اور ہندسہ میں کمال حاصل کیا۔ نجوم کے موضوع پر مستند کتابیں لکھیں جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ آپ کی وفات ۳۷۲ھ میں ہوئی۔ آپ نے قریباً سو سال کی عمر پائی۔

————— زیند —————

# غزنوی دور

سوال: سلطان محمود غزنوی (رحمۃ اللہ علیہ) اہل علم و فن اور شعر و ادب کی تربیت اور اپنی شاہانہ فیاضیوں کے لئے ایک ممتاز مقام رکھتا ہے اس پر مفصل بحث سپرد قلم کیجئے۔

جواب: سلطان محمود سلسلہ غزنویہ کا سب سے بڑا بادشاہ گذرا ہے۔ دراصل یہ غزنوی سلسلہ سامانی حکومت ہی کی ایک شاخ تھی۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ محمود کی فیاضیاں درج پست ہی کی غرض سے نہیں بلکہ علم و فن اور تاریخ و ادب کی ترقی کے مقصد سے تھیں۔ اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم کو خود مشہور کیا۔ لیکن اس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے۔ اسلامی

فتوحات مسلمانوں کے مذہبی ترانے ہیں۔ لیکن مسلمان خالد و ضرار کے بجائے ششم و سہراب کے نام سے زیادہ آشنا ہیں۔ عہد الملک - ولید - مقتدر - معتضد - معتصم کو کتنے آدمی جانتے ہیں؟ لیکن عجم - و کیشرو - کی کاؤس و فریدوں - افراسیاب - و اسفندیار کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ (شعر العجم)

عربی نے لکھا ہے کہ خود سلطان محمود غزنوی اور اس کا بیٹا امیر ابو محمد بن یحییٰ الدولہ بھی شعر کہا کرتے تھے۔ اس لئے تعجب نہیں اگر محمود جی جان سے شعر کی قدر کرتا۔



شاعری اگرچہ ابتداءً ظہور سے روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی لیکن غزلیہ دور میں انتہائے کمال تک پہنچ گئی۔ فردوسی۔ اسدی طوسی۔ عنصری۔ قزنی۔ حکیم سنائی۔ منوچہری جن میں ہر شخص تعلیم سخن کا صاحب تاج و تخت ہے۔ اسی عہد کی یاد گاریں ہیں۔ محمود جس طرح فاتح و کشورستان تھا اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا۔ علم فقہ میں بھی باہر رکھا۔ اور اس پر خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے۔ غزنی میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے سبب ایک عجیب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے (تاریخ فرشتہ)

ملک میں جو بڑے بڑے مشاہیر فن تھے اکثر دروں کو بلا کر دیار میں جگہ دی تھی۔ ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی تھا جو متعدد فنون میں بوعلی سینا کا ہم پایہ تھا۔ بوعلی کو بھی اس نے خوانِ کرم پر دعوت دی تھی لیکن اس کو کچھ دہم پیدا ہوا اور نہ آیا۔

”شاعری پر اس نے جو صلہ شہانہ سے توجہ دی۔ اور ایک مستقل محکمہ قائم کیا۔ اور عنصری کو ملک الشعر کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا۔ تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ محمود کے خوانِ کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے جن کو حکم تھا کہ جو کچھ کہیں پہلے عنصری کو دکھا کر پھر دربار میں لائیں۔ ایک موقع پر جب شہزادہ مستود خراسان سے غزنی میں آیا اور شعرانے دربار عام میں قصائد پیش کئے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے۔ غضاری کو

دو شعروں پر دو قوتوں سے دیئے۔“

عنصری نے ۱۸۰ شعروں کا قصیدہ لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں تہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیں (تذکرہ دولت شاہ سمرقندی) بدلتی بلخی نے نوشیروان کا نصیحت نامہ نظم کیا۔ اسدی طوسی نے بغات فارسی کی تدوین کی۔ اور صنائع و بدائع فارسی پر ایک کتاب لکھی۔ تاریخ و اخلاق کے علاوہ محمودی شعرا نے اصل فن کو ترقی دی۔ اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں۔ واقعہ نگاری۔ معاملہ بندی۔ اظہار جذبات۔ قدرتی مناظر کی تصویر غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ غزل البتہ رہ گئی۔ لیکن ابھی اسلام کی ترقی کا شباب تھا۔ ابھی سے اس فتنہ خوابیدہ کے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔

”محمودی شعرا اگرچہ بے شمار ہیں لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندایں داخل کیا تھا اور جو آسمان سخن کے سب سے سیارے تھے یہ ہیں۔ عنصری۔ فردوسی۔ اسدی۔ عسجدی۔ غفاری۔ قرخی۔ منوچہری (شبلی)“

ان شاعروں کے علاوہ محمود کے دربار میں ہر فن کے استاد موجود تھے۔ مشہور مؤرخ البیرونی صاحب آثار الیافینہ و تاریخ الهند و المقیم و غیرہ (سید ایش) کا نام قابل ذکر ہے۔ عربی زبان کا مشہور اادیب ابوالفتح المتنبی کچھ عرصہ تک محمود کے دربار میں رہا۔ محمود نے حکیم المنیر حکیم اور اہل طب شیخ بوعلی سینا (سید ایش)

۹۸ھ) کو بھی اپنے دربار میں لانے کی کوشش کی۔ بوعلی حکمت اور سیاسی تدبیر میں بیکارے روزگار تھا جوہر اسطو اور جالینوس کا پیروکار اور قرون وسطیٰ میں یورپ کو تعلیم دینے والا تھا۔ براکلمین نے بوعلی کی تقریباً ایک سو تصنیفات بیان کی ہیں۔ جن میں شفا۔ قانون اور دانش نامہ خاص طور پر قابل تعریف ہیں۔

عقبنی نے اپنی کتاب تاریخ یمنی میں محمود کے دربار کی ہمنماں شان کو خوب سراہا ہے۔ مقامات کا مختصر بدیع الزماں ابو الفضل احمد بھی محمود کے خاص درباریوں میں سے تھا۔ محمود رشوت سے طاقت و جبر سے اور لالچ دے کر غرضیکہ ہر ذریعے سے چاہتا تھا کہ اہل فن اس کے دربار میں جمع ہوں۔

سوال: عنصری کے احوال و آثار بیان کیجئے اور اس کی شاعری پر تنقید سپرد قلم کیجئے۔

جواب: حکیم ابو القاسم حسن بن احمد عنصری بلخ کا رہنے والا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی یقینی علم نہیں۔ تاہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۹۹۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا ہو گا۔ اس کی موت ۱۰۵۷ھ اور ۱۰۵۸ھ کے درمیان واقع ہوئی۔ مولانا شبلی نے مختلف تذکرہ نویسوں کی بحث و بحث کا ذکر کرتے ہوئے۔ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی رائے میں عنصری نے ۱۰۳۸ھ مطابق ۱۰۵۷ھ میں یعنی محمود غزنوی کی وفات کے قریب دس سال بعد سلطان مسعود کے آخری ایام کے دوران میں انتقال کیا۔

عنصری کی ابتدائی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہو سکے

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے اوائل عمر میں تجارت شروع کی لیکن ایک  
بار ٹٹ جاتے کے بعد علوم عقلی کی طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ  
سلطان محمود غزنوی کے چھوٹے بھائی امیر نصیر حاکم خراسان کے  
دربار میں رہا۔ وقت گزرنے پر دربار غزنی سے متعارف ہوا۔ وہاں  
محمود کی قدر و انبیروں نے اسے ملک الشعراء کے علاوہ بہت امیر  
بنا دیا۔ نذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ دربار غزنی کے چار سوشاعر اس کے  
ماتحت تھے جن میں فرخی عسجدی اور منوچہری جیسے اہل فن شامل  
تھے اور وہ بڑے جاہ و جلال کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ یہاں تک  
کہ چار سوزیں مگر غلام رکاب میں ساتھ چلتے۔ خاقانی نے لکھا ہے  
بدہ بست صد بردہ بدرہ یافت      ز یک فتح ہند و ستاں عنصری  
شنیدم کہ از نقرہ زد دیگران      ز در ساخت آلات خواں عنصری  
عظیم المرتبہ قصیدہ گو منوچہری یوں عنصری کی تعریف کرتا ہے  
اوستاد اوستادان زمانہ عنصری      عنصرش بے عیب دل بخش و دلکش  
تلاشے خوانی تو اشعارش ہمے خالی شکر      تا ہمے گوئی تو ابیاتش ہمے بولی سخن  
لطافتی عروسی سمرقندی نے کہا ہے۔

بسا کا خاکہ محمودش بنا کرد      کہ از رفعت ہمے بامہ سرا کرد  
نہ بینی زان ہمے یک خشت برپائے      مدیح عنصری ماندست میر جا  
ایسی تعریفوں کے علاوہ عروض۔ لغت۔ اور صنائع بدائع کی  
اکثر کتابوں میں عنصری کے کئی ایک اشعار مثال پاسند کے طور پر نقل کئے  
گئے ہیں۔ محمود غزنوی عنصری کے حق میں اس قدر اعتماد اور عزت رکھتا تھا  
کہ تمام درباری شعرا کو حکم تھا کہ اپنے شاہکار بادشاہ کے حضور میں



پیش کرنے سے پہلے عنصری کی منظوری اور اصلاح لے لیا کریں۔  
عنصری کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت بڑا فی البدیہہ گو تھا۔  
ایک بار محمود نے نشے کی حالت میں اپنے محبوب ایاز کی زلفیں  
کٹوا دینے کا حکم دے دیا جب نشہ دور ہوا تو بادشاہ کو اپنے کئے پر  
بہت پشیمانی ہوئی اور قلق کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایسے میں عنصری کی ایک  
فی البدیہہ رباعی محمود کی تسکین کا باعث ہوئی۔  
کے عیب برزلف بہت از کاستن است  
چہ جائے بہ غم شمستن و خاستن است

وقتِ طرب و نشاط دے خواستن بہت  
کاراستن سرور پیراستن است  
اگرچہ عنصری نے محمود اور امیرنصر کی مدح میں بہت سے قصیدے  
لکھے ہیں۔ تاہم اس نے بعد کے قصیدہ نویسوں کی سی چالوسی کا کبھی بھی  
اظہار نہیں کیا۔ اس نے یہ کوشش بھی نہائی ہے کہ خود داری کے سر نشین  
کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ عنصری کو تقریباً ہر تقریب پر کوئی نہ کوئی قصیدہ  
لکھنا پڑتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے قصاید کی کلیات بہت بڑی  
ہوگی۔ عنصری نے رودکی کی پیروی میں کچھ عشقیہ نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن  
اس میدان میں اس نے اپنی نسبتاً ناکامیابی کا خود اعتراف کیا ہے۔  
غزل رودکی وار نی کو بود غزل ہائے من رودکی وار نیست  
مجمع الفصحا میں لکھا ہے کہ عنصری نے کوئی تیس ہزار اشعار کا دیوان  
چھوڑا۔ لیکن عنصری کے مطبوعہ دیوان میں صرف تین ہزار کے لگ بھگ  
اشعار ہیں۔

مندرجہ ذیل پانچ شقوں میں بھی اس کے نام سے منسوب ہیں لیکن  
ہم تک ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنچ سکی :  
۱۔ عین الحیات۔ (۲۱) شاد بہر (۳) سُرخ بت (۴) خنک بت  
(۵) وامق و عذرا۔

## عنصری کی شاعری پر تنقیدانہ نگاہ

فارسی قصیدہ گوئی کے متقدمین میں عنصری کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں زود کی اس کا پیشرو ہے۔ لیکن قصیدے کو ایک مستقل صنف کے درجے تک پہنچا کر اس میں فطری تصاویر کی جھلک پیدا کرنا عنصری ہی کا کام ہے۔ قصائد عنصری نے ایک ممتاز شاہ راہ ڈال دی جس پر چلنا متاخرین کے لئے باعث افتخار اور موجب ترقی ہوا۔ اس نے سب سے پہلے قصائد میں فلسفیانہ خیالات کو ادا کیا اور یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر اسے حکیم کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ اُسے ایرانی شعرا میں وہی امتیازی رتبہ حاصل ہے جو المنینی کو عرب شعرا میں۔ یہ خیال رشید الدین و ہواط کے سے نقاد کا ہے۔

عنصری کے کلام کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں :  
زبان کا اعلیٰ معیار۔ پُر شوکت اسلوب بیان۔ خوشگوار طرز ادا۔  
جذبات تشبیہات۔ لطافت استعارات۔ ترصیع اور لف و نشر کی سی  
صنائع لفظی۔ حسن گریز۔ مناظر فطرت کی تصویر کشی۔ بلندی  
تخیلی وغیرہ وغیرہ۔

عنصری کے قصیدوں کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ مذکورہ بالا خیروں کے علاوہ اس کا دامن بے غیرتی اور خوشامد کے بدعنا دھبوں سے بہت حد تک پاک ہے۔ اور یہ کہ وہ حقیقت پر فارسی قصیدہ گوئی کا باوا آدم ہے۔ اگرچہ انوری اور خاقانی کے سے قصیدہ گو اسے نئی پہلوؤں میں پیچھے چھوڑ گئے ہیں، پھر بھی اصلی اقتدار تو اولین پیشرو کو ہی ہو سکتا ہے۔

سوال: عسجدی اور غضاری پر مختصر نوٹ لکھو۔  
 عسجدی - ابو نظر عبدالعزیز بن منصور متخلص "عسجدی" سلطان محمود غزنوی کے دربار کا ایک مشہور اور بلند مرتبہ شاعر گذرا ہے۔ اس نے ۳۳۳ھ میں وفات پائی۔ عسجدی کا بہت سا کلام ناپید ہے۔ اس نے سلطان محمود کی تعریف میں بہت سے قصیدے لکھے اور انعام و اکرام پایا۔ عنصری کی عزت اور ثروت پر رشک کھاتا رہا۔ اور اپنی حالت پر افسوس کھانا تھا جیسا کہ اس کے اپنے کلام سے ظاہر ہے۔  
 فغان از دست ستم ہائے گنبد دوار فغان از سقلی و علوی وثابت و ستار  
 جفا کے چرخ بسے دیدہ اند اہل ہنر از آل بہرہ شکایت نمی کنند از ار  
 کہتے ہیں اس کے دیوان میں ہیں ہزار شعر تھے لیکن اب صرف چند  
 قصیدوں قطعوں اور ایک ثنوی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔

اس کے قطعات سے جو زمانے کی دستبرد سے بچ گئے ہیں۔ بخوبی ظاہر ہے کہ اُسے کلام پر عبور حاصل تھا۔ صنائع بدائع بھی اس کی شاعری کی خصوصیت تھی۔ تذکرہ نویسوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ

وہ قصیدہ جو اس نے سو منا تھ کی فتح پر لکھا ہے سب سے زیادہ اچھا ہے۔

غضاری بھی غزنوی دور کا ایک بڑا شاعر تھا۔ اور زمانے کے رواج کے مطابق قصیدہ گو اور مدح سر تھا۔ عنصری کا ہم عصر تھا۔ مگر بجائے سلطان محمود غزنوی کے یہاں اللہ دہلی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس کی مدح میں شعر کہتا رہا۔ غضاری فنِ قصیدہ گوئی کا استاد تھا۔ مبالغہ اس کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ غضاری نے سلطان محمود غزنوی کی مدح میں ایک پر زور اور فصیح قصیدہ لکھا جس سے اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ عنصری نے اس قصیدے کے جواب میں اسی وزن میں ایک قصیدہ لکھا اور پھر غضاری نے جوابِ انجواب میں ایک اور قصیدہ لکھا۔

سوال: فرخی کی زندگی اور شاعری پر مفصل نوٹ قلم بند کیجئے۔  
 جواب: حکیم ابوالحسن علی فرخی سیستان میں پیدا ہوا۔ بچپن میں موسیقی کی تعلیم پائی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری سے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ فرخی نے جب بلخ کے حاکم حکیم ابوالمنظف احمد بن محمد چغانیان کی قدر شناسی اور شعر پروری کا حال سنا تو اس کے دربار میں قصیدہ لے کر حاضر ہوا۔ اسی امیر کے ذریعہ سے سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہنچا نصیب ہوا۔ فرخی کے اکثر قصیدے محمود، مسعود اور محمود کے خاص درباریوں کی مدح میں لکھے گئے۔  
 فرخی نے علم عروض کے متعلق ایک نہایت مستند کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے ”ترجمان البلاغت“

رشید الدین دطواط نے اپنی مشہور کتاب "حقائق السحر" کے لکھنے میں ترجمان البلاغت سے بہت مدد لی۔ نکلسن کی رائے ہے کہ فرخی کے اولین قصیدوں میں بہت قصص ہے۔ ضرورت سے زیادہ صنائع لفظی و معنوی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے کلام میں روانی صفا کی اور سلاست آگئی جو اتفاقاً طور پر حاصل نہیں ہو اگر تکی بلکہ فن کی مشق سے پیدا ہوتی ہے۔ عوفی کے تذکرے میں فرخی کا ان سلیس اور صاف قصیدوں میں اور دوسرے اشعار کے ساتھ ذکر آئی ہے جنہیں ہم سہلی المتنح کہتے ہیں۔

فرخی نے <sup>۱۱</sup> وفات پائی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ فرخی کے کلام کا عام جوہر زبان کی صفائی، سلاست اور روانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صنائع بدائع کی بہتات ہے۔

قافی کا بڑا اعجاز یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قصیدوں میں ہر قسم کے واقعات اس طرح بے تکلف ادا کرتا چلا جاتا ہے گویا دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ فرخی سے اس کا موازنہ کرنے پر صحت معلوم ہو گا کہ جو بات قافی کو ہزار برس بعد حاصل ہوئی فرخی کو اسی وقت حاصل تھی اُس نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی ہے۔ اُسے خیالات کی ہر وہ تصویریں اتارنے پر خاص عبور حاصل تھا سلطان محمود کی وفات پر جو مرتبہ اس نے لکھا اس میں جوش بیان کے ساتھ ساتھ گہرے درد و گداز کا عنصر غالب ہے۔ مرتبہ کو کس شاعرانہ انداز سے شروع کرتا ہے۔

شہر غزنوی نہ ہمارا سنت کہ من دیدم بار چہ قیامت کہ امسال دگر گویا شد کار



فرخی نے اپنے کلام میں عشقیہ خیالات کو بھی ایک جداگانہ خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

ہمہ دشمنی از تو دیدم و لبیکم نگویم کہ تو دوستی را نشائی  
ایک اور جگہ کس شاعرانہ طرز ادا سے کہتا ہے۔

نہ بر خیرہ بدو دل داد محمود دل محمود را بازی میبندار  
فرخی کو محمود کے دربار میں ایک بلند اور باعزت مقام حاصل تھا۔ اور اس کے انعام و اکرام سے خوب مالا مال ہوا جیسا کہ خود ایک قصیدے میں کہتا ہے۔

باضیعت آبادم و با خانہ آباد بانعت بسیارم و با آفت بسیار  
ہم بار بہ اسم و ہم با گلہ میشین ہم صنم چینم و ہم بابت فرخار  
ساز سفرم است و نوائے حضرم است

اسبان شبک سار و مستوران گرانبار  
فرخی کے دیوان میں نو ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ قصائد کے علاوہ غزلیات، قطعات، رباعیات اور ترجیع بند بھی لکھتے ہیں۔ کئی بلند رتبہ شعرا اور فضلاء نے فرخی کے کلام کی تعریف کی ہے۔

فرخی کے یہاں لطیف اور دلکش تشبیہات کی کثرت ہے۔ اس کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے سادگی اور صفائی اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کے کلام میں ابتذال نام کو بھی نہیں خوش اخلاقی اور نیک سیرتی پر زور دیا ہے۔ تغزل اس کی شاعری کی جان ہے مناظر فطرت کی خوب تصویر کھینچتا ہے۔ اس کے استعارات اور تشبیہات نرے اور دلپذیر ہیں۔ جذبات نگاری میں خاص ملکہ پایا تھا۔ سوز و

گزار اس کے کلام کا خاص جوہر ہے کیونکہ اس نے ایک دردمند دل پایا تھا۔ وہ اہل عالم کے مصائب سے فوراً متاثر ہو جاتا۔ فرحتی کے کئی اشعار میں تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ سلطان محمود کا ندیم تھا۔ اور ہندوستان کی کئی جہات میں اس کا شریک تھا۔ اس لئے جو قصائد سلطان کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ اس لئے اس کے قصائد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں تاریخی واقعات تاریخی ناموں اور مقامات کے ذکر میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے۔ بعض مقامات پر کلام میں اس زمانے کے رسوم و آئین کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ سلطان کی مجالس کا ذکر۔ نوروز اور مہرگان کے جشنوں کا حال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سوال: منوچہری دامغانی کے احوال زندگی اور آثار کلام پر روشنی ڈالئے۔ اس کے اسلوب اور کلام پر تنقید بھی سپرد قلم کیجئے۔

جواب: ابوالنجم احمد منوچہری دامغان کارہینہ والا تھا۔ اس نے اپنا تخلص اپنے ممدوح فلک المعانی منوچہر بن قابوس کے نام پر اختیار کیا۔ اگرچہ منوچہری سلطان محمود غزنوی کے عہد میں بحیثیت شاعر شہرت پا چکا تھا لیکن اس کے دربار سے وابستہ نہ تھا۔ اور نہ ہی اس کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا۔ درحقیقت وہ سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کا درباری شاعر تھا اور اس کے بیشتر قصائد سلطان مسعود اور اس کے امرا و وزرا کی مدح میں لکھے گئے۔

منوچہری متقدمین کے اشعار اور بالخصوص عرب شعرا کے کلام کا

دلدادہ تھا۔ اور ان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعض قصیدوں میں عربی الفاظ اور تراکیب کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ اسے عربی موضوعات اور عربی شاعری سے خاص انس تھا۔ عربی زبان پر اُسے کامل عبور حاصل تھا۔ لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے عربی ترکیبوں کو فارسی زبان کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ فارسی زبان کا حصہ بن گئی ہیں۔

منوچہری کے کلام کا بیشتر حصہ روانی اور شیرینی کا نمونہ ہے۔ اس کے قصائد کی ابتداء تفرل سے ہوتی۔ اور تشبیب کے بعد ممدوح کی تعریف شروع کر دیتا ہے اس کا کمال اسی تشبیب کے تفرل میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس میں کبھی حسن فطرت، کبھی حسن محبوب اور کبھی جذباتِ دل کی عکاسی ہوتی ہے۔

منوچہری کے کلام کی ایک اور خصوصیت سادہ۔ فطری اور دلپذیر تشبیہات اور استعارات کا استعمال ہے بعض اوقات وہ غیر فطری اور خیالی تشبیہات سے بھی کام لیتا ہے لیکن ان کی دلکشی اور ندرت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

منوچہری کو فطرت اور اس کی رنگینیوں سے خاص لگاؤ تھا۔ درحقیقت وہ فطرت کا پجاری تھا۔ فطرت کے حسن پر لگوں تھا۔ اور اپنے کلام میں مناظر قدرت کی خوب تصویریں کھینچی ہیں زبان پر قدرت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ اس سے کلام کو پڑھنے والا اس کے جوشِ بیان۔ صدقِ احساسات اور حسنِ ادا پر عیشِ عشق کرنے لگتا ہے اور تہہ دل سے خراجِ تحسین ادا کرتا ہے۔ رات کی تاریکی کا بیان

ملاحظہ ہو۔

شبہ گیسو فردمشتہ بدامن      بلا سش معجز و قیریش گرز ن  
بہ کردار زین زنگی کہ ہر شب      بزاید کودکیا بلغاری آن زن  
طلوع خورشید کے نظارے کا بیان یوں کرتا ہے :-

سراز البرز برزد قرص خورشید      چوں خون آلودہ دزدے سرزمین  
بکردار چراغ نیم مرده      کہ ہر ساعت فزوں گردوش روغن  
ستاروں کا بیان کس شاعرانہ انداز سے ہے :-

ترسیا چوں میثرہ بر سر چاہ      دو چشم من براد چوں چشم بثرن  
ہے برگشت گرد قطب جدی      چو گرد با بز ن مرغ مثن  
بنات النعش گرداد ہے گشت      چوں اندر دست مرد چپ فلاخن  
منوچہری کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار سر

انگیز اور امید افزا ہیں۔ وہ نشاط و طرب کا پیامبر ہے اور یاس و قنوط کا مخالف۔ فارسی شعر میں ایسے اشعار بہت کم ہیں جن سے منوچہری کے سے طربناک رنگ کی جھلک ظاہر ہو۔ منوچہری نے اس رنگ کو خاص طور پر مستط میں خوب نبھایا ہے۔ اس کے مستط قادر الکلامی کا نمونہ ہیں اور ان میں نشاط و مسرت اور رجائیت و سرور کی روح سموئی ہوئی ہے۔ وہ زندگی سے لطف اٹھانے کی تلقین کرتا ہے جس فطرت کے دیدار کی دعوت دیتا ہے۔ رقص و سرود کی محفلوں سے لطف اندوز ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ وراصل وہ عمر خیام کے فلسفہ عیش و عشرت کا مبلغ ہے۔

منوچہری کی جذبات نگاری قابلِ داد ہے۔ اسے انسانی طبیعت

اور اس کے ارمانوں سے پوری پوری آگاہی ہے۔ اس کے کلام کا خالص جوہر سوز و گداز ہے۔ وہ ایک درد مند دل رکھتا ہے جو دوسروں کے مصائب و آلام پر یکجہلنے لگتا ہے۔ وہ گرے ہوئے یا فخر زدہ دل کو اٹھانے اور ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔

قصیدہ گوئی کے علاوہ اس کو طب، نجوم، نحو اور حکمت سے بھی دل بستگی تھی۔

سوال: فردوسی کے احوال و آثار پر پوری پوری روشنی ڈالنے اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔

جواب: ابوالقاسم حسن (منصور) بن علی فردوسی شاداب (طوس) کے مقام پر ۹۷۵ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک امیر دہقان تھا بچپن سے ہی اُسے ایرانی کہانیوں کے سننے کا شوق تھا۔ ابو منصور العمیری کی تالیف کی ہوئی کتاب جس میں قدیم بادشاہوں کے قصے درج تھے۔ فردوسی کی دلچسپیوں میں اور بھی اضافے کا سامان بنی۔ یہاں تک کہ بعض اہل اعراف کے کہنے سے اس نے شاہنامہ لکھنے کا اتنا بڑا کام ہاتھ میں لے لیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا مقصد اپنی اکلوتی بٹی کے بیاہ کے لئے مال و زر حاصل کرنا تھا۔ بہر حال شاہنامہ کی پہلی اشاعت پچیس برس کی محنت کے بعد ۹۹۹ء کے قریب مکمل ہوئی دوسری اشاعت جسے فردوسی نے محمود غزنوی کی خدمت میں پیش کیا۔ شاہنامہ کے لگ بھگ تیار ہوئی۔ کئی محققین اس خیال کے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے کہ محمود نے فردوسی کو شاہنامہ کی تکمیل کے لئے کہا۔ اور ہر ایک شعر کے لئے سونے کی ایک اشرفی دینے کا وعدہ



کیا۔ خیر جیسے بھی ہوا بادشاہ نے یہ صلہ ادا نہ کیا۔ صحیح وجہ اب تک معلوم نہ ہو سکی  
 ساٹھ ہزار سو نے کی اشرفیوں کی بجائے چاندی کی ہر س ہفتی دیکھ کر فردوسی  
 بہت مایوس ہو گیا۔ اور محمود سے رنجیدہ ہو کر طوس کو چلا گیا۔ محمود کی پیشانی  
 کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ عام یہ ہے کہ اس نے  
 ساٹھ ہزار سو نے کی اشرفیاں یا ان کے برابر نیل اونٹوں پر لد کر  
 طوس بھیجا۔ لیکن جب اونٹ ایک دروازے سے داخل ہو رہے  
 تھے، دوسرے دروازے سے غزوہ شاعر کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس میں  
 شک نہیں کہ یہ اونٹوں اور جنازے کی کہانی قصے کو شاعرانہ طور پر درناک  
 بنانے کے لئے گھڑی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے محمود کی بدسلوکی کے سبب ایک بھوجی  
 لکھی۔ لیکن اس امر کے متعلق بھی کئی مختلف خیال ہیں۔ کئی تنقید نگاروں  
 نے اس بھوجی کو بعد کے کسی شاعر کی اختراع بتایا ہے۔ کئی محققوں نے  
 کہا ہے کہ یہ بھوج خود شاہنامہ میں سے کچھ اشعار نکال کر تیار کی گئی۔  
 شاہنامہ کے علاوہ فردوسی نے یوسف زلیخا کے قصے کو بھی نظم  
 کیا۔ اس میں کوئی نو ہزار شعر ہیں۔ اور مایوسی کی جھلک ہے۔ وہ زندگی اور  
 شگفتگی جو شاہنامے کے کچھ بزمیہ شعروں میں نظر آتی ہے اس نظم میں  
 غائب ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ نظم بعد میں نظامی گنجوی ایسے بے  
 مثال مثنوی گو کے لئے نمونہ بنی۔

کچھ غزلیہ اشعار بھی فردوسی کے نام سے منسوب ہیں۔ لیکن تذکرہ  
 نویسوں نے انہیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی البتہ اس بات سے انکار  
 نہیں کیا جاسکتا کہ ان شعروں سے کئی ایسی باتیں اخذ ہوتی ہیں جو شاعر

کی زندگی سے متعلق ہیں۔

فردوسی نے کوئی نوے برس کی عمر پا کر ۱۰۲۱ء اور ۱۰۲۵ء کے درمیان انتقال کیا۔ شاہنامہ ان بلند پایہ کتابوں میں سے ایک ہے جو دنیا کے بہترین ادبی شاہکار خیال کئے جاتے ہیں۔ فردوسی کو اس کی خاص صفت شاعری میں پیغمبر مانا گیا ہے۔ ہندوں نے اُسے مشرق کا ہوتر کہا ہے کیونکہ جس طرح ہوتر نے یونان کی روح کو بیدار کیا تھا اُسی طرح سے فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایران کے افتخار کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ شاہنامہ دراصل قدیم ایران کی تاریخ اور تمدن کا ایک نہایت رنگین اور پُر حاصل ذخیرہ ہے۔ فردوسی نے ایرانی تہذیب کا اتنا موثر اور صحیح نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے کہ اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایران جدید میں ایک زبردست مصلح اور ایک بے نظیر ملت پرست کا رتبہ دیا گیا ہے۔

شاہنامہ جہاں شاعری اور بلاغت کے اعتبار سے نظیر نہیں رکھتا وہاں بلحاظ مضامین بھی اس کی بلندی اور اہمیت کو بہت کم نظمیں پہنچ سکتی ہیں۔

چو فردوسی آں زندہ جاوداں کز زندہ شد نام پیشینیاں  
اس کے متعلق خود فردوسی نے بھی کہا ہے

ہر اُس کس کہ دارد ہش و رای و دین پس از مرگ بر من کند آفرین  
نمیرم ازین پس کہ من زندہ ام کہ ختم سخن را پر آگندہ ام  
شاہنامہ کی بے نظیر مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ قومی افتخار کی روح، زبان کی وسعت، قدیم الفاظ کا مطالعہ، حب الوطنی پرانے

قصوں کا بیان وغیرہ فردوسی نے اپنے غیر فانی شاہکار کے لئے جن ماخذوں کو استعمال کیا وہ یہ ہیں :-

۱- وہ قصے کہانیاں جو سینہ بسینہ چلے آئے تھے۔

۲- نامہ پہلوی۔ اس ماخذ کو خود فردوسی نے نامہ پہلوی لکھا ہے کئی محققوں نے اس لفظ کی تفسیر نامہ خسروی، نامہ خسروان یا نامہ یاستان کی ہے۔ غالباً اس سے مراد خدائی نامہ ہے جس کا اکثر جگہ ذکر آیا ہے یہی کتاب تھی جسے المقنع نے عربی زبان میں ”سیر ملوک العجم“ کے عنوان سے ڈھالا۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ فردوسی نے شاہنامہ لکھنے میں جھوٹ سے بہت حد تک پرہیز کیا ہے۔ جس واقعہ کے متعلق اسے یقین علم نہیں ہوتا وہ اسے ذرا سنبھل کر بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اشکانی بادشاہوں کے متعلق کہتا ہے :-

ازیشاں جزا نام شنیدہ ام      نذر نامہ خسرواں دیدہ ام  
حمرہ اصفہانی اور البیرونی نے ثابت کر دیا ہے کہ شاہنامہ کے ماخذ پہلوی زبان میں لکھی ہوئی مستند کتابیں تھیں۔

”فردوسی غیر فانی“ نامہ کا مقالہ لکھنے والے صاحب فرماتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے فردوسی سے فردوسی کو خاص اس مقصد کے لئے پس کیا تھا کہ ایران کی تاریخ اہرمین (شیطان) کی امت یعنی تاتار لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہو جانے کے اندیشے سے پہلے ہی محفوظ ہو جائے۔

جناب ہادی حسن فرماتے ہیں کہ شاہنامہ نظم کرنے میں فردوسی

نے جہاں اس بات کا خیال رکھا کہ وہ صرف اپنی ذات کے احاطے میں محدود نہ رہے وہاں اُس نے قوم پرستی کی سرحد کے عبور کر جانے کو بھی قبول نہ کیا۔ جس قدر کہ اس نے دوسری زبانوں کے الفاظ سے پرہیز کیا اسی قدر ان کی تشبیہوں سے چشم پوشی کی شاہنامے میں غری الفاظ کی اتنی قلت نہیں جتنی کہ عرب بہادروں کی۔ فردوسی جب ایرانی بہادروں کے لئے کوئی تشبیہ پیدا کرنا چاہتا تو عرب بہادروں کا بیان کرنے کی بجائے قدرت کی طاقتوں سے سامنے ہاتھ پھیلاتا۔ تیزی کا ذکر مطلوب ہوتا تو ہوا اور گرد کو درمیان لے آتا۔ گر جنے اور غصے میں آنے کا مقام آتا تو بادل اور آگ کو یاد کرتا۔

جناب ہادی حسن کا خیال ہے کہ فردوسی کو جو عبور حرکت کے بیان کرنے پر کھادہ آوازوں کو ظاہر کرنے میں حاصل نہیں تھا۔ ہماری رائے میں فردوسی کو حرکت کے استعارہ بیان میں بھی اچھی دسترس نہ تھی۔ اس کی تصویریں نہ صرف خاموش ہی ہیں بلکہ غیر موثر بھی۔ اگر اچھی آوازوں کے لئے "خوش" کے علاوہ اس کے پاس بہت کم الفاظ ہیں تیزی رفتار کی مشابہت کے لئے بھی ہوا اور گرد کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں رکھا۔ لیکن جب شاہنامے کی عظمت اور فردوسی کی لازوال خدمت کا سوال پیش آتا ہے تو ہمیں ان شاعرانہ باریکیوں کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے۔

مولانا شبلی نے فردوسی اور شاہنامہ کے متعلق بہت تفصیلی کے ساتھ بہترین بحث کی ہے۔ ضروری اقتباس نیرک کے طور پر

درج کیا جاتا ہے۔

## شاہنامہ کی خصوصیات اور اہمیت

- ۱۔ فردوسی کی قدرتِ زبان یہ ہے کہ ساٹھ ہزار اشعار لکھ ڈالے اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اگرچہ اس خصوصیت کا موجد دقیق ہے۔ لیکن اس کے یہاں کل ہزار ایک شعر اور چند معمولی واقعات ہیں۔ حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں فلسفیانہ... اصطلاحیں آتی ہیں۔ اور وہ بے تکلفی سے سادہ فارسی میں ان کو ادا کرتا جاتا ہے کہ گویا روزمرہ کی باتیں ہیں۔ شیخ بوعلی سینا اپنی کتاب ”حکمت علامیہ“ میں اس کو شش کی سمجھا نہیں سکا۔
- ۲۔ شاہنامہ بظاہر تو محض ایک رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آ جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامہ کی مدد سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کا پورا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔
- ۳۔ ایشیائی شاعروں کا عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرتے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقعہ آ جاتا ہے تو اس قدر پھیلے ہیں کہ تہذیب اور سنجیدگی کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں۔ نظامی اور جامی ایسے مقدس لوگ بھی اس حمام میں آ کر ننگے ہو جاتے ہیں۔ لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ تقدس کا دعویٰ نہیں کرتا ایسے موقعوں پر آنکھ بند نہیں کرتے ہوئے آتا ہے اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز



نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے۔

۴۔ جہاں جہاں بزم کا موقع آتا ہے شاعری کا چمن زار کھل جاتا ہے۔ ہر چیز کہ عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا یا نہیں لکھ سکتا۔ بے شبہ یوسف زلیخا میں بزم کے پھیلے ہوئے کا سبب فردوسی کی دل نشنگی اور کثرت الم تھا۔

فردوسی نکتہ سنجی۔ بلاغت شعاری مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تعلقات سے نہایت خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوا ہے اس کے بزمیہ شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں۔۔۔ استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے۔ شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں۔ وہ اپنے گیر گیر کے انداز خوب جانتا ہے۔ عشقیہ شاعری کا کمال دکھانے کے ساتھ ساتھ وہ مناسبت اور شائستگی کے سر رشته کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ تاخرین بلکہ نظامی اور سعدی تک کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں نکل جاتے۔

۵۔ شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے۔ فردوسی ان دونوں باتوں میں تمام شعر اکا پیشرو امام ہے وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے اس کے تمام جزئیات اور گرد و پیش سے ہر قسم کے حالات ڈھونڈ ڈھونڈ کر سدا کرتا ہے۔ پھر ان کو اس خوبی کے ساتھ ہو ہوا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے بچھ جاتی ہے۔

وہ استعارہ کے پاس ہو کر نہیں نکلتا تشبیہیں وہی پاس کر لیتا ہے۔ مجاز کو بہت کم ہاتھ لگاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان باتوں

میں قاصر ہے بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں واقعہ کے چہرہ پر نقاب ڈال دیتی ہیں۔ استعارات اور تشبیہات سے جب اُسے طباعی اور انشائیہ داری کا زور دکھانا مقصود ہوتا ہے تو وہ دوسرے موقعے تلاش کرتا ہے۔

۳۔ اس کی تفصیلی واقعہ نگاری کی بدولت ہم کو بہت سے ایسے محاوروں تک رسائی ہوتی ہے۔ جو یوں کبھی عام طریقہ بیان میں نہیں آ سکتے تھے واقعہ نگاری جب بہت دور حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ مرقع نگاری یعنی سین دکھانے میں نہایت کامیاب رہتا ہے۔

۴۔ جب کبھی درد و غم کے اظہار کا موقع آتا ہے (مہر جنید کہ رزمیہ میں ایسے مواقع کم آتے ہیں) فردوسی نے کمال کر دکھایا ہے بلاغت یہ ہے کہ وہ ایسے واقعات کو زیادہ پھیلاتا نہیں۔

۵۔ بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ جب کسی واقعہ کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے تو لمبی چوڑی تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پرزور مختصر جملہ کام دیتا ہے۔ شاہنامہ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

کنوں جنگِ سہراب و رستم شنو      دگر یا شنیدستی ایں ہم شنو  
”ایں ہم“ نے داستانِ سہراب و رستم کو بہت زیادہ اہمیت دیدی ہے۔ سننے والوں کی توجہ ایک دم اور پوری طرح سے شاعر کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ ان دو لفظوں نے وہ کام کیا ہے کہ دس شعر بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔

نظامی نے اپنے فخریہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں

لیکن فردوسی کے صرف دو مصرعے سب پر بھاری ہیں۔  
 بسے رنج بردم دریں سال ہی عجم زندہ کردم دریں پار ہی  
 رستم کی بار دھار، ہنگامہ آرائی اور قتال و جدال کا سماں صرف  
 چار مصرعوں میں دکھایا ہے۔

بروز نبرد آں یل ارجمند بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کند  
 درید و برید و شکست و بہست یلاں را سر و سینہ و پا و دست  
 ایک اور جگہ بہت سی باتوں کو صرف ایک ہی شعر میں بند کر دیتا ہے۔  
 پئے مشورہ مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

۸۔ صنائعِ بدائعِ شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں۔ اس لئے  
 فردوسی کے کلام میں ڈھونڈنا نہیں چاہئے۔ لیکن جو محاسنِ شاعری  
 ضمناً کسی صنعت میں آجاتے ہیں۔ اس کے کلام میں پائے جاتے  
 ہیں اور اعلیٰ درجہ پر پائے جاتے ہیں۔

## شاہنامہ کی زبان کی خصوصیات :

- ۱۔ ضمیروں کی انوکھی ترکیب۔ ع
- زشادی رخاں شاں چو گل بردمید  
 (رخاں شاں = رخ انشاں)
- ۲۔ غیر جاندار چیزوں کی جمع الف نون کے ساتھ۔ ع
- اگر عمر باشد مرا سالیاں  
 (سالیاں = سالہا)
- ۳۔ اسم اور فعل کے آخر میں الف زاید۔ ع

سیاکس برآمد برہند تنشا

(تننا = تن)

ع بہ سر روزگیتی بہ پیا یدا

(پمیا یدا = پماید)

۴۔ فارسی الفاظ پر تشدید: خوشی۔ زری۔ خم۔ مژہ وغیرہ

۵۔ بعض زائد حروف: چو ناں بجائے چناں۔ اشیوا بجائے اشیاء۔

۶۔ اندرون بجائے در۔ ع

بگویم ز مادرش:

(مادرش = مادرش۔ پدرش = پدرش)

ع بہ شادی ہمہ جاں یراقتانندند

(اقتانندند = اقتانندند)

۸۔ نے کے پہلے الف زاید ع

ع ائے او نباشیم در جنگ شاد

۹۔ کجا بمعنی کہ ع

درفشش کجا پیل پیکر بود

۱۰۔ تائے خطاب کا استعمال۔ ع

بزارانت کو دک وہم نوش لب

۱۱۔ میم تنکلم کا گرا دینا۔ ع

اگر من نہ رفتے بہ ما زندان

(رفتے = رفتے)

ان کے علاوہ دیا بجائے یا۔ از بجائے ازیں۔ آزمون۔

بجائے آزمائش۔

ان تصرفات کے علاوہ سینکڑوں الفاظ ہیں جو بالکل متروک ہو چکے ہیں یا ان کی صورتیں بدل چکی ہیں۔ یا ان کی بجائے اور اور الفاظ استعمال میں ہیں۔

فردوسی کے کلام میں جو خاص بات کہی جگہ دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی فلسفیانہ نصیحت کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک بہت بڑے ریفارمر سے کم نظر نہیں آتا۔ ع  
تو تا خاک یا بی ہمتہ دوست کار

ایک اور جگہ خوب کہتا ہے

شنیدم ز دانا کہ دانش بسے است      ولیکن پر آگندہ باہر کسے است  
نیام بلندار بہ غلطی بہ خوں      بہ از زندگانی بہ تنگ اندر  
عقل مند کی باتوں کو غور کے ساتھ سننے اور ان پر عمل کرنے کی اس سے بہتر تر غیب کیا ہو سکتی تھی۔

اگر دانشی مرد راند سخن      تو بشنو کہ دانش نگر دہن  
شاید نامہ پر بہت سی زبانوں میں تنقیدیں لکھی گئی ہیں اور ترجمے کئے گئے ہیں۔

سوال: غزنوی دور کے مشہور علما اور ادبا پر نوٹ لکھئے!

جواب: غزنوی دور میں مندرجہ ذیل مشہور فضلاء اور حکما ہوئے ہیں۔  
۱۔ شیخ ابوعلی سینا۔ شیخ ابوعلی سینا ایک عظیم المرتبہ فلسفی اور جلیل القدر عالم ہے۔ اس کا والد نوح بن منصور کے دور حکومت میں بلخ چھوڑ کر بخارا آباد ہو گیا تھا۔ ابن سینا ۳۵۰ھ میں



پیدا ہوا۔ چھوٹی عمر میں ہی تمام علوم حاصل کر لئے اور قرآن مجید کی تعلیمات پر بھی عبور پالیا۔ اس کے بعد علم فقہ منطق نجوم۔ ریاضی اور طب کی تکمیل کی۔ اس کے صغیر سنی میں اس قدر عالم و حکیم ہونے پر اس کے استاد دنگ رہ گئے۔ حکمت الہیہ اور ماوراء الطبیعیات کے مسائل پر خاص توجہ دی۔ اس طرح علم و فضل سے آراستہ ہونے کے بعد دقیق فلسفیانہ مسائل اور اصول طب کی تدوین کی اور امراض کے علاج میں مصروف ہو گیا۔ ان میں اُسے بے حد شہرت نصیب ہوئی۔

اول اول وہ سامانی حکمرانوں کے دار الخلافہ بخارا میں مقیم رہا اس کے بعد خوارزمشاہیوں کے پائے تخت کرکچ میں چلا گیا۔ یہاں مامون بن مامون خوارزمشاہی کے دربار میں اس نے بہت عزت کا مقام حاصل کیا۔ سلطان محمود غزنوی کے ظہور کے بعد وہ زیاریوں کے پائے تخت گرگان میں چلا آیا۔ یہاں سے رے۔ ہمدان اور اصفہان گیا۔ شمس الدولہ بن فخرالدولہ دیلمی کی ملازمت اختیار کر لی اور دوبار ہمدان میں اس کی وزارت پر فائز ہوا۔ سفر کے مصائب اور حکومت کے فرائض منصبی کے باوجود اس نے علم و تہذیب کے طالبوں کی مدد کی اور انہیں علم و حکمت کے نور سے مستفیض کیا۔ اور سابقہ ہی بلند درجہ تصانیف بھی مرتب کیں۔

شیخ صاحب کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ”شفا“ ہے جو حکمت، منطق،

طبیعیات اور ریاضیات پر مشتمل ہے۔ دوسری شہرہ آفاق تصنیف کتاب ”قانون“ ہے۔ یہ طب پر ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں: ۱۔ کلیات۔ ادویہ مفردہ۔ امراض مخصوصہ اعضا۔ امراض عمومی بدن۔ ادویہ مرکبہ۔ ایک اور تالیف ”اشارات“ ہے۔ یہ کتاب منطق اور حکمت پر ہے۔ ان کتابوں کو دنیا کی اولین بڑی تصنیفات میں شمار کیا جاتا ہے۔

شیخ علم و ادب میں بھی کمال رکھتا تھا۔ عربی فصاحت بھی لکھے ہیں۔ مثلاً قصیدہ نفس۔ ”سلامان“ اور ”السال“ جیسے عربی قصے بھی لکھے۔ ایک عربی لغت بھی مرتب کی تھی جو ناپید ہے۔ شیخ نے فارسی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ اس کی فارسی کتاب فلسفہ پر دانش نامہ علائی کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی میں شعر بھی کہے۔ ۳۸۰ھ میں بمقام ہمدان انتقال کیا۔

۲۔ ابو الفضل بیہقی: ابو الفضل بیہقی نے اکثر معاصر علما کے برعکس عربی کے بجائے فارسی زبان کو اپنی تصانیف کا ذریعہ بنایا۔ اس نے غزنوی بادشاہوں کی ایک جامع اور مبسوط تاریخ تیس جلدوں میں تالیف کی جن میں سے بیشتر ناپید ہیں یہ ایک شاہکار ہے جو نہایت بلیغ اور دلکش فارسی زبان میں لکھا گیا۔ جو جلدیں اس تاریخ کی بچی ہیں وہ سلطان مسعود کے دور سے متعلق ہیں۔ یہ تاریخ مسعودی کے نام سے موسوم مگر تاریخ بیہقی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات اور حقائق کو صداقت اور غیر جانبداری

کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مبالغہ یا باطل نام کو بھی نہیں۔ دراصل اس نے تاریخ نگاری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ ۱۵۳۷ء میں یہ تاریخ مکمل ہوئی تھی۔ اس عالم مورخ نے وفات پائی۔

۳۔ بدیع الزمان: ابوالفضل احمد بن حسن بدیع الزمان ہمدانی غزنوی دور کا ایک بلند پایہ اور مشہور ادیب تھا۔ اس کی خط و کتابت ہم عصر بڑے بڑے علماء و فضلاء سے رہتی تھی۔ اس نے ادبی روایتوں اور کہانیوں کو مستحجج عربی نثر میں لکھا اور مقالہ نویسی کا سبک ایجاد کیا۔ اس کی کتاب ”مقامات بدیع الزمان“ میں اکیاون مقامات ہیں۔ اور اسے سیستان کے امیر خلف بن احمد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اسے عربی ادب میں ایک بلند درجہ حاصل ہے۔ بدیع الزمان فارسی زبان میں بھی شعر کہتا تھا۔ ۱۵۹۸ء میں وفات پائی۔

۴۔ ثعالبی: ابو منصور عبد الملک بن محمد ثعالبی نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ غزنوی دور کے بلند درجہ ادبا میں شمار ہوتا ہے قصص۔ امثال۔ حکم اور لغت پر اس کی متعدد کتابیں ہیں اس نے بہت سے عربی گو ایرانی اور عرب شعرا کے حالات اور منتخب کلام پر ”تیمۃ الدیر“ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اور پھر اس کی تکمیل ”تیمۃ البقیۃ“ کے نام سے کی۔ ۱۲۲۹ء میں انتقال کیا۔

۵۔ ابوعلی مسکویہ: ابوعلی محمد مسکویہ غزنوی دور عربی کا ایک عظیم القدر عالم اور مورخ گذرا ہے۔ کہتے ہیں پہلے زرتشتی (آتش پرست) تھا بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ عنصر الدولہ دیلمی کے

دریاری میں اسے قرب حاصل تھا۔ اور اس کا خزانچی تھا۔ اس کی متعدد کتابیں تاریخ، طب اور اخلاق پر ہیں۔ اسلام اور ایران کی عام تاریخ پر اس کی مشہور تصنیف ”تجارب الامم و تعاقب الہمم“ ہے، اُسے تاریخ نویسی کے فن میں خاص جہارت حاصل تھی۔ ایک اور مشہور تالیف ”تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق“ ہے جس میں اخلاق سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ مشہور فلسفی نصیر الدین طوسی نے اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ اس نے ۷۲۱ھ میں انتقال کیا۔

۶۔ بیرونی۔ ابوریحان محمد بن احمد بیرونی دنیا کے بلند پایہ حکما اور ایران کے حلیل القدر علما میں سے ہے۔ ۳۶۲ھ میں پیدا ہوا۔ بیرونی نزد خوارزم کارہنہ والا تھا۔ اوائل عمر خوارزم میں بسر کی۔ مامون بن مامون خوارزم شاہ اور گرگان کے حاکم .... شمس المعالی قابوس بن دشمنگیر زبیری کی سرپرستی اُسے حاصل رہی۔ اس کے بعد سلطان محمود کے دربار میں رسائی نصیب ہو گئی۔ اور اس کے دربار میں تقرب حاصل کیا۔ سلطان محمود نے جو ہندوستان کے سفر کئے بیرونی سلطان کے ساتھ رہا اور ہندوستان کے چشم دید حالات بیان کئے۔ ہندوستانی زبان سنسکرت بھی سیکھی۔ ابیرونی کی ایک مشہور تصنیف ”الاتار الباقیہ عن قرون الحالیہ“ ہے۔ اس میں ایرانیوں (مع سندھیوں۔ خوارزمیوں و پارسیوں) یونانیوں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کی تقویم سنین اور حالات وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۷۹۰ھ میں تالیف

ہوئی۔ اور اسے قابوس کے نام سے معنون کیا گیا۔ بیرونی کی ایک اور مشہور کتاب ”تحقیق الہند“ ہے۔ یہ ہندوستان کے حالات، واقعات اور اخلاق پر ہے۔

ہیئت۔ نجوم اور ہنر سے پر اس کی دو بلند پایہ تصنیفات ہیں۔  
التفہیم الاوائل صناعة التنجیم یہ تالیف ۴۲۲ھ میں غزنہ کے مقام پر پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اسے حسین خوارزمی کی بیٹی ریحانہ کے نام سے معنون کیا گیا۔ اس کا ایک حصہ فارسی زبان میں ہے۔ (۲۵) دوسری کتاب ”قانون مسعودی“ ہے۔ یہ کتاب ۴۲۱ھ اور ۴۲۴ھ کے دوران تالیف ہوئی۔ اور سلطان مسعود غزنوی کے نام سے معنون ہوئی۔ اس نے ۴۲۳ھ میں وفات پائی۔

سوال۔ سلجوقی عہد حکومت میں جو عروج قصیدہ گوئی کو نصیب ہوا۔ کسی اور دور میں نہیں ہوا۔ اس بیان پر تاریخی اور تنقیدی بحث کیجئے۔

جواب۔ سلجوق عہد حکومت سے پہلے محمود غزنوی کے وقتوں میں قصیدہ گو شعرا نے اپنا کمال دکھایا تھا۔ لیکن ان شاعروں کی قصیدہ گوئی درحقیقت ابھی ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔ سلجوق عہد کے قصیدہ نگار شعرا جن میں انوری کو ممتاز ترین رتبہ حاصل ہے فارسی قصیدہ کی تاریخ میں ایک لاثانی مقام رکھتے ہیں۔ ایران میں آج تک سلجوق عہد کا سامانِ حول پیدا نہیں ہوا۔ جس میں قصیدہ گوئی کو ترقی حاصل ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخوں نے اس بزم کے چراغ کو گل کر دیا۔ نظامی گنجوی کے بعد شعرو شاعری میں فلسفہ بہت آگیا تھا لیکن تاریخوں



نے ایران کے امن و امان کے ساتھ فلسفیانہ خیالات کی رفتار کو بھی ایک عرصہ کے لئے ختم کر دیا۔ دور صفویہ آیا تو ایک بار پھر فلسفیانہ اور مذہبی شاعری کو ترقی نصیب ہوئی یہ زمانہ قصیدہ گوئی کے لئے سازگار نہ تھا اس لئے کہ صفوی بادشاہ شیعہ مذہب رکھتے تھے اور اپنے حق میں قصیدے نہیں سننا چاہتے تھے جب محتشم کاشانی شاہ صفویہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لایا تو اسے یہ جواب ملا کہ ”ہماری تعریف سے کیا فائدہ؟ جگر گوشہ رسول کی شان میں کچھ لکھو تو اس دنیا میں بھی بھلا ہو گا اور اگلے جہان میں بھی نیکی پاؤ گے۔ چنانچہ ایران میں تو قصیدہ گوئی کا قصہ پاک ہو گیا۔ مغلیہ خاندان کے درباری شاعروں میں اچھے اچھے قصیدہ گو شاعر ضرور ملیں گے لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کا فن سلجوق عہد کے قصیدہ نگاروں کے سامنے مات نظر آتا ہے۔ ویسے بھی اس عہد میں غزل کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ ایران جدید میں تو قصیدہ کو مذہب کی مانند شعر سے دور ہی رکھا جاتا ہے۔

”قدما کے کلام میں مترادف الفاظ اور مختلف اقسام کی لفظی صنعت گریاں اس کثرت سے ہیں کہ جی اکتا جاتا ہے اور چونکہ یہ اوصاف اکثر مشترک ہیں اس لئے جس کا کلام اٹھا کر دیکھو ایک ہی آواز آتی ہے غالباً سب سے پہلے اس طرز میں کسی قدر تبدیلی انور تھی نے کی اس نے الفاظ کے خاص ناپ تول کا کام کیا اور بہت سے سادہ اشعار لکھے جن میں لفظی خصوصیتوں کی رعایت نہ تھی۔ اس کے ساتھ مضمون آفرینی پر توجہ دی جس سے الفاظ کی بندش قدرے کم ہوئی

اور خیال دوسری طرف رجوع ہو سکا۔ ظہیر قاریابی نے وقتِ آخر بینی اور مضمون بندی کا آغاز کیا۔ متوسطین اور متأخرین کی دقیق خیال بندیاں اُسی کے نمونہ پر قائم ہوئیں۔

سلجوقیہ کے ادیبِ شباب کا زمانہ ملک شاہ اور سنجر کا زمانہ ہے اور یہی دور فارسی شاعری کا معراجِ شباب ہے۔ سلجوقی شعرا کی فہرست نہایت وسیع ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں:-

امیر معری۔ آرتقی۔ لامعی۔ فخر الدین سعد شہابی خراسانی۔  
عبد الواسع۔ چیلی۔ انور سی۔ حسن غزنوی۔ رضی الدین نیشاپوری۔  
ادیب صابر۔ علی باخرزی۔ فتوحی مروزی۔ ابو المعالی۔ مجمع الفصحا  
کے دیباچہ میں اور بھی بہت سے نام لکھے ہیں۔ اس دور کی چند خصوصیات لحاظ کے قابل ہیں۔

اس عہد تک شاعری نے اگرچہ بے انتہا ترقی کر لی تھی لیکن یہ ترقی صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے تھی۔ شاعری کی زبان اب تک ٹکسالی نہ تھی۔ شاعری کی بنیاد سامانی حکومت میں قائم ہوئی اور غزنویہ کے عہد میں ادبِ ترقی پر پہنچی۔ ان خاندانوں کے پائے تخت بخارا اور غزنی تھے۔ چنانچہ مادری زبان ترکی یا افغانی تھی۔ شعرِ حبس قدر تھے من حیث الاغلب سب کے سب انہیں مقامات کے رہنے والے تھے جو ایران کے اصلی مرکز یعنی شیراز، اصفہان اور نیشاپور سے دور تھے۔ فرخی سیستانی تھا۔ عنصر سی بلخ کا رہنے والا تھا۔ منوچہری دامغان سے تعلق رکھتا تھا۔ عسجدی اور دقیقی مرو کی سرزمین سے اٹھے تھے۔ سلجوقیہ نے نیشاپور کو پایۂ تخت قرار دیا۔ اس تعلق سے ان لوگوں میں شاعری

پھیلی جو ایران کی زبان کے اصلی مالک تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ اس عہد کے شعرا کی زبان زیادہ لطیف، شیریں اور محاورات و مصطلحات سے لبریز ہے۔

اسی عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی۔ سلطان محمود غزنوی اپنی ملکی اور قومی خصوصیات کا بہت دلدادہ تھا تاہم دفتری زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتری زبان فارسی کر دی جائے۔ چنانچہ دولت شاہ سمرقندی نے طبقہ اول کے شعرا کا جہاں ذکر شروع کیا ہے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان جس کے عنصر میں ترقی کا مادہ موجود تھا۔ سلطنت کی زبان بن کر کس قدر ترقی کر گئی ہوگی۔

سلطان سنجر کی قدردانی اور حاتمائیہ فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قائم کر دیا۔

سوال: سلجوق خاندان سے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے اور اس خاندان کے مشہور بادشاہوں پر مختصر نوٹ لکھئے۔

جواب: سلجوقی خاندان ترکمان قبیلوں میں سے ایک قبیلہ تھا جو گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی علاقوں کو فتح کرتا ہوا ایران میں داخل ہوا۔ غزنوی حکومت کی جڑیں اندرونی کشمکش کے باعث کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اس لئے سلجوقیوں نے محمود غزنوی کے

جانشینوں کو ہندوستان کی طرف دھکیل دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مغرب اور جنوب کی جانب بڑھے۔ اور دولتِ بویہ کے پرچے اُردائیے کیونکہ آلِ بویہ کے حکمران پہلے ہی زیاری خاندان کے بادشاہ قابوس بن زشمگیر اور محمود غزنوی کے ہاتھوں زک اٹھا چکے تھے۔ اب سلجوقیوں کے لئے ان کا صفایا کرنا مشکل نہ تھا۔

سلجوقیوں نے مزید پیش قدمی کر کے بغداد میں بھی کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے یہاں سلجوقیوں کا سردار طغرل بیگ مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ اور اقتدارِ بڑھانا شروع کر دیا۔ طغرل بیگ کے بعد الپ ارسلان اور اس کے بعد ملک شاہ تخت نشین ہوا۔ سلطان سنجر اس خاندان کا عظیم المرتبہ حکمران ہوا ہے۔

ان عظیم الشان تاجداروں کی سلطنت افغانستان سے لے کر مصر کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے دربار میں اہل قلم کی چاندی تھی۔ چنانچہ عہدِ سلجوقیہ فارسی ادب کی تخلیق اور ترقی کے لئے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے

الپ ارسلان : الپ ارسلان سلجوق بادشاہ طغرل کا بھتیجا اور اس کا جانشین تھا۔ کئی تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش ۱۰۴۹ء میں ہوئی۔ ابن الاثیر نے اس کی پیدائش ۳۳۷ھ میں اور صاحبِ راحتہ الصدور نے ۳۳۹ھ میں لکھی ہے۔

ابن الاثیر لکھتا ہے کہ اس کی وسیع سلطنت ماوراءالنہر کے دور دراز حصوں سے لے کر شام کے دور دراز حصوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس نے تقریباً بارہ سال سے زیادہ حکومت نہ کی

تاہم اس کا عہد نمایاں ترین واقعات سے منور ہے حکومت کے پہلے ہی سال میں اس نے ختلان، ہرات اور صغانیان کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے علاوہ یونانیوں کو ایشیائے کوچک کے اندر تک دھکیل دیا۔ ۱۶۵ء میں اس نے فارس اور کرمان میں ایک بغاوت فرو کی۔ فاطمی خلیفوں کی طاقت کو اس نے دبائے رکھا۔ اور حلب، مکہ اور مدینہ کو ان کے اقتدار سے نکال لیا۔ ۱۷۵ء میں اس نے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ رومیوں کی دو لاکھ سپاہ گویا ایشیائے کوچک میں شکست فاش دی۔ رومیوں کے جنرل ڈائیوجینس رمانس کو نہایت ذلت آمیز شرطوں پر صلح کرنی پڑی۔ حتیٰ کہ بقول البیرونی اس کی رعایا نے اس کا نام رومی بادشاہوں کی فہرست سے ہمیشہ کے لئے محو کر دیا۔ ۱۸۲ء میں الپ ارسلان ترکوں کے خلاف ایک مہم کے دوران دو لاکھ سپاہیوں کے ساتھ جیچون تک پہنچ گیا۔ ایک دشمن قیدی یوسف نرزمی نے موقع پا کر اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے سلجوق بادشاہ کو ہلاک کر ڈالا۔ الپ ارسلان کا نام اس لئے بھی مشہور ہے کہ اس نے نظام الملک جیسے قابل وزیر اور مشیر کی قدر کی۔ سلطان سنجر، سلطان سلجوق خاندان کا عظیم ترین بادشاہ تھا سنجر کا عہد سلجوق خاندان کا سنہری زمانہ ہے اس کی موت سے سلجوقیوں کے اقتدار کا جنازہ نکل گیا۔ سنجر ملک شاہ کا پوتا تھا۔ اس نے ۱۸۵ء سے ۱۹۵ء تک حکومت کی، اس کے اقتدار کا مرکز خراسان تھا۔ سنجر کی فتوحات اور اس کے شاہی وقار کی عظمت کا



اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ سنجری وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے شاہی محل کے دروازے پر دن میں پانچ وقت نوبت کے بجانے کی رسم شروع کی۔ سنجری کی زندگی کے آخری پندرہ سال ناکامیوں اور مایوسیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ (۱۲۰-۱۲۱ھ) میں اتسرخوارزمشاہ نے خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے بغاوت کر دی۔ (۱۲۱-۱۲۲ھ) میں سنجری نے ترکوں کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔ اس کی ملکہ قید ہو گئی۔ اور ایک لاکھ سلجوقی جوان میدان جنگ میں کھیت رہے۔ کچھ وقت کے لئے مردانیشاپور اور یہیق اس کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ (۱۲۵ھ) میں غور ترکوں نے طوس اور نیشاپور پر ہاتھ بول دیا۔ سنجری کو شکست ہوئی۔ اور وہ (۱۲۵ھ) تک ترکوں کی قید میں رہا۔ آخر اس کے کچھ وفادار ساتھیوں نے ترک پہرہ داروں کو رشوت دے کر اسے قید سے چھڑا لیا۔ لیکن اتنی بڑی سلطنت کا زوال اور اتنے عظیم اقتدار کا انحطاط دل شکستہ سلجوق بادشاہ کی موت کا سبب بن گیا۔

سنجری کا زمانہ فارسی اور عربی نظم و نثر کی وسعت اور ترقی کے لئے نہایت روشن زمانہ ہے۔ اس کے عہد حکومت میں ذیل کے صاحب کمال پیدا ہوئے :-

۱۔ خواجہ فرید الدین عطار (۱۲۰ھ)

۲۔ نظامی گنجوی (۱۲۴ھ)

ذیل کے شعرائے کرام نے وفات پائی :-

۱۔ حکیم عمر خیام (۱۲۱-۱۲۲ھ سنہ ۵۱۱ھ)

۲۔ آرزق (۱۲۳ھ)

۳۔ مسعود بن سعد (۱۱۳۱ھ)

۴۔ ادیب ضناہر (۱۱۴۳ھ)

۵۔ امیر معزی (۴۸ - ۱۱۴۷ سنہ ۶)

(۶) عمیق بخاری (۴۹ - ۱۱۴۸ھ)

ذیل کے شعرائے خوش کلام نے عروج پایا:-

سنائی۔ عروقی سمرقندی۔ انوری۔ رشید الدین وطواط۔

سوزنی نثری ذخیرہ خوارزم شاہی (۱۱۱۱ھ) ترجمہ کلیلہ و دمنہ۔

(۱۱۴۳ھ) مقامات حمیدی (۱۱۴۳ھ)۔ چہار مقالہ (۱۱۶۵ھ) کے سے

شاہکار وجود میں آئے۔

سنجہ علم و ادب کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ اس سلسلے میں وہ محمود

غزنوی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس نے امیر معزی کو اپنا ملک الشعرا مقرر کیا۔

معزی کے رتبے کا یہ عالم تھا کہ سنجہ نے حکم دیا تھا کہ اس کا لقب میرے

لقب پر رکھا جائے۔ سنجہ کا لقب معز الدینا والدین تھا۔ اسی بنا پر ملک الشعرا

کا تخلص معزی قرار پایا۔ بعد میں انوری کے سے یکتاے زمانہ کو ملک الشعرا

کا رتبہ دیا گیا۔ اور سلاجقیوں کا سب سے بڑا جدار سنجہ انوری سے ملنے

اس کے گھر جایا کرتا تھا۔

سوال: ”کلیلہ و دمنہ“ پر نوٹ سپرد قلم کیجئے۔

جواب: ”کلیلہ و دمنہ“ دنیا کی ان مقبول ترین اور خوش قسمت کتابوں

میں سے ہے جن کا ترجمہ دنیا کی غالباً ہر مہذب زبان میں ہو چکا ہے۔

شہرت۔ مقبولیت اور سمجھ گیر فواید عملی کے لحاظ سے دنیا کی بہت تھوڑی

کتابیں کلیلہ و دمنہ کے مقابلے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کے کسی راجہ نے اپنے شہزادوں کی تعلیم پر ایک نہایت دانا برہمن کو مامور کر رکھا تھا۔ اس نے بچوں کی سائنس، فنگ اور بہترین تعلیم کے لئے چھوٹی چھوٹی دیکھ بھال کا سسٹم زبان میں ایک مجموعہ لکھا ان مثالوں کی امداد سے شہزادے ہر مشکل سیاسی تدبیر کو آسانی سے سمجھ جاتے تھے یہی بیڈ پائی (BIDPAI OR PILPAI) کی کہانیاں کہتے ہیں۔ سیاست عملی کے موضوع پر آج تک اتنی کامیاب کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی۔ زئیروان عادل کے عہد میں یہ اکسیر حیات بزرگ چہر کی وساطت سے ایران پہنچی۔ وہاں شاہی حکم سے اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ ہوا۔ پھر سریانی زبان میں منتقل ہوئی۔ ابن المقفع (۱۵۰ھ) پہلوی اور عربی زبان کا ایک فاضل ادیب تھا۔ اس نے پہلوی ترجمے کو عربی زبان میں ڈھالا۔ اور یہی ترجمہ آج تک کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔ سنسکرت میں کلیلہ کی صورت کارٹکا اور دمنہ کی صورت دمنڈکا ہے۔ یہ دونوں الفاظ دو گیدڑوں کے نام ہیں جو کتاب میں ایک بہت اہم اور نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

ابن المقفع کے عربی ترجمہ کی ابتدائی شکل کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی میں ملتی ہے جو غزنوی کے ایک بادشاہ بہرام شاہ (۱۱۱۸ء تا ۱۱۴۲ء) کے نام سے منسوب ہے۔ فارسی مترجم کا نام نظام الملک نصر اللہ بن محمد بن عبد الحمید ہے۔ یہ خسرو ملک بن بہرام شاہ کے وزیر تھے اس ترجمے سے پہلے فارسی شاعری کے باوا آدم روڈکی نے بھی کلیلہ و دمنہ کا فارسی شبنوی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن یہ شبنوی نایاب ہے۔

سودھوس صدی عیسوی میں حسین واعظ کاشفی نے فارسی نثر میں انوار سہیلی کے نام سے کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ پیش کیا۔ انوار سہیلی میں تصنیع، حاشیہ آرائی اور قافیہ پیمائی کی بہت بھرمار ہے۔ اکبر اعظم کے عہد میں ابوالفضل علامی نے انوار سہیلی کو آسان تر اور سادہ تر شکل میں پیش کر کے اس کا نام عیار دانش رکھا۔ صاحب آثار الامرا کا قول ہے کہ ابوالفضل نے سادہ نگاری کا خوب حق ادا کیا ہے۔ صاحب ہفت اقلیم اور صاحب تاریخ و صافات نے کلیلہ و دمنہ کو فارسی نثر کی کتابوں میں یکتا اور بے مثل مانا ہے

سراوسلے نے انوار سہیلی کو ۸۵۷ھ میں چھاپا۔ ایسٹ وک نے ۸۵۲ھ میں اور واسٹن نے ۸۷۷ھ میں اس کا ترجمہ کیا کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی ۸۸۷ھ میں بمقام طہران چھپ چکی ہے ہندوستان میں بھی دو ایک فارسی ترجمے چھپ چکے ہیں۔ ترکی زبان میں ”ہمایوں نامہ“ کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ ہے۔

سوال: نظام الملک کے احوال و آثار پر روشنی ڈالئے۔

جواب: سلجوق بادشاہ قابلیت رکھنے والے لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ نظام الملک بھی ایسے ہی قابل آدمیوں میں نمایاں ترین شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ۱۰۷۷-۱۰۸۷ھ میں طوس کے مقام پر پیدا ہوا۔ غیر موافق حالات کے باوجود اس نے علوم رائجہ اور عربی زبان کی خاطر خواہ تعلیم حاصل کی۔ اور بلخ میں ایک معمولی سے کام پر مامور ہو گیا۔ بالآخر وہ الپ ارسلان کا مشیر اور وزیر بن گیا۔ الپ ارسلان کی تخت نشینی کے بعد وزارت عظمیٰ کا

عہدہ اُسے حاصل ہو گیا۔ اس کی لیاقت اور سیاسی تدبیر کا تمام تذکرہ نویسوں نے اعتراف کیا ہے۔ وہ ایک کٹر شنی تھا۔ شیعوں اور اسماعیلیوں کے خلاف اس کے دل میں گہری نفرت تھی۔ اہل ادب کے حق میں وہ نہایت فیاض تھا۔ حکیم عمر خیام کا سا صاحب کمال بھی اس کے فیض سے مستفید ہوا۔ رفاہ عامہ اشاعت مذہب اور تعلیم عوام کے سلسلے میں نظام الملک کی دلی کوششیں بے حد قابل تعریف ہیں۔ نظامیہ کالج بغداد جس کو حجت الاسلام ابو حامد محمد الغزالی کے سے شہرہ آفاق اہل کمال کو اپنے پروفیسروں کے زمرے میں رکھنے کا فخر اور شرف حاصل تھا اس کی بنیاد نظام الملک ہی نے رکھی تھی۔ نیشاپور اور بلخ وغیرہ کے مدارس نظامیہ میں بھی طالبان علم و فن کی تربیت کا کما حقہ انتظام کیا۔ نظام الملک کے بارہ بیٹے تھے اور تقریباً تمام کے تمام اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ گویا نظام الملک کا بلند پایہ خاندان اپنے کمال اور رفعت کی کامیابیوں کے اعتبار سے بابک خاندان سے ٹکر لیتا ہے۔ لیکن اس خاندان کی قسمت میں بھی وہی سازشیں اور حسدوں کی تباہ کاریاں لکھی تھیں۔ جو ان دونوں خاندانوں کی بربادی کا موجب بنیں۔ انجام الامر حسدوں کی کارستانیوں سلطان جلال الدین ملک شاہ سلجوق پر کام کر گئیں۔ ملک شاہ کی بیوی ترکان خاتون پہلے ہی نظام الملک کے خلاف تھی۔ اب وہ ابو الغنائم تاج الملک فارسی کی تربیت کرنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظام الملک کی جگہ تاج الملک کو مل گئی۔ اور وہ بد نصیب وزیر



جنس نے اقتدار عرصہ اپنی قابلیت سے سلجوق خاندان کی خدمت کی  
تھی ۹۲ء میں ایک تبدیلیی طرز کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔

نظام الملک ادبی مذاق سلیم رکھتا تھا۔ سیاست نامہ اس کی  
مشہور و مقبول تصنیف ہے۔

سوال: سیاست نامہ سے متعلق آپ کیا جانتے ہیں اس کی  
اہمیت واضح کیجئے۔

جواب: نظام الملک کے ادبی مذاق اور غیر معمولی ذہانت نے اسے  
مجبور کیا کہ وہ اپنے گوناگوں فرائض کی سرانجامی کے باوجود کسی ادبی  
خدمت کے لئے وقت نکالے۔ چنانچہ اس نے فن حکومت کے  
موضوع پر ”سیاست نامہ“ کے نام سے ایک قابل رشک کتاب لکھی  
اس کتاب میں حکمرانی کے جو اصول اور نظریات درج ہیں ان کی بنیاد  
قابل مصنف نے اپنی تاریخی معلومات اور وسیع تجربات پر رکھی ہے۔

”سیاست نامہ“ کے پچاس باب ہیں۔ ان ابواب میں ہر قسم کے  
شاہی فرائض اور حقوق امتیازی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے  
حکومت کے ہر ایک محکمے کے متعلق پُر از معلومات بحث کی گئی ہے۔  
اس کتاب کی تصنیف کے متعلق مشہور ہے کہ ملک شاہ نے اپنے

قابل مشیروں کو سیاست علمی و عملی کے متعلق ایک مستند ترین کتاب  
لکھنے کے لئے کہا تھا۔ اس فرمائش کی تعمیل میں نظام الملک نے یہ  
معرکتہ الارشاہ ہمارے ۹۲-۱۰۹۱ء میں اپنی ہلاکت سے کھوڑا ہی عرصہ  
پہلے پیش کیا تھا۔ پروفیسر براؤن سیاست نامہ کو فارسی نثر کی مفید  
ترین اور دلچسپ ترین کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس

میں بہت سادہ چسپ تاریخی مواد ہے۔ اور کہ ایک ایسے عظیم المرتبہ وزیر اعظم کے سیاسی خیالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں جس پر مشرق کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔

”سیاست نامہ“ کا انداز تحریر نہایت سادہ، صنائعِ یدائع سے پاک اور حقیقتِ حال کا پورا پورا ترجمان ہے، کتاب میر الملوک معروف بہ سیاست نامہ نشرے سلیم دارو و خواندگان را با کا ہی از رسوم چہ اندازی پیشینیاں بہرہ مندے گرداند،

بعض اوقات تو مصنف تصنع سے بچتا ہوا قدیم انداز بیان کی الجھن میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ سات باب ملحدوں کا ذکر کرنے کو وقف کئے گئے ہیں۔ خاص کر فرقہ باطنی اور اسماعیلیہ کو بہت کرسا گیا ہے۔ یہ باب نہایت دلچسپ ہیں۔ نظام الملک کی رائے میں چھوٹے چھوٹے فرقوں اور طبقوں کا وجود سلطنت کی طاقت اور اقتدار کو ٹھٹھاتا ہے۔ مصنف شیعوں کے خلاف نہایت پرجوش استدلال سے کام لیتا ہے اور ان میں سے بعض پر پیغمبرِ ناکبونسٹ مزدک کے عقاید و نظریات کی پیروی کا الزام دھرتا ہے (مزدک ساسانی بادشاہ قباد کے وقت میں ایک بڑا فصیح و بلیغ شخص گذرا ہے۔ اس نے ایک نیا مذہب نکالا تھا۔)

سوال: ”فرقہ اسماعیلیہ پر مختصر نوٹ لکھو۔“

جواب: یہ فرقہ شیعہ مذہب کی ایک شاخ ہے۔ سب سے بڑا فرق صرف یہ ہے کہ شیعہ لوگ بارہ امام مانتے ہیں۔ جب کہ

اسماعیلی صرف سات۔ ساتویں امام کا نام اسماعیل تھا۔ سب سے آخری یعنی بارھویں امام مہدی جو اب تک چھپے ہوئے ہیں ایک نہ ایک دن آنے والی دنیا کا مصلح اعظم بن کر نمودار ہونگے اسماعیلی دو قسم کے امام مانتے ہیں۔ ایک تو ہیں وہ جو جناب رسول خدا کی نسل سے ہیں۔ اور دوسرے ہیں ساسانی بادشاہوں کی نسل سے۔ اسماعیلیوں کے نظام صوفیہ میں مسئلہ صدور (EMANATION) اور ختم (INCARNATION) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نظام عقاید میں سات کا عدد بہت اہم ہے۔ اسی لئے انہیں سبتی بھی کہا جاتا ہے۔

امام مہدی ۷۲۰-۷۴۳ء میں غائب ہوئے اور اسی اثنا میں اسماعیلیوں کا پرچار شروع ہونے لگا۔ اس فرقہ کے اصولوں کو سب سے پہلے تنظیم دینے والا عبداللہ بن میمون القدر تھا۔ گوئز لکھتا ہے کہ اگرچہ فرقہ اسماعیلیہ شیعہ مذہب کی ایک شاخ تھی تاہم عبداللہ کے بعد دونوں میں اس قدر وسیع خلیج حائل ہو گئی کہ بالآخر شیعہ لوگ اسماعیلیوں کو ملحد (HERETIC) کہنے لگے۔ اسماعیلیہ۔ سبتی اور ملاحدہ کے علاوہ اس فرقہ کے اور بھی کئی نام ہیں۔ باطنی (ESOTERIC) (THE) فاطمی (THE FATIMID) جنہوں نے ۷۲۰-۷۴۳ء میں شمالی افریقہ اور مصر میں اپنی خلافت قائم کی جو اہل ائمہ میں غازی صلاح الدین کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ تعابنی (THE DOCTRINAIRE) اور قرامطی (THE

CARMATHIANS) حسن بن صباح کی تبلیغ کے بعد اس فرقہ کا نام حشیشی (THE HEMPEATERS) بھی پڑ گیا۔

فرقہ فاطمی نے مصر اور شام میں بہت مظالم توڑے لیکن گورنر اور ناصر خسرو بحیثیت مجموعی ان کی سلطنت کو سراہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جنوری ۹۳۵ء میں فرقہ قرامطہ کے سردار ابوطاہر نے تیس ہزار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور مکہ شریف کو حجر الاسود (THE BLACK STONE) اور کئی دوسری مقدس یادگاروں سے محروم کر دیا۔

اسماعیلیوں کے عقیدے کے مطابق خداوند تعالیٰ کی ذات اور انسان کے درمیان عدد درخمسہ (THE FIVE) (PRINCIPLES OF EMANATION) حامل ہیں۔ وہ یہ ہیں :-

عقل کل (THE UNIVERSAL REASON)

روح کل (THE UNIVERSAL SOUL)

ہمیولی (PRIMAL MATTER)

مکان (PLEROMA OR SPACE)

اور زمان (KENOMA OR TIME)

گویا عدد درخمسہ، خدا اور انسان مل کر وجود کے سات درجے ہوئے۔

سوال: ”تحریک اسماعیلیہ درحقیقت ایک سیاسی تحریک تھی

ناکہ مذہبی، اس قول کی وضاحت سمجھئے۔

## تحریک اسماعیلیہ

جواب: بظاہر تو اسماعیلیوں کی تحریک مذہبی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں سیاسیات مکمل طور پر مذہب کو پس پشت ڈال رہی ہے۔ ویسے بھی تو اسلام کے مذہب اور سیاست میں کوئی ایسی نمایاں حد فاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام کی اشاعت محض مشرکوں یعنی داعیان اسلام یا مبلغین کے پرچار سے نہیں ہوتی بلکہ غازیان قوم یا توہمیں تلوار لے کر اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار جمانے کے لئے بھی خون بہانے میں دریغ نہیں رکھتے۔

عبداللہ بن میمون القدرح ہی کو لیجئے۔ اس نے اپنے آپ کو ہمدی ظاہر کر کے ابو محمد عبید اللہ نام رکھ لیا اور شمالی افریقہ سے ان لوگوں کی مدد سے جو اسماعیلی عقائد پر ایمان رکھتے تھے۔ خاندان اغلب کا صفایا کر دیا اور ہمدیہ کا شہر بسا کر فاطمی سلطنت قائم کر لی۔ ۹۶۹ء میں خاندان اشعبد سے مصر چھین لیا اور سویں صدی عیسوی کے آخر میں شام کے ایک بہت بڑے حصے کو حلقہ اقتدار میں لایا گیا۔ اسماعیلیوں کے چودہ خلیفہ ۱۰۷۱ء تک اس وسیع سلطنت پر حکم رہے۔

۸۹۷ء کے لگ بھگ فرقہ قرامطہ نے ہتھیار سنبھالے



میسرہ پوٹا میں خرمستان بحرین - یمن اور شام میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے داعیوں کو روئے اور الجنبانی کی زیر سرکردگی بہت سے علاقوں پر تسلط جما لیا۔ ۹۲۴ء میں بصرہ کے سامنے خلیفہ وقت کے لشکر کو خمس خمس کر دیا گیا۔ ایک سال بعد صاحب النافذہ اور صاحب الحال نے شام کو دمشق کے دروازوں تک دبا لیا۔ ۹۲۴ء میں ابو طاہر الجنبانی نے بصرہ اور کوفہ کو غارت دیا مال کیا ۹۲۳ء میں مکہ شریف پر آفت نازل کی۔

ان تمام فتوحات اور لشکر آرائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ اسماعیلیہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ ان کے عقائد کی اشاعت ہی سیاسی اقتدار کا تقاضا کرتی تھی۔ حسن بن صباح نے بھی اپنی سیاسی زندگی کا آغاز قلعہ الموت اور دوسرے اہم فوجی ٹھکانوں پر قبضہ جمالینے سے کیا۔ اس کی تحریک کی خصوصیت تھی ”مظالم آرائی“ اور قشد و بیانی“ یہی وجہ تھی کہ ایک مدت مدید تک اس کا نام لوگوں کے دل دہلاتا رہا۔ حسن بن صباح نے اپنے لشکریوں میں ایک غیر معمولی جوش اور ہمت سے بے اعتنائی پیدا کرنے کے لئے انہیں حشیش (بھنگ) کا چسکا لگا دیا تھا۔ اسی لئے یہ لوگ حشیشی کہلاتے ہیں۔ ان امور واقعہ سے صاف روشن ہے کہ حسن بن صباح کا مقصد سیاسی تھا نہ کہ مذہبی۔

سوال: ”سفر نامہ“ اور اس کے مصنف ناصر خسرو پر مفصل نوٹ لکھئے۔

## حکیم ناصر خسرو علوی

جواب: ابو معین ناصر بن خسرو ایران کا ایک عظیم المرتبت مفکر اور اخلاقی شاعر گذرا ہے۔ وہ سکتہ میں قبادیان (علاقہ بلخ) میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا پیشہ زمینداری تھا۔ لیکن اس نے اوائل عمر میں علوم متداولہ کا اچھا خاصہ مطالعہ کیا اور تحصیل علوم سے فارغ ہو گیا۔ ناصر خسرو کی عمر کے پہلے چالیس سال کی تاریخ بالکل تاریک اور مبہم ہے۔ تاہم اس کے دیوان اور ۷۶ دیں قصیدے میں کئی گئے اشاروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شیعہ مذہب پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اور اپنے عقاید پر بہت ثابت قدم تھا۔ علم طبعیات کی تمام شاخوں میں اسے کافی دسترس حاصل تھی۔ طب، ریاضی، نجوم، فلسفہ اور قرآن میں ایک خاص ملکہ پایا تھا۔ عربی، ترکی اور یونانی کے علاوہ اس نے غالباً عبرانی زبان میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ابتدائے عمر میں وہ شراب پینے کا عادی بھی رہا لیکن سرکاری ملازمت کرنے کے وقت بھی وہ اس عادت میں گرفتار تھا۔ ان دنوں خراسان میں سلجوقیوں کی عملداری کا آغاز تھا اور مرو خراسان کا پایہ سلطنت تھا۔ ۵۳۰ھ میں اس کی زندگی میں اچانک ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ خواب میں فرشتہ رحمت کی ملامت سے متاثر ہو کر اس نے لکھا ہوں سے توبہ کی اور حج کو روانہ ہوا۔ اس کی تصویر "سفرنامہ" میں پیش کی ہے۔ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد ناصر خسرو مصر پہنچا۔

وہاں اس زمانہ میں المستنصر باللہ خلیفہ فاطمی حکمران تھا جو فرقہ اسماعیلیہ کا پیشوا تھا۔ ناصر کو اس کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ اور اس کی تعلیم و تبلیغ سے متاثر ہو کر ناصر نے اسماعیلی مذہب اختیار کیا۔ خلیفہ نے اسے حجت خراسان کا لقب عطا کر کے اس فرض پر مامور کیا کہ خراسان میں جا کر اسماعیلی عقائد کی تلقین و تبلیغ کرو۔ ناصر خسرو کو سفر میں کوئی سات یار نہ لگا اور اس دوران میں اس نے چار مرتبہ حج کیا۔ آخر عراق اور یمن سے ہوتا ہوا ۴۴۴ھ میں اپنے وطن کو واپس آیا۔

بلخ میں مقیم ہو کر ناصر نے اسماعیلی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ لیکن لوگوں کی شدید مخالفت اور سخت گیری کی وجہ سے اس کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ پہلے وہ مازندران گیا۔ وہاں بھی امن نصیب نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ زاد المسافرین کی تاریخ تصنیف یعنی ۴۵۲ھ (۱۰۶۱ء) سے پہلے کا ہے۔ ۴۵۴ھ میں وہ یمگان (علاقہ بدخشان) میں پہنچا اور وہاں مقیم ہو گیا۔ یمگان میں اس نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال درویشی کی حالت میں بسر کئے۔ یہاں اس نے بہت سے لوگ مرید کر لئے جن کی اولاد اب بھی ایران میں خال خال نظر آتی ہے اسی فرقے کا نام ہے۔ ناصریہ۔ ناصر خسرو نے اپنی تمام کتابیں یمگان میں ہی لکھیں۔ پچاسی سال کی عمر پا کر وہ ششماو میں فوت ہوا۔

## ناصر خسرو کی تصنیفات

سفرنامہ، زاد المسافرین، وجہ دین، سعادت نامہ، روشنائی نامہ،

دیوان قصائد، خوان اخوان، الکسیر اعظم، کنز الحقائق۔ قانون اعظم، دستور اعظم، المستوفی، تفسیر قرآن، رسالہ طلسم وغیرہ وغیرہ۔

## سفر نامہ

اس کتاب میں ناصر نے ہفت سالہ سیاحت (۱۲۵۰ھ تا ۱۲۵۲ھ) کا کل حال لکھا ہے۔ فارسی نثر کا یہ ایک نہایت دلچسپ نمونہ ہے اس کا فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ناصر کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ واقعات و حقائق کی ہو بہو تصویر پیش کرنے میں کمال کا اظہار کیا ہے۔ ناصر نے اس میں مذہبی معلومات کو نہیں بھولا۔ اس وقت کے مقامی واقعات اور حالات کے متعلق مسائل ہم پہنچانے کے اعتبار سے اس کتاب کو امتیازی وقعت حاصل ہے۔

## صوفی شعرا

سوال: سلطان ابوسعید ابوالخیر کی شاعری پر تنقید و تبصرہ پیش کیجئے۔

جواب: ابوسعید ابوالخیر (۶۹۸ھ تا ۷۴۹ھ) فارسی زبان کے ان شاعروں کے پیشرو امام ہیں جن کے کلام میں تصوف اور معرفت کے گیت گائے گئے ہیں۔ مشرقی تنقید نگار مولانا روم کی پیروی میں حکیم سنائی کو پہلا اور خواجہ فرید الدین عطار کو دوسرا عظیم صوفی شاعر بیان کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ایتھے کی تحقیق کے

مطابق ابوسعید بیدل عظیم صوفی شاعر ہے جس نے فارسی شاعری کو  
 قصوت سے روشناس کرایا۔ رباعی کو قصوت، معرفت، عشق حقیقی  
 مذہب اور فلسفہ کی تکلیفوں سے مبرا کر لیا اور ادبی تھا۔ صوفیانہ شاعری  
 کو اسی نے لطیف ترین حسن رنگ و بو کی جاشنی دی۔ آیتھے کے  
 علاوہ ”اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابوسعید“ ”رسالہ خورائیم“  
 ”ہفت اقلیم“ ”تاریخ گزیدہ“ اور ”نفحات الانس“ وغیرہ کے قابل  
 مہنفوں نے بھی ابوسعید کے حالات اور اس کی شاعری پر کافی  
 روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس کی زندگی ایسے خاص واقعات سے  
 معمور نہیں کیونکہ وہ عالم آفاق کا نہیں بلکہ عالم ارواح کا رہنے  
 والا تھا۔

ابوسعید کا فلسفہ نہایت وسیع ہے۔ وہ ہر حسین وجود میں  
 محبوب حقیقی کی جھلک دیکھتا ہے۔ حقیقت اس کے لئے  
 حسین ترین اور ازلی ہے۔ وہ دنیا میں رہتا ہوا بھی دنیا سے  
 بالاتر ہے۔ عقاید مذہبی اور احکام شریعت کی اسے پروا نہیں۔  
 اس کی فراخ دلی اور وسیع النظری قرب الہی حاصل کرنے کے  
 لئے لا محدود راستے پیش کرتی ہے۔ بقول حافظ: صغ  
 ”ہر قبلہ کہ باشد بہتر ز خود پرستی“

وہ خالق و مخلوق کے بھید بیان کرنے کے لئے دل کھول  
 کر استعارات اور مجاز و کنایات کا سہارا لیتا ہے۔ بقول غالبؒ  
 ہر چند ہم مشاہدہ حق کی گفتگو بستی نہیں ہے بارہ و ساغر کے بغیر  
 آیتھے نے ابوسعید کی رباعیوں کو جمع کر کے ان کا ترجمہ کر دیا



ہے۔ اور یہ ترجمہ ۷۸-۷۵ء میں چھپ چکا ہے۔

ابوسعید کے متعلق مولانا شبلی کا ارشاد ملاحظہ ہو:-

سب سے پہلے صوفیانہ خیالات حضرت ابوسعید الزہری نے  
ادا کئے۔ وہ شیخ بوعلی سینا کے معاصر تھے۔ ان کی شیخ سے اکثر  
مراسلت رہتی تھی۔ شیخ مشکل مسائل ان سے دریافت کرتے  
تھے اور وہ جواب دیتے تھے۔ یہ مراسلات آج بھی موجود ہیں۔  
وہ ابتدائی حال میں چودہ برس تک مجذوب رہے۔ سلوک میں  
آئے تب بھی جذب کا اثر باقی تھا۔ ۷۴۴ھ میں وفات پائی۔  
کلام کا نمونہ یہ ہے :-

راہ تو بہر قدم کہ پویند خوش است	وصل تو بہر سبب کہ جویند خوش است
رستے تو بہر دیدہ کہ بیتند نگوشت	نام تو بہر زبان کہ گویند خوش است

غازی برہ شہادت اند رنگ و پوست	غافل کہ شہید عشق فاضل تر از پوست
در روز قیامت این بیدار کے ماند	کایک گشتہ دشمن است و آن گشتہ دوست

دل جز رہ عشق تو نمیوید ہرگز	جز محنت و درد تو نجوید ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستان کرد	تاہر کسے دگر نہ روید ہرگز

در کوئے خود منزل و ماوی دادی	در بزم وصال خود مرا جا دادی
القصہ بصد کرشمہ و ناز مرا	عاشق کردی و سر بصر ادا دادی

لے روئے تو مہر عالم آرائے ہمہ وصل تو شب و روز تنائے ہمہ  
گر باد گران بہ زمینی در آئے بمن در با ہمہ کس ہم چو منی وائے ہمہ

سوال: خواجہ عبداللہ انصاری پر مختصر نوٹ لکھئے۔

جواب: سلطان ابو سعید ابوالخیر کے بعد خواجہ انصاری کو صفویانہ شاعری کے لئے امتیاز حاصل ہے۔ آپ ناصر خسرو کے ہم عصر اور ہرات کے رہنے والے تھے۔ آپ کی تخلیقات نظم و نثر پر مشتمل ہیں جن میں تصوف، اخلاق، دینیات اور فلسفہ کی نمایاں جھلک ہے۔ خواجہ انصاری کی رباعیاں بہت مقبول ہیں۔ نثر میں آپ کا بہترین رسالہ مناجات ہے۔ جس میں دعاؤں کے علاوہ صوفیا کے لئے پسند و موغظت کے چشمے بہائے گئے ہیں۔ مناجات کی تقریباً تمام نثر مسجع ہے اور اس قسم کی نثر کا قدیم ترین نمونہ ہے:-  
۱۔ اگر بر آب روی خستے باشی، واگر بہوا پری گلستے باشی،  
دل بدست آرتا کستے باشی۔

۲۔ آہستہ باید بود لیکن دانستہ باید بود۔ دانستہ باید بود۔ دانستہ بخرابات شدن رواست و نادانستہ بمناجات رفتن خطاست۔

۳۔ بترس از کسے کہ نترسد و آنچہ کند از کس نپرسد۔

۴۔ دوست را از در پیروں تو اوں کرد۔ آما از دل نتواں کرد۔

۵۔ دی رقت و باز نیاید۔ فردا اعتماد را نشاید۔ ایں دم عزیز دار کہ نیاید۔

خواجہ کی رباعیات کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

پیوستہ دلم دم از رضاے تو زند جان در تن من نفس برائے تو زند  
گر بر سر خاک من گیا ہے روید از ہر گے بوئے دقائے تو زند  
سوال: حکیم سنائی کی زندگی اور شاعری پر تبصرہ قلم بند  
کیجئے۔

حکیم مجدد الدین عارف سنائی شرفائے غزنی کے خاندان سے  
تھے۔ علوم میں آپ کو مہارتِ کلی حاصل تھی۔ یہ صاحبِ کمال  
شعر میں بیگانہ عصر تھا۔ اور دولت و جاہ سے فارغ البالی میں  
بسر کرتا تھا۔ سلسلہ فقر میں اس طرح داخل ہوا کہ سلطان ابراہیم  
شاہ غزنوی نے ایک دفعہ سردیوں کے موسم میں ہندوستان کی  
طرف فوج کشی کی تیاری کی۔ سنائی نے اس کی مدح میں ایک  
قصیدہ لکھا۔ چاہتا تھا کہ دربارِ برخواست ہونے سے پہلے بادشاہ  
کی خدمت میں پہنچ جائے۔ ایک شراب خانے کے پاس سے گزرا  
تھنا کہ ایک شرابی نشے کے سرور میں ساقی سے کہتا ہے۔ کہ  
”ایک جام سلطان ابراہیم کی اندھی آنکھوں کی یاد میں“ ساقی  
نے کہا ”ایسے عادل بادشاہ کی شان میں کیا گستاخی کرتا ہے“  
جواب دیا ”ابھی غزنی کے انتظام سے عہدہ میرا نہیں ہوا  
اور سردیوں میں دوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے۔ اس سے بڑھ  
کر کیا حماقت ہوگی؟ پھر کہنے لگا ”ایک اور جام حکیم سنائی  
کے اندھے پن کے صدفہ میں“ پھر ساقی نے کو سا ”ایسے شاعر  
لطیف و خوش کلام کی ہرالی کیوں کرتا ہے“ مستان نے کہا: شاعر  
کیا ہے۔ ایک احمق ہے۔ جھوٹے سچے و اہمیات جوڑ کر ایک احمق

کے آگے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے اور پُرمنا ہے، حکیم سنائی پر ایک ایسی حالت طاری ہو گئی کہ گوشہ نشین ہوتے ہی بن آئی۔ اسی کے بعد یہ مرد پاکیزہ ایسا خدا شناس ہو گیا کہ آج تک بڑے بڑے مولوی موجد اس کے معتقد ہیں۔ امام غزالی ان کے مرید ہیں۔ مولانا روم اپنی اتنی عظیم النظیر عظمت کے باوجود فرماتے ہیں:-  
 عطار فرج بود و سنائی دو چشم او      مالِ پے سنائی و عطار آمدیم  
 مولانا جامی فرماتے ہیں کہ حکیم سنائی کا بہترین شاہکار یعنی حدیقہ الحقیقۃ ان کی موت (۷۳۱ھ) سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے وجود میں آیا۔ سنائی کی کلیات میں سات مثنویاں اور ایک دیوان شامل ہیں۔ دیوان میں قصیدے، ترجیع بند، ترکیب بند، غزلیات اور رباعیاں ہیں۔ حدیقہ الحقیقت اس کی بہترین اور مقبول ترین مثنوی ہے۔ یہ کہتا بیجا نہ ہو گا کہ اخلاق اور حکمت علمی سے بھری ہوئی ایسی مثنوی نے خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر اور مثنوی مولانا روم کے لئے میدان صاف کر دیا۔

حدیقہ الحقیقت میں وحدت ایزدی، عقل، معرفت، فلسفہ ناپائنداری حیات، عشق حقیقی اور تصوف وغیرہ کے متعلق بہت سے مسائل کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے۔  
 جناب شبلی نعمانی نے حکیم سنائی کے کلام کی جو خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۰۔ تشبیب اور قصائد میں انہوں نے اپنے تمام معاصرین کی

طرح کوئی جدت پیدا نہیں کی لیکن پختگی۔ برہستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے اور قدما میں بھی قرحی کے سوا اس خصوصیت میں کوئی ان کا ہمنسرت نہیں۔

۲۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاعری کو تصوف کے حقیقی مسائل و معارف سے روشناس کیا۔ اس سے پہلے حضرت ابوسعید الانجری کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں صرف جوشِ عشق کو پُر زور طریقہ سے ادا کیا ہے۔ تصوف کے مسائل، اسرار و معارف نہیں۔ بخلاف اس کے سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصانیف ہیں۔

۳۔ قدما کی شاعری اگرچہ نچرل شاعری تھی لیکن طرزِ ادب و اشعار نہ تھا۔ جس بات کو کہنا چاہتے تھے صاف۔ بے تکلف۔ سیدھے سادے طور پر کہہ دیتے تھے۔ معمولی بات کو انوکھی طرز میں ادا کرنا یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہے۔ لیکن اس جوہر کے موجد حکیم سنائی ہیں۔

۴۔ اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی۔

۵۔ جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے۔ ایشیا کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے فارسی شعرا میں یہ نشہ مولانا روم پر جمایا ہوا ہے۔ خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بہ مست ہو جاتے ہیں۔ لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں۔

۶۔ شاعری کے اجزا میں ایک بڑا ضروری جز تشبیہ اور تمثیل ہے سعدی۔ صائب۔ کلیم وغیرہ تمثیل میں کمال رکھتے تھے۔ شاعری



کی اس صنف کے مجدد بھی حکیم سنائی ہی ہیں۔ آپ کی تمثیلیں نادر اور موثر ہوتی ہیں۔

تقریباً تمام کے تمام مغربی تنقید نگار حدیقہ الحقیقت کو اتنا پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ سنائی کی غزلیات کی لطافت رنگینی۔ جدت اور جوش بیان کے پیش نظر حدیقہ الحقیقت سنائی کی تصنیف ہی معام نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے شبکی نعمانی فرماتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ حکیم سنائی کے قصائد اور مثنویاں تصوف سے لبریز ہیں۔ لیکن غزل میں تصوف کا نشہ نہیں۔ اور ہے تو کمزور ہے۔

حدیقہ الحقیقت ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ کے مقام پر چھپ چکی ہے میجر سٹیفنس نے اس مثنوی کے کچھ حصے کا نسخہ کے بعد ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجمہ ۱۹۱۸ء میں بمقام کلکتہ چھپ چکا ہے۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنائی کے دیوان میں شاعر کی تعداد تیس ہزار گنے لگ بھگ تھی لیکن دیوان سنائی کے دستیاب نسخوں میں قریباً بارہ ہزار شعر موجود ہیں۔ یہ قصائد غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ روانی۔ لطافت اور بچھگی ان کی خصوصیات ہیں۔ سنائی کے کلام میں فن کی بجائے موضوع پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔

سنائی کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس پر ایران کے عظیم المرتبہ شعرا متوجہ رہی۔ فرخی اور مسعود سعد کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن جب سنائی تصوف اور معرفت پر مائل ہو گئے تو سر اسر طبع زاد

شعر کہنے لگے۔ اور ان کی عظمت کا مدار صوفیانہ کلام پر ہے جس میں وہ تزکیہ نفس، ترک تکبر اور ترک ظاہر و وضع داری کی تلقین کرتے ہیں۔

## سنائی کی تعلیمات یا تصوف

جو علم خود شناسی کی طرف نہ لے جائے وہ سراسر جہل ہے۔ جاہ و ثروت کا غلام نہ بننا چاہئے۔ سخاوت اور بخشش انسانیت کا جوہر ہے تصفیہ باطن۔ خدمتِ خلق۔ ایثار اور ریاضت و عبادت سے ہی آدمیت حاصل ہوتی ہے۔ وضع داری اور مال و زر کی نمائشی حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔

ہوس و شہوت اور حرص و آرزو پر قابو پانا چاہئے۔ اعتقاد غیب ضروری ہے۔ انصاف پسندی۔ انسان دوستی اور راستی آدمیت کے جوہر ہیں۔ دیدارِ ذات کے لئے دل کی صفائی ضروری ہے۔ من و تو کی تمیز راہِ راست سے بھٹکاتی ہے۔ کسی جاندار کا دل دکھانا گناہِ کبیرہ ہے۔ کسی کی حق تلفی شیطنیت میں داخل ہے۔ ریاکاری اور کفرِ فریب سے پرہیز لازم ہے۔ ایمان و عرفان سب سے بڑی دولت ہے۔ کسبِ دانش و حکمت انسان کا فرض ہے۔ یادہ گوئی سے اجتناب کرنا چاہئے عقل انسان کا سب سے بڑا رہنما ہے۔ دوسروں کے غم میں شریک ہونا اور مصائب میں آڑے آنا انسانیت کی دلیل ہے۔ شراب ایک لعنت ہے۔

تصنیفات: ثنویاں :- حدیقتہ الحقیقت - طریق التحقیق  
سیر العباد والی المعاد یا کنز الرموز وغیرہ - کارنامہ عشق نامہ -

غریب نامہ - عفو نامہ -

دیوان : قصائد - غزلیات - رباعیات -

سنائی نے ۴۵۰ھ میں وفات پائی۔

سوال - باباطاہر ہمدانی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ قلم بند کیجئے۔

جواب : باباطاہر کی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں بعض صوفیہ کی کتابوں میں سے ان کے متعلق کچھ پتہ چلتا ہے وہ ہمدان کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ گمنامی اور گوشہ نشینی میں گزارا۔ وہ ایک صوفی درویش تھے۔ ریاضت اور عبادت میں محو رہتے۔ بڑے پرہیزگار اور غنی تھے۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں ان کو کافی شہرت حاصل تھی جیسا کہ سنجدی بادشاہ طغرل کے ساتھ ۴۴۰ھ میں ان کی ملاقات سے ظاہر ہے شیخ ظاہر ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں سوز و گداز نمایاں ہے۔ ان کے اشعار سے ان کا درد دل پکٹا ہے وہ عربی کے بھی عالم تھے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے کچھ نثر کی کتابیں (رسالے) عربی اور فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ وہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے اور زندگی کے آخری دن ہمدان میں گزار کر وہیں انتقال کیا۔

شیخ صاحب کی شہرت کا انحصار زیادہ تر ان کی دو بیتوں پر ہے۔ ان میں انہوں نے مختلف مضامین بیان کئے ہیں۔ کہیں اپنی

پریشان حالی۔ تنہائی اور بے نوائی کا ذکر کیا ہے اور کہیں وحدت،  
ذاتِ یحییٰ وصال اور طلبِ دیدار معنوی کا بیان ہے۔

ان کے موضوع اس طرح کے ہیں :-

ہر جگہ خدا کا جلوہ نمایاں ہے

کنشت و کعبہ و بت خانہ و دیر سرے خالی از دلیر ند و نند  
(نداشتند)

ناپائنداری عالم ہے

یکے پر دیگرے نالوں دریندشت بچشمِ خوں فشاں آں لالہ کے کشت  
ہے کشت و ہے گفت لے دریا کہ باید کشتن و ہشتن دریں دشت

وحدت عاشق و معشوق ہے

نہ رسم آناں کہ زتن چون ند و نند ز جانان جوں جانوں تد و نند  
نیکیوں کی مطلوبیت ہے

جرہ بازے بدم رفتم بہ نجیر سیہ دستے زدہ بر بالِ موتیر  
محبت ہے

دلی دیرم خسیدارِ محبت کز و گرمست بازارِ محبت

لبا سے با فتم بر قامتِ دل ز پودِ محنت و تارِ محبت

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ بابا طاہر کی زبان قدیم فارسی  
اور پہلوی سے ملتی جلتی ہے جیسا کہ وہا کی جگہ موہ جان کی جگہ چون  
ندانند کی جگہ ند و نند۔ شب کی جگہ شو۔ بینم کی جگہ و بینم۔ گیم کی جگہ  
و تم۔ کند کی جگہ کرن وغیرہ۔

سوال: شیخ فرید الدین محمد عطار کی زندگی اور اس کے

کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالئے۔

جواب: شیخ فرید الدین عطار سلجوقی دور کے ایک بلند پایہ صوفی شاعر ہیں۔ آپ کا تخلص عطار اس لئے تھا کہ آپ اوائل زندگی میں طبیب اور دوا فروش تھے۔ آپ کی ولادت چھٹی صدی ہجری کے وسط میں ہوئی۔ آپ نے بڑی لمبی عمر پائی۔ بعض محققین کی رائے کے مطابق آپ کی عمر سو سال سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن آپ کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کم از کم ستر سال تھی۔ آپ کی بیشتر زندگی عارفوں کے حالات جاننے اور ان کے اسرارِ معرفت معلوم کرنے اور خود آتشِ عشقِ حقیقی میں جلنے میں گزری۔ آپ آسمانِ عرفان پر ایک درخشندہ ستارہ بن کر چکے اور صوفی شعرا میں بلند مرتبہ حاصل کیا۔ بڑے بڑے صوفی شاعر آپ کو عارفِ شاعروں کا امام مانتے ہیں۔ مثلاً مولانا روم جو عالمِ عرفان کے تاجدار ہیں یوں فرماتے ہیں:

عطار روح بود ستائی و چشم او ماباز پئے سنائی و عطار آمدیم  
پھر کہتے ہیں:

من آں ملائے رومی ام کہ از نظم شکر ریزد  
ولیکن در سخن گفتن، غلامِ شیخِ عطارم  
اسی طرح محمود شبستری اور علاء الدولہ سمنانی جو خود صوفی بزرگ تھے عطار کے مداح تھے۔ عطار نہ صرف عارفِ کامل تھے بلکہ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کتابِ جیالِ الس المومنین میں لکھا ہے کہ عطار کی تصانیف کی تعداد قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد کے



برابر ہے۔ ان کا بیشتر کلام ناپید ہو چکا ہے۔ حسب ذیل مثنویاں ان کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں:-

مصیبت نامہ - الہی نامہ - خسرو نامہ - پند نامہ - اسرار نامہ - شرح القلب - مخازر نامہ - جواہر نامہ - وصیت نامہ - منطق الطیر - بلبل نامہ - حیدر نامہ - شتر نامہ - شاہنامہ - ان کے علاوہ ان کی غزلیات کا اور قصائد کا دیوان سے جس میں دس ہزار کے لگ بھگ اشعار ہیں۔

عطار کی شہرت کا مدار ان کی مثنوی منطق الطیر - دیوان اور تذکرۃ الاولیاء پر ہے۔

آپ کے کلام میں بے حد روانی اور سلاست ہے۔ اور آپ کی شاعری کا سب سے بڑا وصف حسن تاثیر ہے یہاں تک کہ اہل فن نے آپ کے شعروں کو ”تازیانہ سلوک“ کہا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرہ میں آپ کے کلام کا یوں جائزہ لیتا ہے۔

(عطار) شریعت و طریقت میں بے مثل تھا۔ شوق و نیاز اور سوز و گداز میں زمانے کی شمع تھا۔ معرفت کا دریا اور اعتقاد کا سمندر اس کی شاعری غیب کے واردات کا بیان ہے۔ اس نے اہل طریقت کی چار سو کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور آخر میں درجہ فنا حاصل کیا۔ بدیع الزماں خراسانی فرماتے ہیں:-

ان کے کلام میں سب سے زیادہ مشہور منطق الطیر - اسرار نامہ اور تذکرۃ الاولیاء ہیں جن میں صوفی بزرگوں کے حالات و کلمات بڑی سادہ اور سلیس زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ منطق الطیر میں شیخ

نے عرفان و سلوک کے مسائل استعارات و تمثیلات اور رمز و کنایہ کی امداد سے نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ پند نامہ میں حکمت عملی اور اخلاق و نصائح کے دریا بہائے ہیں۔

خواجہ فرید الدین عطار نے صوفیانہ شاعری کو نہایت وسیع کر دیا۔ ان کی بدولت قصیدہ۔ رباعی۔ غزل۔ مثنوی تمام اصناف سخن تصوف سے مالا مال ہو گئے۔ آپ کی مثنوی منطق البکر کو بہت شہرت اور عزت حاصل ہے۔ خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا ان پر خاتمہ ہے۔ ہر قسم کے خیالات اس بے تکلفی۔ روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہو سکتے۔ وحدت وجود کا مسئلہ بادۂ تصوف کا نشہ ہے۔ خواجہ صاحب پر یہ نشہ ہے۔ خواجہ صاحب پر نشہ بہت چھایا ہوا ہے۔

شیخ عطار کی قصیدہ گوئی کا نمایاں جوہر یہ ہے کہ یہودہ مدح سرائی کے دھتے سے پاک ہے۔ انہوں نے عمر بھر کسی حاکم یا بزرگ کی مدح نہیں کی جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:   
 ”بعمرخویش مدح کس نگفتم“

آپ کے قصائد نعمت اور پند و عرفان کے لئے وقف ہیں۔ ان کے قصائد تغزل سے عادی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا موضوع یعنی عرفان و حقیقت متین و سنجیدہ ہے اور تغزل کی سبکی کو گوارا نہیں کر سکتا۔

عطار کی مغربوں میں بھی تصوف اور معرفت کے خیالات غالب ہیں۔ درحقیقت عرفانی اور صوفیانہ غزلیات میں آپ یکتائے روزگار ہیں۔ اور ان کی اس استاد ی میں کوئی شاعر ان پر سبقت نہیں لے جاسکا۔ عظیم المرتبہ صوفی شاعر سنائی کا کلام یا غزل سوز و گداز اور وجد آفرینی کے اعتبار سے عطار کے پایہ کو نہیں پہنچتی۔ حافظ۔ سعدی۔ مولانا روم وغیرہ نے بھی عطار کی استاد ی کو تسلیم کیا اور ان کی پیروی کی۔

عطار کی وفات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ۶۱۸ھ میں بقید حیات تھے۔ ایک روایت کے مطابق ۶۲۷ھ میں وہ ایک مقل کے ہاتھوں شہید ہوئے، آپ کی قبر نیشاپور کے جنوب میں بمقام شاد باخ موجود ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

روزہ حفظ دل است از خطرات	پس بود با مشاہدہ افطار
حج چہ باشد؟ ز خود سفر کردن	یہ کجا؟ جانب ہدایت کار
وحی چہ بود؟ آنچہ در دل تو	سرزند از نتایج اسرار

---

ہر آن مستی کہ بشناسد سرازیا	از او دعویٰ مستی ناپستد است
اگر در عشق از عشقت خبر نیست	ترا این عشق عشقی سودمند است

---

لب دریا ہمہ کفر است دریا جملہ دین داری \*  
ولیکن گوہر دریا و رائے کفر و دین باشد

## سلاجوقیہ دور کے دیگر نامور شعرا

سوال: ابو نصر علی بن احمد طوسی مشہور بہ اسدی کی شاعری پر تنقید و تبصرہ کیجئے۔

جواب: اسدی طوس کا رہنے والا تھا۔ اور پانچویں صدی ہجری کے دوران ہوا ہے۔

اس کی شہرت اس معرکت الاراشنوی کی بدولت ہے جس کا نام گرشاسپ نامہ ہے اور جو فردوسی کی بیروی میں لکھی گئی۔ یہ کتاب شاہنامہ فردوسی کی طرز اور اُسی وزن میں لکھی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ گرشاسپ نامہ شاہنامہ کے حسن بیان و پختگی فکر۔ فضیلت اور روانی سے محروم ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے اس نے ایسا مواد قدیم ایران سے متعلق ہم پہنچایا ہے جو شاہنامہ میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ گرشاسپ نامہ کی اپنی شاعرانہ خصوصیات بھی ہیں۔ اس میں استعارہ۔ مجاز اور کنایہ کی فراوانی ہے اور تاکید و تشبیہ میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً بعض اشعار میں بہت میزوں اور دلکش تشبیہات دی ہیں۔ جیسے کالی زمین کو آبنوس سے۔ کمان کو قوس قزح سے گل کو ترک سے۔ کلی کو موتی سے درخت کو طاؤس سے۔ آسمان کو ایران مینا سے گرشاسپ نامہ زبان اور بیان کے اعتبار سے شاہنامہ کی نسبت موجودہ فارسی کے زیادہ قریب ہے۔ مولانا شبلی نے اُسے فردوسی کے بعد اقلیم سخن کا دوسرا تاجدار قرار دیا ہے۔ فارسی شاعری پر اسدی کا ایک بڑا

احسان یہ ہے کہ قصائد میں اس نے جدت کا راستہ نکالا۔ اکثر قصیدوں میں اس نے مناظر لکھے اور یہ اس کی خاص ایجاد ہے۔

جناب براؤن کا خیال ہے کہ ممکن ہے اسدی سے پہلے بھی کسی نے مناظر نظم کئے ہوں لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اسدی نے اس صنف کو بہت ترقی دی۔ اسدی اگرچہ فردوسی کے دور میں شمار ہوتا ہے کم از کم اس کے دور سے قریب ہوا ہے لیکن تشبیہات اور مضمون ہندی کے لحاظ سے وہ نظامی کے دوش بدوش ہے۔ اس کی تشبیہات اور مبالغات متوسطین بلکہ متاخرین کے انداز کی ہیں۔ واقعہ نگاری اور صورت حال کے منظر دکھانے میں اُسے فردوسی سے کم مایہ نہیں کہا جاسکتا۔

گر شامِ سپ کی نصیحت اپنے بھتیجے نریمان کے نام ملاحظہ

ہو:

نکر تا گناہت نباشد بے	بیزداں زر بخت ننا لد کسے
فرومایہ را دار دور از برت	لکن آن کہ ننگی شود گوہرت
از آن ترس کو از تو ترس شود	دگر با تو ہر زمان دگر ساں شود
یفرمان ناداں ممکن بیج کار	مشو نیز با پارسا باد سار
بکس بیش از اندازہ نیکی ممکن	کہ گردد بد اندیش بشنو سخن
اسدی نے قصیدے بھی لکھے۔ ان میں اس کے یہ چار	

مناظرے بھی شامل ہیں:- مناظرہ شب و روز، مناظرہ نیزہ و کمان، مناظرہ آسمان و زمین اور مناظرہ منع و مسلم۔ اسدی نے ۶۵ھ میں وفات پائی۔



سوال: قطران تبریزی کی زندگی اور شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

جواب: ابو منصور قطران سلجوقی عہد کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی ولادت تبریز میں ہوئی۔ یہیں اس نے نشوونما اور تعلیم و تربیت پائی اور بڑے ہو کر شہرت حاصل کی۔ اس کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ عظیم المرتبہ شاعر ناصر خسرو جب تبریز سے گذرا اور قطران کے اشعار پڑھے تو انہیں بہت پسند کیا۔ قطران کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آذربائجان کے سلاطین کی بہت مدح کی ہے۔ گنج کے حکمران ابوالحسن علی شکری فضلوں تبریز اور اس کے نواح کے امرا ابو منصور دہمسودان اور ابونصر دہمسودان اور خجوان اور ارآن کا حاکم ابودلف قطران کے ممدوحین تھے۔

قطران کی شہرت کا آغاز ابوالحسن لشکری کے زمانے میں ہوا۔ قطران کا وہ قصیدہ جو اس نے تبریز کے زلزلے پر لکھا، نہایت پُر زور اور مؤثر ہے۔ تاریخ کی رو سے یہ زلزلہ ۳۳۷ھ میں رونما ہوا اور اس وقت خود شاعر وہاں موجود تھا۔ چونکہ شاعر نے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں اس لئے اس قصیدے میں بڑی رقت اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ قطران کا فارسی قصیدہ گو شعرا کی صفِ اول میں مقام ہے۔ اس کے قصیدے متانت اور صدا کے عناصر سے مملو ہیں۔ اس کے کلام میں صنائع بدائع و بھئی پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر صنائع لفظی تجنیس ترصیح اور ذوقافینین

سے کام لیا ہے۔ واقعہ نگاری، منظر کشی اور فضول میں استاد تھا  
کئی ایک شاعروں نے اس کی تعریف کی ہے۔

قطران کے قصیدوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مدح  
گوئی کے علاوہ اس نے طبعی حادثات اور تاریخی واقعات کے  
بیان میں خاص دلچسپی لی ہے۔ دیوان کے علاوہ اس کی ایک  
مثنوی قوس نامہ بھی ہے۔

سوال: مستود سعد کی زندگی کے حالات سپرد قلم کیجئے  
اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔

جواب: مستود سعد کے بزرگ ہمدان کے رہنے والے  
تھے۔ اور غزنوی دور میں ہندوستان میں یہ خاندان آباد ہو گیا۔  
مستود کے باپ سعد اور دادا سلمان کا شمار اپنے زمانے کے علما  
میں ہوتا تھا۔ سعد نے ساٹھ سال کے لگ بھگ غزنوی سلاطین  
کی خدمت کی۔ مستود نے بھی اپنے آپ کو ایام جوانی میں غزنوی  
دربار سے وابستہ کیا۔ جب سلطان ابراہیم غزنوی کا بیٹا محمود  
سیف الدولہ ۴۹ھ میں ہندوستان کا حکمران مقرر ہوا تو مستود  
بھی اس کی خدمت میں داخل ہو گیا۔ اکثر مستود سیف الدولہ کی  
جہات کے دوران ہم کاب رہتا اور بڑی عزت اور راحت کے  
ساتھ زندگی بسر کرتا۔ لاہور میں اس کا ایک بڑا محل تھا۔ سلطان  
ابراہیم غزنوی اپنے بیٹے محمود سیف الدولہ سے ناراض ہو گیا۔  
اور اس کی معذما کے گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ اور انہیں  
قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ مستود سعد کو بھی دشمنوں اور حاسدوں

کی غیبت پر گرفتار کر لیا گیا پہلے سات سال تک قلعہ دھک اور قلعہ ستو میں اور پھر تین سال تک قلعہ نائی میں محبوس رکھا گیا مسعود نے بہرام نامی مخم سے اختر شناسی سیکھی۔ دس سال کی اسیری کے بعد سلطان ابراہیم نے اسے اپنے ایک درباری عمید الملک کی سفارش پر رہا کر دیا۔ مسعود سعد ہندوستان کو لوٹ آیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو ملا۔ امیر عمید الملک کی مدح میں ایک شکر یہ کا قصیدہ لکھا۔

سلطان ابراہیم کے جانشین بیٹے سلطان محمود نے ہندوستان کی حکومت اپنے بیٹے امیر عضد الدولہ شیر زاد کے حوالے کی۔ ہندوستان کے اس نئے غزنوی حکمران کے شاعر مسعود سعد کے ساتھ بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ اس نے اس مظلوم شاعر کو جالتدھر کی حکومت عطا کی۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد شاعر پھر غزنوی دربار کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ اور گرفتار کر لیا گیا۔ آٹھ سال تک قلعہ مرنج میں مقید رہا آخرت شہہ میں سلطان محمود کے وزیر طاہر علی مشکاتی کی سفارش پر اسے آزادی نصیب ہوئی اور کچھ عرصہ وہ شاہی کتب خانے کی کتاب داری پر مامور رہا۔ لیکن اب اس کا دل بچھ گیا تھا۔ بڑھاپے نے غلبہ پالیا۔ اور اس نے بادشاہوں کی خدمت سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

مسعود سعد ایک بلند پایہ قصیدہ گو شاعر ہے۔ خراسان کے شعرا مثلاً عنصری، منوچہری وغیرہ کے کلام کا اثر اس کی شاعری پر نمایاں ہے لیکن تقلید سے پاک ہے۔ اس کا اپنا اسلوب جوانی ہی

میں نچتے ہو چکا تھا۔ اور شاعری میں اس کا اپنا جداگانہ رنگ تھا۔  
 مسعود کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پاکیزہ  
 اور لطیف تغزل پایا جاتا ہے۔

مسعود بنزنگاری میں بھی ماہر تھا۔ عربی اور ہندی سے خوب  
 واقف تھا۔ عربی زبان میں بھی اس نے شعر کہے ہیں۔ مسعود کا وہ  
 کلام خاص طور پر موثر اور سوز و گداز سے معمور ہے جو اس نے قید  
 کے دوران کہا۔ اس میں خاص زور اور رقت نمایاں ہے۔ ایرانی  
 ادب میں اس قسم کی شاعری بہت کم ہے۔ ان اشعار میں جذبات  
 نگاری کا خوب حق ادا کیا گیا ہے۔ اپنی مصیبتوں کی بے نظیر عکاسی  
 کی ہے۔ یہ شعر اس کے دردِ دل کے ترجمان ہیں۔ تخیل یا مبالغہ کو  
 ان میں مطلق دخل نہیں وطن سے دوری۔ عزیزوں سے ہدائی اور  
 دوستوں سے علیحدگی نے اس کے دل کو بڑی کھٹیس لگائی تھی جو  
 دردناک نالوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

مسعود سعد کے قصیدوں کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔  
 اول وہ قصائد جو اس نے شکوہ کے طور پر سلاطین غزنی کی خدمت  
 میں پیش کئے۔ ان میں ان کی مدح بھی کی اور اپنی مصیبتوں اور  
 دشمنوں کی تہمتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ مدح مبالغہ یا باطل سے  
 پاک ہے۔ جاپوسسی کا نام و نشان نہیں۔ حقائق کا بیان ہے۔  
 اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر طبعاً خود را  
 متین اور حقیقت پسند تھا۔ عزتِ نفس کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے  
 دیتا۔ دستِ سوال بڑھانے سے عمار رکھتا تھا۔ اس کے دوسرے

قصیدے وہ ہیں جو اس نے وزیر اور امرا کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان وزیر اور امرا نے اس کی مدد کی تھی۔ اس کی رہائی کی سفارش کی تھی۔ اس نیکی کے لئے شاعران کا شکر گزار ہے اور ان کی تعریف کے علاوہ اپنے ذاتی مصائب و آلام بیان کرتا ہے۔ قید کی تکلیفات کا دردناک پیرائے میں ذکر کرتا ہے۔ ماں باپ اور عیال و اطفال کی جدائی کا حال بھی ہے۔ اپنی بے گناہی اور عاصدوں کی ہمت تراشی کا بھی بیان ہے۔ پہلی قسم کے قصائد ذیل میں مذکور بادشاہوں کی مدح میں لکھے :-

سلطان ابراہیم غزنوی۔ سلطان محمود بن ابراہیم۔ شیرزاد بن ابراہیم۔ ملک ارسلان بن مسعود۔ بہرام شاہ بن مسعود۔ دوسری قسم کے قصائد مندرجہ ذیل امراء و وزراء کی مدح میں ہیں۔

ثقتہ الملک طاہر وزیر سلطان مسعود۔ ایو القاسم خاص وغیرہ قید کی صعوبتوں کو مسعود سعد نے بڑی بردباری اور حوصلہ مندی کے ساتھ برداشت کیا اور قید کے دوران بھی تحصیل علم و دانش میں مصروف رہا۔ صبر و تسلیم سے کام لیا۔ اس کے قصائد کا موضوع شکوہ ضرور ہے لیکن یہ شکوہ متانت اور مردانگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بزدلی یا بے غیرتی کا مطلق اظہار نہیں کیا۔ دل کے جذبات کا حقیقی بیان ہے۔ اپنی خودداری پر حرف نہیں آنے دیا۔ اس کی ہمت اور حوصلہ مندی دراصل اس کی جنگی مشاہدات کا نتیجہ تھی۔ وہ قصائد میں بزمیہ اور رزمیہ دونوں رنگ لاتا ہے۔



مسعود سعد کے تعلقات اس زمانے کے بڑے بڑے ایرانی شعرا کے ساتھ تھے۔ حکیم سنائی نے مسعود کا دیوان خود مرتب کیا تھا۔ ایک اور شاعر سید حسن غزنوی اپنا کلام اس کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ ملک شاہ کا درباری شاعر رشید سی سمرقندی اپنا کلام صلاح کے لئے ہندوستان میں مسعود سعد کے پاس بھیجتا تھا۔ ابوالفرج رونی بھی اس کے ساتھ شاعرانہ تعلقات رکھتا تھا۔ سلطان سنجر کا درباری شاعر ملک الشعر امغزی بھی مسعود کے کمال فن کی تعریف کرتا ہے:۔

شریف خاطر مسعود سعد سلماں را مسخر است سخن چوں پری سلیاں را  
خاقانی نے بھی اس کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔ مسعود سعد نے ۵۱۵ھ میں وفات پائی۔

سوال: ابوالفتح عمر بن ابراہیم مشہور بہ چیتام کی زندگی اور شاعری پر پوری پوری روشنی ڈالئے۔

جواب: ملک الحکما شیخ عمر خیتام نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ اس کی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہیں لیکن اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ وہ گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے آپ نے مختلف علوم و فنون کی تحصیل شروع کر دی۔ اس نے خراسان کے مختلف شہروں مثلاً بلخ، بخارا، طوس اور مرو کی سیاحت کی تھی۔ وہ بغداد بھی گیا تھا۔ ایک لڑایت کے مطابق اس نے حج بھی کیا تھا۔ آپ کا شمار سلجوقی دور حکومت کے بڑے بڑے علما اور شعرا میں ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق عظیم

ہمعصر انتخاب کے ساتھ تھا۔ مثلاً غزالی اور خواجہ نظام الملک بھی اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سلطانی مجالس اور علمی و ادبی محافل میں اُسے صدر میں جگہ دی جاتی۔

حکیم عمر خیام کو نجوم، ہیئت اور حکمت میں بڑی دستگاہ تھی۔ سلجوقی بادشاہ ملک شاہ نے تقویم کی اصلاح کے لئے دوسرے جلیل القدر منجموں کے ساتھ عمر خیام کو بھی مامور کیا۔ جب ملک شاہ کا بیٹا سبخر مرض آبلہ میں مبتلا ہوا تو خیام نے ہی اس کا علاج کیا اور اسے صحت یاب کیا۔ حکمت اور دوسرے علوم میں وہ حجت الاسلام امام غزالی کے سے بلند رتبہ علما و فقہا کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔

جب حکیم عمر خیام طب، حکمت اور نجوم کے دقیق مسائل سے اکتانگیا تو اس نے اپنی زندگی کی روش بدلی۔ اور ذہنی کوفت و تنکان کو دور کرنے اور تفریح طبع کی خاطر اس نے شاعری کی طرف رجوع کیا۔ اور ریاضیات لکھنا شروع کیا۔ ان ریاضیات میں اس نے فلسفہ تعیش (ایپیکورس) کا اظہار کیا۔ اور ہر حالت میں زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کی ہے۔

حکیم عمر خیام اکثر باتوں میں الحکیم الوزير المستور شرف الملک ابوعلی الحسن بن عبد اللہ بن سینا البخاری کی روش پر چلتے رہے لیکن طبیعت میں کچھ تنگی سی تھی۔ حافظہ بہت تیز یا تھا۔ ریاضیات عربی لغات اور قرآن کریم کی تفسیر میں یہ طویلے رکھنے کے ساتھ ساتھ

آپ کو علم نجوم میں کامل دسترس حاصل تھی۔ یہاں تک کہ ایران میں آپ کو صاحبِ نجوم اول خیال کیا جاتا ہے اور معمولی شاعر بعد میں لیکن ایران کے باہر عمر خیّام کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہے۔ وہ بہت تھوڑے ایرانی شاعروں کو نصیب ہو سکی ہے۔ یورپ میں عمر خیّام کو رباعی لکھنے والوں کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سلجوقی بادشاہ ملک شاہ آپ کی بہت عزت کرتا تھا۔

## رباعیاتِ خیّام

عمر خیّام کی رباعیاں فلسفیانہ نکات اور عیش و عشرت کے مسئلوں سے بھری پڑی ہیں۔ ان رباعیوں کا اسلوب حسن تاثر تازگی اور لطافت اپنی مثال آپ ہیں۔ عیارت کے اعتبار سے یہ رباعیاں مختصر ہیں لیکن معانی و مطالب کا مخزن ہیں۔ وہ انسانی روح کو دنیا کی بستیوں اور لذتوں مصیبتوں اور چھٹھٹوں سے بالاتر لے جاتا ہے اور مسرت و راحت کی فضا میں اُڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ فطرت کے رموز اور اسرار سے منہ موڑ کر زندگی کی حقیقت پر زور دیتا ہے۔ وہ چند روزہ زندگی کو غنیمت سمجھنے اور اس سے پوری طرح لطف اٹھانے کی تاکید کرتا ہے۔

وہ ماضی کے مصائب کو بھول جانے اور مستقبل کے ممکنات سے بے نیاز ہو کر حال پر توجہ دینے کی تلقین کرتا ہے وہ رقص و سرود اور حسن و شباب کے مناظر کا مشتاق ہے۔ وہ شراب کی مستی میں آلام و آفاتِ عالم کو بھول جانا چاہتا ہے۔

خیام نے ریاکاروں اور نام نہاد زاهدوں کی بہت بھری گت بنائی ہے۔ صرف یہی نہیں۔ وہ تو خداوند تعالیٰ کے ساتھ بھی جھڑپ لینے سے باز نہ آیا ہے

ابرئق مئے مرا شکستی ربئی      بر من در عیش را بہ لستی ربئی  
بر خاک بریختی مئے لعل مرا      خاکم بدین کہ سخت مستی ربئی  
کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خداوند تعالیٰ نے اس کی گردن ٹیڑھی کر دی اس پر اس نے بر حسبہ کہا ہے

ناگردہ گناہ در جہان کیست ہبگو      واں کس کہ گنہ ز کرد چوں ز لست ہبگو  
من بد کنم و تو بد مکافات دہی      پس فرق میان من و تو چیست ہبگو  
انسان کی ناکامی۔ اس کے آلام و آفات۔ اس کی زندگی کی ناپائیداری اور نام نہاد صوفیوں اور بزرگوں کی ریاکاری کے بیان کے بعد وہ انسان کی نجات کی تدابیر سوچتا ہے۔ اور مصائب کا مقابلہ کرنے اور صحیح طریق پر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ بتاتا ہے۔ یہ ڈھنگ ہے عیش و عشرت کا، دنیا سے بے نیازی کا، ماضی کے رنج کو بھولنے اور مستقبل کے غم سے لاپرواہ ہونے اور حال کے دم کو غنیمت جاننے کا۔ زندگی کے چند لمحات میں زیادہ سے زیادہ نطفہ اٹھانے کا۔ اور دل کی تمناؤں کو پورا کرنے کا، زندگی کے اوقات کی قدر کرنے کا۔

روزے کہ گذشتہ است از ویاد مکن      فردا کہ نیامده است فریاد مکن  
ہر نامدہ و گذشتہ را بنیاد مکن      حالی خوش باش و عمر بر باد مکن  
عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جو روانی شگفتگی اور نزاکت اس کی فلسفیانہ رباعیوں میں ہے اور کسی شاعر کے کلام میں نام کو بھی نظر نہیں آتی۔ اگرچہ ایرانی شاعری کو سب سے پہلے روڈکی ہی نے اپنی کیورس کے فلسفہ نقیض سے روشناس کیا تھا۔ لیکن اس فلسفے کے بہترین ترجمان یعنی خواجہ حافظ شیرازی کے لئے میدان تیار کرنے والا عمر خیام تھا۔ عمر خیام کے خیالات میں حیرت انگیز طور پر موجودہ مغربی شعر و شاعری کی سی جدت پائی جاتی ہے۔

خیام نے جا بجا دقیق مسائل حیات و ممات کی تحقیقات کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ فلسفی شاعر کس لطیف پیرائے میں تواضع و انکساری کی تعلیم دیتا ہے۔  
 در راہ چنان رو کہ سلامت نہ کنند      با خلق چنان زی کہ قیامت نہ کنند  
 در مسجد اگر روی چنان رو کہ تُرا      در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند  
 خیام نے اپنی زبان کو تمام عمر مدح سرائی کی آلائش سے پاک رکھا۔

خیام کی اکثر رباعیوں میں اسلوب ادا اور مضمون کا فرق نظر آتا ہے بلکہ تضاد دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات بدلتے گئے۔ یا یہ ہوگا کہ دوسرے شعرا کی رباعیوں کو اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مس کیڈل ۱۸۸۲ء میں لکھتی ہیں کہ کوئی بارہ سو کے قریب رباعیاں خیام کے نام سے مشہور ہیں جن میں سے اڑھائی سو اور تین سو کے درمیان واقعی خیام کی رباعیاں ہیں۔



خیام نے عربی زبان میں ایک رسالہ ”جبر و مقابلہ“ اور ایک رسالہ ”اقلیدس کی بعض تعریفات پر لکھا۔“ ترجمہ ملک شاہی کی تصنیف میں اس کا کچھ حصہ ہے۔ خیام نے ۱۱۱۵ء اور ۱۱۳۵ء کے درمیان انتقال کیا (از روئے چہار مقالہ)

سوال: امیر معزی کی زندگی اور اس کے کلام پر روشنی ڈالئے۔  
جواب: محمد بن عبد الملک معروف بہ معزی نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ عبد الملک بربانی سلجوقی بادشاہ البی ارسلان کا درباری شاعر تھا مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے محمد کی سفارش کے طور پر ایک قطعہ ملک شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قطعہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بگذرتم این خدمتِ دیرینہ بفرزند و اندر سرفراز علتِ دہ روزہ بمر دم  
رفتم من و فرزند من آند خلفِ صدق اور ابخی را و بخداوند سپردم  
شروع شروع میں محمد بن عبد الملک کو سلطان ملک شاہ کا تقرب حاصل نہ ہوا۔ البتہ دربار میں رسائی ہو گئی۔ ایک روز ماہ رمضان کے دیدار کے لئے سلطان باہر نکلا۔ اور سب مصاحبین سے پہلے چاند کو دیکھ لیا۔ اس موقع پر معزی بھی موجود تھا۔ اس نے فی البدیہہ یہ رباعی بادشاہ کی نذر کی۔

اے ماہ چو ابروانِ یاری گوئی یعنی چو کمانِ شہر یاری گوئی  
فعلی ز دہ از زرِ عیاری گوئی در گوشِ سپہر گو شواری گوئی  
سلطان اس رباعی سے بہت خوش ہوا اور شاعر کو انعام میں ایک گھوڑا عطا کیا۔

اس کے بعد شاعر کو ترقی کا موقع ملا اور دربار میں اس کو تقرب حاصل ہو گیا۔ سلطان اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے شاعر کو اپنا تخلص اپنے لقب (معز الدین) پر اختیار کرتے کا حکم دیا۔ اب معزی کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ صاحب شان و شوکت و دولت و ثروت ہوا۔ سلطان سنجر کا ملک الشعراء بن گیا۔ اس کی عزت و حشمت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔

معزی کے قصائد سے سلجوقی خاندان کے تاریخی واقعات کا بھی علم ہوتا ہے۔ خاص طور پر ۴۶۵ھ (سال تخت نشینی ملکشاہ سے ۵۲ھ) (سال وفات ملک شاہ) تک۔ ان سے سلطان ملک شاہ اور سلطان سنجر کے اخلاق و خصائل اور ان کی ٹرائیوں اور صلحناموں سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ ان سلاطین کے امرا اور وزرا خواجہ نظام الملک۔ اس کے بیٹے وغیرہ سے متعلق کافی تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔

شاعر کی موت کا واقعہ دردناک ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس بادشاہ (سلطان سنجر) کا وہ منظور نظر تھا۔ اسی کے ہاتھوں اس کی موت ہوئی۔ ایک روز سلطان سنجر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ سلطان کی غلطی یا شاعر کی بد بختی سے ایک تیر معزی کو جا رگا جس سے وہ سخت زخمی ہوا۔ اور کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد جاں بحق ہوا۔ یہ حادثہ ۵۱۲ھ میں رونما ہوا۔ حکیم سنائی نے اس کی وفات پر ایک پیر درد مرثیہ لکھا۔

معجزی ایران کے مشاہیر شاعر و سخن میں سے  
**کلام پر تنقید** ہوا ہے اس کے بلند پایہ قصیدے بلحاظ  
 طرز اور موضوع عنصری اور قرخی کے قصائد سے ملتے جلتے ہیں۔  
 بعض اوقات تو یہ مشابہت بہت ہی نمایاں ہے عنصری اور  
 قرخی کے کلام کے رنگ اور مضامین کے پر تو کی جھلک معجزی  
 کے اشعار میں صاف صاف نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ عسجدی  
 کے کلام کا اثر بھی معجزی کی شاعری پر پڑا ہے۔

معجزی قصیدہ گوئی کا استاد تھا۔ اس نے بڑے بڑے  
 قصیدہ گو شعرا کی روایات کو برقرار رکھا۔ اس کے کلام میں  
 تشبیہ۔ حجاز اور استعارے کی صنائع موجود ہیں۔ اس نے  
 غزلیں بھی کہی ہیں اور قطعات و رباعیات اور مستمط بھی۔ البتہ  
 اس میں ایک عیب ہے۔ وہ اپنے ممدوحین کی تعریف میں  
 بے حد مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ اس کے مرتبے بھی بلند درجہ  
 کے ہیں۔ قصیدوں میں تصوف اور عرفان کے مضامین ہیں۔

### نمونہ کلام

تو اں گدشت از منز لے کا نجا نیفتد مشکلی  
 از قصہ سنگین و لے نوشیں لب سہیں ذقن!

یارے برخ چوں ارغواں ہوئے بہ تن چوں پریاں  
 سروے بلند چوں نارواں ماہے بقدر چوں نارون

میان بیم و امید اندرم کہ هست مرا      بروز بیم فراق و بہ شب امید وصال  
 وصال آب زلال است ایچا است حرام      فراق بادہ سخن است پس چہ است حلال  
 کنوں کنار مر اگر دہاد ثبات فلک      ز دیدہ خالی وار خون دیدہ مالا مال  
 سوال۔ انوری کی زندگی اور شاعری کی خصوصیات پر  
 پوری پوری روشنی ڈالئے۔

جواب: ابوہدالدین علی بن محمد متخلص بہ انوری خراسان میں  
 علاقہ خاوران کے گاؤں بدتہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ  
 منصورہ میں حاصل کی۔ جہاں اس نے اپنے دن بڑی تنگ دستی  
 کی حالت میں بسر کئے۔ انوری نے اپنا سب سے پہلا مشہور قصیدہ  
 انہی دنوں کے کچھ عرصہ ہی لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

گر دل و دست بحر و کان باشد      دل و دست خدا نگاہ باشد  
 اس پر عظیم القدر سلجوقی بادشاہ سنجر (۱۱۹۱ء تا ۱۱۹۵ء) اتنا  
 خوش ہوا کہ انوری کو اپنے ساتھ مروئے گیا۔ اگرچہ انوری سنجر کے  
 بعد کوئی تیس سال تک زندہ رہا لیکن اس کی شہرت کا زمانہ سنجر  
 کا عہد حکومت ہی ہے۔ اور اس کے بیشتر قصیدے اسی سلطان کی  
 تعریف میں لکھے گئے۔ انوری کے قصیدوں میں خاقانی کی شوکت  
 الفاظ بلندی تخیل اور مطلب کی گہرائی نہیں ہے لیکن دنیا نے  
 اسے قصیدہ گوئی کا پیغمبر تسلیم کیا ہے۔

در شعر سنہ تن پیغبران اند      ہر چند کہ لانی بعدی  
 ابیات و قصیدہ و غزل را      فردوسی و انوری و سعدی  
 مولانا شبلی فرماتے کہ انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں

کوئی معجزہ نہیں۔ البتہ وہ اپنے معاصرین سے بعض باتوں میں  
انتیاز خصوصی رکھتا ہے۔ انوری کا اصلی مایہ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ  
نہیں کہ اگر ہجو کی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا۔

انوری کی تاریخ پیدائش کا مکمل پتہ نہیں تاہم یہ ضرور ہے  
کہ وہ گیارھویں صدی عیسوی کی آخری چوتھائی میں پیدا ہوا۔ اس  
نے دیگر علوم متداولہ کی تحصیل کے علاوہ فلسفہ، نجوم، ہیئت  
منطق، موسیقی اور ریاضی میں کافی دسترس پائی تھی جس کا اس  
نے خود ذکر کیا ہے۔

منطق و موسیقی و ہیئت بدنام اندکی راستی یابد بگویم بانصیب و اخرم  
وز الہی آنچه قصد نقیش کند عقل صریح گرتہ قصد نقیش کنی در شرح و نظم باہرم  
نیستم بیگاہ از اعمال و احکام نجوم در ہمے باز نداری رنج بشوم طہرم  
اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انوری کی شہرت اس کی

شاعری کی وجہ سے ہے۔ اور یہ کہ اس کے اپنے قول کے مطابق  
شاعری اس کے معاملات میں ایک ادنیٰ اسی چیز تھی۔ اگرچہ انوری  
کو مجبوراً شاعری اختیار کرنی پڑی تاہم وہ اس فن کو نفرت کی  
نگاہوں سے دیکھتا تھا اور ابوعلی سینا کی مانند ایک آزاد زندگی  
بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ سچے دل سے بادشاہوں یا امرا کی تعریف  
نہ کرتا تھا۔

غزل و مدح و ہجاء ہر سہ ازاں گفتیم کہ مرا شہوت و حرص و غصہ بود ہم  
علامہ مرزا محمد فزونی کی رائے میں انوری کی شہرت کا دار و مدار  
زیادہ تر ان قصیدوں پر ہے جو کسی کی مدح میں نہیں لکھے گئے۔ اس



نے غزلیں، رباعیات اور قطعات وغیرہ بھی لکھے۔ لیکن ان کا پایہ قصیدوں تک نہیں پہنچتا۔ اگرچہ بعض اوقات وہ نہایت لطیف خیالات اچھوتی ادا سے بیان کر جاتا ہے۔

بوسمی خواہم از ازل لب تہیہ فرمائی  
گر صواب است بگو ورنہ خطائے بکنم  
انوری کا ایک شعر صنعتِ عکس کا بہترین نمونہ ہے۔

دلے دارم ہمیشہ ہمدم غم غمے دارم ہمیشہ ہمدم دل  
انوری کی برسوں یہ آرزو رہی کہ وہ ستجر کے درباری شعرا کے  
زمرے میں شامل ہو سکے۔ اس آرزو کی تحریک دولت شاہ سمرقندی  
کے بیان کے مطابق سلطان ستجر کے ملک الشعراء میر معزی کی  
شان و شوکت دیکھ کر ہوئی۔ انوری نے خود اس خواہش کا ذکر کیا ہے؟  
خسرو! بندہ را چودہ سال است کہ بھی آرزوئے آں باشد  
کزندیمان مجلس او نہ شود از مقیمان آستان باشد  
بالآخر جب اس کی یہ تمنا برآئی تو سلطان کے دربار میں تقرب  
خاص حاصل ہو گیا۔ ستجر کے علاوہ انوری نے متعدد وزراء، امرا،  
شعرا، صدور اور قضاة وغیرہ کی مدح کہی جن میں صدر الدین محمد  
بن فخر الملک اور ابوالفتح ناصر الدین طاہر بن فخر الملک بھی شامل  
ہیں مگر الذکر کی تعریف کے لئے انوری کے بیشتر قصائد مخصوص ہیں۔  
خزانہ عامرہ میں مذکور ہے کہ ۵۸۱ھ میں انوری نے پیشین گوئی  
کی کہ اس سال فلاں تاریخ کو سب سے سیارہ کا قرآن مجید میں  
ہوگا جس کی وجہ سے اس قدر سخت طوفان آئے گا کہ عمارتیں زیر  
زبر ہو جائیں گی۔ لوگ اس تاریخ کو ڈر کے مارے تھے خانوں میں

چھپے رہے۔ لیکن اس دن طوفان کی بجائے ہوا اس قدر  
ساکن رہی کہ پتہ تک بھی نہ ہلا۔ یہ بات انوری کی ذلت اور ملامت  
کا موجب بنی یہاں تک کہ اُسے جان بچانے کے لئے نیشاپور  
اور بعد میں بلخ کی جانب بھاگنا پڑا۔ بلخ میں بھی اُسے چہین نصیب  
نہ ہو سکا سو، اتفاق سے ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے اس  
کی مزید تزیل و تحفیف ہوئی۔ سوزنی یا فتوحی نے بلخ کی بچو میں  
ایک نظم ”خرنامہ“ کے عنوان سے لکھی اور شرارت سے مقطع میں  
انوری کا نام جڑ دیا۔ اس پر بلخ کے لوگوں نے ستم زدہ انوری کی بہت  
بری گت بنائی اور عورتوں کا لباس پہنا کر گدھے پر سوار کر آیا۔ اگر  
شہر کے بعض معزز حضرات جن میں قاضی حمید الدین صاحب  
مقامات حمیدی بھی شامل تھے مدد کو نہ آتے تو اہل بلخ انوری  
کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ انوری نے ان لوگوں کے شکریے  
میں وہ مشہور قصیدہ نظم کیا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخ چہری  
وز نفاقِ تیر و قصدِ ماہِ کبیدِ مشتری  
آسماں در کشتیِ عمرم کند دائمِ دوکار

گاہ شادی بادبانی وقتِ اندہ لنگری  
جب ۱۱۴۷ھ میں سبغ نے اتسرخوارزم شاہ کے خلاف لشکر  
کشی کی تو انوری اس کے ہمراہ تھا۔ جب ۱۱۵۳ھ میں سبغ ترکوں  
کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تو ملکہ ترکان خاتون نے انوری کو شہزادہ  
سمرقند محمود بن ارسلان خاں محمد بن سلیمان کے دربار میں صلح

کا وفد لے جانے پر مامور کیا۔ اس سفر کے دوران میں اس نے

اپنی ایک بہترین نظم لکھی ہے

بر سمرقند اگر بگذری لے بادِ بحر نامہ اہل خراساں بہرِ خاقاں ہو

نامہ مطلع آن رنج تن آفتِ جان نامہ مقطع آن دردِ دل و سوزِ جگر

ریش گردِ دھرمِ صوت از و گاہِ سماع کو رشودِ مردِ مکِید از و گاہِ نظر

نکند خطبہ بہرِ شہرِ بنامِ غزاں کہ در خراساں خطیبِ بہت کنوں نے منبر

یہ قصیدہ ”اشک ہائے خراساں“ کے نام سے مشہور ہے اور

۱۵۵۵ء کے لگ بھگ لکھا گیا اس میں انوری نے ترکوں کے مظالم

اور خراساں کی تباہی کی ہو ہو تصویر کشی کر رکھی ہے۔ جذبات

بالکل فطری و حقیقی ہیں۔ زبان روان و صاف، طرزِ ادا پُر جوش اور

دلکش، زبان، خیالات اور اسلوب کی گواہیوں کے علاوہ

جو سب سے زیادہ قابلِ التفات چیز ہے۔ یہ ہے قصیدے کی

تاریخی دلچسپی۔ انوری نے نہایت سنجیدہ اور درزنانہ پیرائے میں

ایسے تاریخی واقعات کو نظم کیا ہے جو بصورتِ دیگر ہم تک ذرا مشکل

سے ہی پہنچ سکتے۔ یا اس طرح زندہ تصویروں کی مانند ہمارے سامنے

آ سکتے۔ دولت شاہ سمرقندی، شیر خاں بودھی، لطف علی بیگ،

امین احمد رازی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے ”اشک ہائے خراساں“

کو فارسی ادبیات کے بہترین شاہکاروں میں شمار کیا ہے مغربی

نقادوں نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ قصیدہ کل ۷۲

اشعار پر مشتمل ہے۔ خیالات، طرزِ بیان، جذبات اور بحرِ مری یک

جہیبِ مطابقت ہے۔

انورسی کے کلام میں اس بات کا جا بجا ثبوت ملتا ہے کہ اسے  
مدح گوئی سے حد درجہ کی نفرت تھی۔ جمہوری قسمت کی ستم ظریفی  
دیکھئے کہ پیارے کو چار و ناچار ہر کس و ناکس کے گن گانے پڑتے  
چنانچہ اس نے خود لکھا ہے کہ

نشد بہر آداب ندیمی      در گرجان و دل زحمت نہاوان  
زباں کردن بنظم و نثر جاری      ز خاطر نکتہائے بکر زادان  
کہ باز آید ہمہ کار ندیمی      بسیلی خوردن و دشنام دادن  
بہی وجہ ہے کہ ایک مدت شاعری میں مشغول رہنے کے

بعد اس نے اس پیشے سے توبہ کر لی۔ اور باقی عمر گوشہ نشینی  
کی حالت میں بسر کی۔ مشہور ہے کہ علاء الدین غوری (۷۱۱ھ)  
تاسلئے نے اُسے اپنے دربار میں بلایا۔ انورسی کو کسی طرح سے

یہ بھید معلوم ہو گیا کہ غوری کا منشا اسے چند طنزیہ اشارات کی  
پاداش میں سزا دینا تھا۔ چنانچہ انورسی نے ایک نظم لکھ کر معذرت  
پیش کی۔ اس نظم میں اس نے اپنی قناعت اور عزت گزینی کا  
ذکر کرتے ہوئے شاہی درباروں سے بے نیازی کا اظہار کیا ہے کہ

کلبہ کا ندرو بروز و شب      جائے آرام و خورد و خواب مست  
ہرچہ در مجلس ملوک بود      ہمہ در کلبہ خراب مست  
و جل جراد و نان خشک برو      گرد خوان من و کباب مست  
شیشہ جرمن کہ یادا پیر      پیش من شیشہ شراب مست  
خدمت پادشاہ کہ باقی باد      نہ بیا زوئے خاک آب مست  
نیست این بندہ را زبان جواب      جامہ و جائے من جواب مست

انوری میں شاعری کا مادہ فطری تھا۔ لیکن دربار داری کی زندگی نے اس کو خراب کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ قصائد نگاری کا پیشہ اختیار نہ کرتا تو وہ شعرا کی اس صف میں جگہ پانے کے قابل ہوتا جس میں ہم فردوسی، نظامی، سعدی اور حافظ کو جلوہ گرد یکھتے ہیں۔ انوری کے کلام میں وہ صفائی روانی، بے محابا نگاری، شوخی اور علمیت ہے جو کچھ اُسی کا حصہ ہے اس کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے عربی زبان کے الفاظ اور ترکیب کو ایک نہایت خوش آئند صورت میں فارسی قصائد کے ضمن میں استعمال کرنے کی روش ڈال دی۔ فارسی اور عربی کی یہ بے مثل اور رنگین ترین آمیزش انوری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور شاید اس کی پیغمبری کے دلائل میں سے ایک بڑی دلیل ہے۔ واقعات اور معاملات کو نادر ترکیبوں اور خوش نما بندشوں میں ادا کر کے انوری نے زبان کے دائرے کو وسیع کر دیا۔ اور اس کے طفیل قصائد کا احاطہ زیادہ قراخ ہو گیا یہاں تک کہ قصیدہ ایک حد تک تقریباً ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

انوری نے غزلیں بھی کہی ہیں اور ان کا رنگ بھی خوب ہے۔ غزل گوئی میں اس کا رتبہ متقدمین سے کم نہیں۔ اس کی غزلوں میں سعدی جیسے استادوں کی تاثیر اور لطافت ہے۔ انوری کے قطعات میں بعض بے حد لطیف اور مسود مند ہیں۔ اور وہ قطعاً جن میں اخلاقی مضامین ادا کئے گئے ہیں بہت قدر کی نگاہ سے



دیکھے جاتے ہیں۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ انوری کا اسلوب بیان یکسانیت کے عیب سے پاک نہیں۔ اور یہ عیب کسی حالت میں بھی پندیدہ خیال نہیں کیا جاتا۔

انوری کی تصانیف میں صرف ایک کلیات ہے ”کلیات انوری“ کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس میں کوئی چودہ ہزار اشعار ہیں۔ عام خیال ہے کہ انوری نے ۸۷۷ھ کے قریب وفات پائی لیکن علامہ مرزا محمد قزوینی کی تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ وہ ۸۵۶ھ کے لگ بھگ فوت ہوا۔ اس کے بعد کی کوئی تاریخ قرین صواب نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔

سوال: ادیب صابر کی زندگی کے حالات مختصر طور پر بیان کیجئے اور اس کی شاعری کا جائزہ پیش کیجئے۔

جواب: شہاب الدین ادیب صابر بن اسماعیل ترمذی کا رہنے والا تھا۔ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں وہ نیشاپور کے مقام پر خراسان کے حاکم کے دربار میں ملازم تھا۔ اس کی قابلیت اور ذہانت اور قادر الکلامی کا شہرہ دربار خراسان سے نکل کر ملک کے اکثر حصوں میں پھیل گیا۔ یہ شہرت سلطان سنجر کے کانوں تک بھی پہنچی۔ وہ ادب نواز تو تھا ہی فوراً حکم دیا کہ ادیب صابر کو بلا کر درباری شعرا کے زمرے میں شامل کیا جائے۔

روش کے اعتبار سے وہ زیادہ تر غزلی اور فحش کا پیرو ہے اور مستود سعد اور مغزی کا عقیدت مند ہے۔ عربی زبان پر

یوری پوری قدرت حاصل تھی۔ اس زمانے کے بڑے بڑے شعرا و ادبا کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات تھے مثلاً اسدائی۔ عروسی سمرقندی، انور سی۔ و طوطا و غیرہ کے ساتھ دوستی تھی۔ صابر قسمت کا قائل تھا۔ اور اپنے آپ کو حادثات کے ہاتھوں مجبور و معذور سمجھتا تھا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

روزگار حذر کن ز کردگار بترس      و گرت برہمہ آفاق دسترس باشد  
چوں روزگار بر آشفست و کردگار گرفت      زوال دولت تو دوریکے نفس باشد

ادیب صابر کی موت بہت دردناک طور پر واقع ہوئی۔ اتسر خوارزم شاہ نے جب خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے سب کے خلاف سرتابی کی تو سلجوق بادشاہ نے ادیب صابر کو خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجا تاکہ وہ مصالحت کی کوئی صورت نکالے یا کوئی خفیہ اطلاع ہم پہنچائے۔ اگرچہ خوارزم شاہ ہی دربار میں اس کا خیر مقدم کمال گرمجوشی سے نہیں کیا گیا تھا تاہم کوئی ایسی بے اعتنائی بھی نہیں برتی گئی تھی۔ ادیب صابر نے سب کے خدمت میں ایک سازش کا انکشاف ارسال کیا۔ اس سازش سے مطلوب تھا سلطان سب کے قتل۔ اسے ادیب صابر کی لاپرواہی کہنے یا بد قسمتی کی انتہا کہ اتسر کو اس کے مراسلے کا علم ہو گیا۔ انتقام کے طور پر خوارزم شاہ نے ادیب صابر کو دریائے جیحون میں ڈبو دیا۔ تذکرہ نویسوں نے یہ حادثہ جانکاہ ۱۱۴۱ھ اور ۱۱۴۲ھ کے درمیان بیان کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی ۵۲-۱۱۵۱ھ لکھتا ہے۔ صاحب تاریخ جہانکشاہ ۱۱۴۱ھ میں یا اس سے بھی پہلے اور ڈاکٹر ایتھے ۱۱۴۳-۱۱۴۴ھ میں۔ ڈاکٹر ایتھے کا

خیال قرن صواب معلوم ہوتا ہے۔

ادیب صابر کے کلام میں کئی خاص خوبیاں ہیں۔ لیکن اس قدر نہیں کہ وہ اپنے شہرہ آفاق ہمعصرین مثلاً امیر معزنی یا انوری کے پہلو پر پہلو کھڑا ہو سکے۔ تاہم حیرانی کی بات ہے کہ ایک بار انوری بے ادیب صابر کے ساتھ کوئی مشابہت رکھنے پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وطواط کو نسبتاً زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔ التبر خوارزم شاہ سلطان سنجری کی طرف سے غلام ہزارا سب وغیرہ کا حاکم تھا۔

صابر نے پُر لطف اور دلکش غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور ان غزلیات کی چند امتیازی خصوصیات ہیں۔ وہ جوش و خروش کے ساتھ عشق کا نغمہ الاپتا ہے۔ مستی اور بے خودی کا رنگ غالب ہے عیش و نشاط کی تلقین کرتا ہے۔ ماضی کے تفکرات اور آلام کو بھولنے اور مستقبل کے خطرات سے لاپرواہی اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ عمر خیام کے فلسفہ، تعیش کا قائل و عامل ہے۔ کسی روح کو آزار پہنچانے کا مخالف اور نیکی و ہمدردی کا حامی ہے۔

سوال: رشید الدین محمد معروف بہ وطواط کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالئے۔

جواب: رشید الدین محمد عبد الجلیل العمری المتخلص بہ وطواط ۷۸۶ھ میں پیدا ہوا۔ وطواط ابابیل کو کہتے ہیں اور یہ نام اسے بہت چھوٹے قد کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ جو بعد میں اس نے تخلص کے طور پر اختیار کر لیا۔ سلجوقی عہد کے شعراء میں وطواط کو ایک ممتاز درجہ

حاصل ہے۔ وطواط کی ترقیوں کا زمانہ سلجوق خاندان کے آخری عظیم القدر بادشاہ سنجر (۱۱۱۹ء تا ۱۱۵۷ء) کے عہد حکومت کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ خوارزمشاہی خاندان کے بادشاہ سلطان اتغر (۱۲۰۷ء تا ۱۲۲۵ء) کی اسے خاص سرپرستی حاصل تھی وطواط اپنے شجرہ نسب کو خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاتا تھا۔

وطواط نے کچھ دنوں مدرسہ نظامیہ بلخ میں بھی تعلیم پائی تھی۔ اس کے اساتذہ میں ایک امام ابو سعید ہروی بھی تھے۔ وطواط نے فارسی اور عربی علم و ادب میں مہارت تامہ پیدا کی۔ اس نے کتابت یادگیری کو باقاعدہ طور پر اپنا پیشہ بنا رکھا تھا حتیٰ کہ اسے الکاتب بھی کہا جاتا تھا۔

سلطان اتغر خوارزم شاہ کے دربار میں مستوفی یعنی کاتب و دیر کی خدمت پر مامور تھا۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ایک کامل شاعر کا رتبہ رکھتا تھا۔ تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی میں مذکور ہے کہ وہ ایک کامل شاعر کا رتبہ رکھتا تھا۔ ایک بار نہایت گرم بحث کے دوران میں سلطان اتغر نے وطواط کے حقیر قد کی طرف مزاحیہ اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اس قلمدان کو آگے سے ہٹا دو تاکہ میں دیکھ سکوں کہ اس کے پیچھے کون بیٹھا ہے۔“ وطواط نے فوراً اٹھ کر جواب دیا کہ ”انسان اپنے دل اور زبان کی بدولت بڑا ہوتا ہے تاکہ قد و قامت کے لحاظ سے“

وطواط گنجا بھی تھا۔ ایک دن سلطان اتغر کے حضور میں وطواط ساغر و گل لینے کے لئے اُٹھا۔ سلطان نے ازراہ مذاق کہا:۔

”بیٹھ بھی جا کہ تو ہمارے لئے خود ہی ساغر (شاعر) اور گل (گل گنج) ہے۔“ ایک شعر سلطان اتسز کے نام سے منسوب ہے جس میں اس نے شاعر و طوطا کی مزاحیہ انداز میں تعریف کی ہے۔  
 از فضل سرت بر آسماں میساید زان بر سر تو موسیٰ ہمے پر ناید  
 تاریخ جہانکشائے یونانی سے و طوطا کے متعلق بہت اہم کیفیت حاصل ہوتی ہے جب ۴۷۷ء میں اتسز خوارزمشاہ نے اپنے ولی نعمت سلطان سنجر سلجوقی کے خلاف بغاوت کر دی تو سنجر نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ خوارزم پر چڑھائی کر دی اور قلعہ ہزار اسپ میں اتسز کو محصور کر لیا۔ سلطان سنجر کا ملک الشعر النوری بھی اس کے ہمراہ تھا۔ بادشاہ کے حکم سے اس نے ایک رباعی لکھی جسے ایک تیر کے ذریعہ سے قلعہ کے اندر بھیج دیا گیا۔ رباعی یہ تھی۔

اے شاہ! ہم ملک و زمیں حسبِ تراست  
 و ز دولت و اقبالِ جہاں کسبِ تراست

امروز بیک جملہ ہزار اسپ بگیر  
 فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست  
 اُدھر اتسز کے ساتھ و طوطا بھی قلعے میں موجود تھا۔ اتسز نے شاعر کو حکم دیا کہ اس رباعی کا موزوں جواب فی البدیہہ لکھا جائے چنانچہ ذیل کی رباعی تیر کے ساتھ بندھوا کر قلعے سے باہر پھینکی گئی۔  
 اے شہ کہ بجا مت مے صافیت نہ درد  
 اعذائے ترا ز غصہ خوں باید خورد



گر خصم تو اسے شاہ شود رستم گرد  
 یک خرزہ ہزار اسپ تو نتواند برد  
 سب کو اس بے باکانہ جواب پر بہت غصہ آیا اور اس نے  
 قسم کھائی کہ جب قلعہ فتح ہو جائے گا تو اس کم بخت و طواط کے  
 سات ٹکڑے کرادوں گا۔ بالآخر جب اتسز مقابلے کی تاب نہ لاکر  
 قلعہ سے فرار ہو گیا تو سب کو فتح نصیب ہوئی اور طواط کو کسی کو نے  
 کھڑے سے نکال کر سب کے حضور میں پیش کیا گیا سلطان نے اپنی  
 قسم کے مطابق حکم دیا کہ اس شاعر کے سات ٹکڑے کر دیے  
 جائیں۔ خواجہ منتخب الدین بدیع الکاتب نے عرض کی کہ حضور  
 و طواط تو ایک حقیر سا پندار ہے۔ نہایت مناسب ہوگا اگر اس  
 کے صرف دو ٹکڑے کرنے کا حکم دیا جائے۔ سب کو یہ جواب اس قدر  
 پسند آیا کہ و طواط کی جان بخشی کر دی۔ و طواط یہاں سے بھاگا  
 بھاگا اتسز کے پاس پہنچ گیا اور مرتے دم تک اسی کی خدمت  
 میں حاضر رہا۔

۵۲ھ میں اتسز نے کسی بات پر خفا ہو کر و طواط کو  
 جلاوطن کر دیا یہاں تک کہ اُسے جان سے مارنے کی نیت بھی  
 کر بیٹھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب غریب شاعر نے مندرجہ ذیل اشعار  
 اتسز کو مخاطب کر کے لکھے تو اس کی خطا معاف ہوئی اور دربار میں  
 واپس بلا لیا گیا۔

سی سال شد کہ بندہ بصفِ نعال در  
 داند خدائے عرش کہ ہرگز نہ ایستاد  
 بدست ملج خوان تو بر تخت مدح تواد  
 چوں بندہ ملج خوانے در سبج بارگاہ

اکنوں دلت ز بندہ سی سالہ شد ملول دروں بہ طول مدت یا بد ملال براہ  
 لیکن مثل ز تند چوں مخدوم شد ملول جوید گناہ بندہ بے چارہ بے گناہ  
 وطوآط کی جرأت زبان درازی اور بیباک گوئی کے متعلق کئی  
 قصے مشہور ہیں۔ قزوینی نے اپنی کتاب آثار البلاد میں لکھا ہے کہ  
 سلطان اتسز کو وطوآط سے اس قدر دل بہشتگی تھی کہ اس نے  
 اپنے محل کے سامنے وطوآط کے لئے ایک عمالیشان محل بنوا رکھا  
 تھا تاکہ سلطان کا جس وقت جی چاہے اس سے بات چیت  
 کر سکے۔ ایک بار اتسز نے مذاق سے ساتھ کہا کہ ”وطوآط تمہاری  
 کھڑکی سے بھڑیئے کا سر نکلا ہوا ہے۔“ بھلا وطوآط کوئی کم حاشر  
 جواب یا نڈر تھا۔ جواب دیا۔ ”بادشاہ سلامت! یہاں کوئی بھڑیا  
 تو نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے کھڑکی میں ایک شیشہ  
 لگا رکھا ہے۔“

اتسز نے ۱۱۵۶ء میں وفات پائی۔ اس موقع پر وطوآط نے  
 بیرباغی لکھی۔

ششاہا فلک از سیاست می لرزید پیش از بطوع بندگی می دزدید  
 صاحب نظرے کجا است تادرنگرد تا ہمہ این سلطنت بدیں می ارزید  
 اتسز کے بعد اس کا بیٹا سلطان ارسلان (۱۱۵۶ء تا ۱۱۷۱ء)

تخت نشین ہوا۔ ارسلان کے بعد سلطان تکش بادشاہ بنا۔ اس  
 نے ایک بار وطوآط سے کہا کہ مجھے ایک ایسی رباعی کے ذریعہ نصیحت  
 کریں کہ جس میں میرے دادا، باپ اور خود میری خصوصیت کا ذکر  
 ہو، وطوآط نے بڑھاپے کی کلفت اور اعضائے رئیسہ کی کمزوری

کے باوجود یہ رباعی چھپت کر دی۔

جدت ورق زمانہ از ظلم بنشست عدل پدیرت شکستہا کر و درست  
اے برتوقیائے سلطنت آمدہ چھپت ہاں تاجپہننی کہ نوبت دولت نشست

ایا قوت کے مطابق و طوآط نے ۷۷۱ھ میں وفات پائی  
دولت شاہ سمرقندی نے و طوآط کی تاریخ وفات ۷۸۲ھ بتائی  
ہے۔ یاقوت کا بیان ذرا زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔

و طوآط کا فارسی دیوان کوئی سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔  
اس میں زیادہ تر مدح کے قصائد ہیں۔ و طوآط کے ۷۹۱ مرسلات  
جو عربی زبان میں ہیں اور سرکاری معاملات کے علاوہ ذاتی خط و  
کتابت سے بھی تعلق رکھتے ہیں بمقام قاہرہ طبع ہو چکے ہیں۔

و طوآط نے قرخی کی کتاب ترجمان البلاغت کے نمونے پر  
صنائع بدائع شاعری کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے  
حدائق السحر۔ اس کتاب کی کئی خوبیوں کے علاوہ ایک مفید مطلب  
خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ اس میں قدیم شعرا کے کئی اشعار  
بطور سند، حوالہ یا مثال کے پیش کئے گئے ہیں۔

و طوآط کی ایک اور تصنیف موسوم ”صد کلمہ“ ہے۔ اس  
میں حضرت علیؑ کے ایک سو زبیریں اقوال فارسی اشعار میں نظم کئے  
گئے ہیں۔ و طوآط کو عربی زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ اس کا نتیجہ  
یہ ہوا کہ اس کے اظہار خیالات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ اس  
کے ساتھ ساتھ یہ اثر بھی رو پذیر ہوا کہ اس کے کلام میں صنائع و بدائع  
اور قدیم طرز ادا کی بھرمار آگئی یہاں تک کہ زمانے کی رو کے پہلو پہلو

اس نے بھی اسلوب بیان کو حسنِ تخیل پر ترجیح دی اس کے کلام میں دیگر صنعتوں کے علاوہ صنعتِ تریصیح بہت کثرت کے ساتھ ملتی ہے۔ مراسلات میں تصنع کے علاوہ عبارت تک بھی مغلق ہے۔ اس سے یہ مطلب اخذ نہ کرنا چاہئے کہ وطواط ہر وقت رجمانِ زمانہ ہی کو پیش رکھتا۔ ہرگز نہیں۔ جہاں اس کے کلام میں دُور از کارِ تشبیہات اور مہرِ تصنع استعارات ہیں وہاں حدتِ خیال اور نزاکتِ ادا کی جھلک بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ اس کے اشعار میں دلکش رنگینی ہے۔ علمِ عروض پر اس کی کتابِ حدیقہ کو ایک مستقبلِ سند خیال کیا جاتا ہے۔ قصائد نگاری میں اُسے ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ اور وہ کبھی بھی اپنے پیشرو مدح نویسوں سے پیچھے نہیں رہتا۔ قصیدہ مدحیہ کی اصلی کیفیت یہ ہے کہ شاعر اُسے طبیعت پر زور دے کر پیدا کرتے ہیں۔ مبالغوں کی سرحد سے کہیں دوزِ کلی جاتے ہیں۔ ان میں جوشِ خیال اور مطابقتِ بیان کا فقدان ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو قصیدوں کو تاثیر سے عاری کر دیتی ہے۔ گویا آج اگر ہم وطواط کو جانتے ہیں تو حدائقِ السحر کی وجہ سے نہ کہ اس کے ناپائدار قصیدوں کے سبب۔

سوال: ظہیرِ فاریابی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ لکھئے۔

جواب: ابو الفضل طاہر بن محمد ظہیر الدین فاریابی فاریاب میں پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔ علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔ عربی زبان بھی سیکھی۔ نجوم اور حکمت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ شاعری میں کمال حاصل کیا۔ فارسی کے علاوہ

عربی میں بھی شعر کہنے لگا۔ کسی قدر تعلیٰ کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ  
 کمال دانش من کو ردیدہ کرشنید بنظم و نثر چہ در پارسی چہ در تازی  
 ظہیر کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ایران کے بڑے  
 بڑے شہروں اور مشہور علاقوں کا سفر کیا۔ اس میں نیشاپور، یازندران  
 اور آذربائیجان کی سیاحت بھی شامل ہے۔

ظہیر زمانے کی ہوا کے رخ کے مطابق قصیدہ گوئی پر مائل ہوا  
 اور اس فن میں نام پیدا کیا۔ اپنے ہم عصر بادشاہوں اور امیروں،  
 وزیروں کی مدح سرائی کی۔ مثلاً ان میں مندرجہ ذیل سلاطین و امرا  
 کے نام قابل ذکر ہیں:-

نیشاپور کا حاکم طغان شاہ، محمد بن ایلدگیز، قزل ارسلان،  
 یازندران کے باوندی خاندان کا بادشاہ حسام الدولہ اردشیر، آذر  
 بائجان کا اتابک نصرۃ الدین ابوبکر۔

جب ایک قصیدہ گو شاعر مطلب برآری میں ناکام رہتا ہے  
 یعنی مناسب صلہ اور انعام و اکرام سے محروم ہوتا ہے تو بالعموم وہ  
 شکوہ و گلہ پر اتر آتا ہے۔ ظہیر ان شعرا میں شامل ہے جنہوں نے ایسے  
 قصیدے لکھے۔

ظہیر کے قصائد سے بخوبی ظاہر ہے کہ اس نے مصیبت اور  
 افلاس کی زندگی بسر کی۔ اور اکثر مسافرت اور پردیس کے آلام و  
 واقعات جھیلے۔

منم امروز دلی زانده گیتی بدویم      بیم آنست دلم را کہ بجاں باشدیم  
 حکم آن کہ خرابست صاحب الامروز      زرد باد حوادث وجود را بنیاد



و در نگر کا ندر و چون کسے از چرخ در پی ترتیب خورد و خواب نیابد  
آخر نا کام و نامراد ہو کر ظہیر نے مدح سرائی ترک کر دی۔  
۹۸ھ میں تبریز کے مقام پر وفات پائی اور مقبرہ شعرا میں  
مدفون ہوا۔

ظہیر ایک بلند پایہ قصیدہ گو تھا۔ اعلیٰ معیار کے قصائد لکھے  
اسلوب فن، بلندی تخیل، نزاکت مضمون اور صنائع بدائع کے  
اعتبار سے اس کے قصیدے متقدمین اور متوسطین کے پایہ کو  
پہنچتے ہیں۔ بعض قصیدے انوری اور خاقانی کے قصائد سے ٹکر لیتے  
ہیں۔ اس کے قطعات بھی خوب ہیں اور غزلیں بھی عمدہ اور پر لطف۔  
مجدد ہنگام سے انوری کا ہم پایہ مانتا ہے۔

سوال: جمال الدین اصفہانی کی زندگی مختصر طور پر بیان  
کیجئے اور اس کے کلام کی خوبیاں واضح کیجئے۔

جواب: جمال الدین محمد بن عبد الرزاق اصفہانی چھٹی صدی  
ہجری کا شاعر ہے۔ اصفہان میں پیدا ہوا اور وہیں اپنی زندگی کا بیشتر  
حصہ گزارا۔ جمال الدین کو سیر و سیاحت کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ اس  
نے مازندران، آذربائیجان اور گنجد کا سفر کیا۔ اس کی زبان میں لکنت  
تھی (بولنے میں تھکلاتا تھا) جیسا کہ اس کے اشعار سے معلوم  
ہوتا ہے۔

گویند کج زبانم کج باش گوزبان چون بہت در معانی و در لفظ استوار  
طوف کلاہ خواباں خود کج نکوتر است ابروئے زلف دلبر کج بہتر و دوتا  
جمال کے کلام سے اور بھی نجی زندگی کے واقعات کا پتہ چلتا

ہے مثلاً ایک بار اس کی آنکھوں میں سخت درد ہوا۔ اور چھاپے پڑ گئے۔

اس واقعہ کو وہ مزاحیہ انداز میں یوں بیان کرتا ہے۔  
 طفلِ بصر در آبلہ گشتست شیرخوار صد بار پیش خور تو گوئی کہ ناشناست  
 در خون من شد آبلہ و من ز ابلہی بر دیدہ می نشا نمش این خود چه تو نیست  
 اس کے کلام سے اس کے اخلاق و کردار اور خیالات کی جھلکیاں

بھی ملتی ہیں۔ مثلاً وہ درویشانہ طبیعت رکھتا تھا اور مال و زر کی ہوس  
 نہ رکھتا تھا۔ وہ دولت اور ثروت پر عزت نفس اور خود داری کو ترجیح  
 دیتا تھا۔ وہ ایمان اور ضمیر کو سب سے بڑی پونجی سمجھتا تھا۔

اس ہمہ لاف مزن گرچہ ترسیمِ دُرست کہ زر و سیم بر اہل خرد محقر است  
 مرد و آزادانِ شد کہ ہی دست آمد غنچہ دل تنگ بد آنست کہ در بند زراست  
 اس میں شک نہیں کہ اس نے بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کی

مدح سرائی کی ہے اور مبالغہ سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن اس کی آزاد ملشتی  
 اور درویشی صفتی کی جھلک جا بجا نمایاں ہے۔ اور کمینوں کے آگے  
 تو اس نے کبھی بھی اپنی گردن جھکانا گوارا نہیں کیا۔

کہ نزد ہمت من بس تفاوتے نکند از آنچہ چرخِ یمن داد یا ز من بر بود  
 مرا تواضعِ طبعی عزیز آمد یک مذلتیست تواضعِ بزر و سیفِ نمود  
 جمال الدین عراقی قصیدہ گو شعر کا سرتاج ہے تشبیہات اور

مضامین کے اعتبار سے وہ متقدمین کی روش پر چلتا ہے۔ انوری،  
 خاقانی اور نظامی وغیرہ اس کے ہم عصر تھے اور اس کا کلام ان کی شعری  
 سے متاثر ہوا ہے۔ لیکن اس کا سبک خراسانی ہے۔ اور زبان متاخرین  
 کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے کلام میں خاقانی اور انوری کی سی

تعقید لفظی و معنوی نہیں پائی جاتی۔ اس کی شاعری زیادہ صاف، سادہ اور زود فہم ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے اشعار میں مبالغہ آمیز مضامین کی کمی ہے یا لفظی و معنوی صنائع نہیں ہیں۔ اس کے کلام میں ادبی دلکشی اور لطیف نکتہ بیانی موجود ہے۔ اس کی شاعری میں فصاحت اور شیرینی کا جوہر نمایاں ہے وہ قصیدہ میں بلا تشبیب اور تغزل سیدھا حمد و سحر کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔

قصیدوں کے علاوہ اس نے غزلیں اور ترجیع بند بھی بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ اس کے بیشتر قصائد عراق کے سلجوقی سلطانین مثلاً ارسلان بن طغرل اور اس کے بیٹے طغرل کی تعریف میں ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے آذربائیجان کے آتابک جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز اور کچھ باوندی امیروں کی بھی مدح سرائی کی ہے اس نے اصفہان کے دو بڑے خاندانوں آل خند اور آل ضاعد کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں۔

مدحیہ قصیدوں کے علاوہ اس نے بعض امرا اور علما کے مرثیے بھی کہے ہیں۔ یہ مرثیے بڑے پیر تاثیر اور رقت انگیز ہیں جمال الدین نے بعض قصائد حکمت اور پند و موعظت پر بھی لکھے ہیں۔ کچھ اشعار بڑے عبرت انگیز ہیں۔ بلند ہمتی اور نفس کشی کی تلقین کرتے ہیں۔ عجز و انکسار اختیار کرنے، حقیقت اور روحانیت کی کھوج کرنے، ظاہر پرستی اور نمود و نمائش سے اجتناب کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔

بحاک بازده ایں خاک سوئے علوی گرد      کہ جان پاک سزانیست جز بعالم پاک  
بحال میر و بدل زنده گرد و دائم ماں      کہ جان زنده دلاں راز مرگ ناید پاک

طاہر فرماں آید شفق بر غلین اور  
آب در حلق ضعیفان از کرم چوں نوش ساز  
گر تکبری کنی با خواجگان سفلہ کن  
چوں کسی درد دلی گوید ز راز احوال خویش  
مصلحت از لفظ دین را نہ کامل عقل بجوی  
مشورت بآراء نزدیکان دور اندیش کن  
اخلاقی اشعار دیگر فنی خوبیوں کے علاوہ لطف خیال - دقت نظر اور  
ندرت تشبیہ کے حامل ہیں۔

ماں باپ کی عزت روار کھنا ہر انسان پر فرض اولین ہے اور  
دنیا میں بڑے سے بڑے علما محکمہ اور ادبا نے ماں باپ کی خدمت کو  
سب سے بڑی سعادت قرار دیا ہے۔ چنانچہ جمال الدین اس مضمون  
کو یوں ادا کرتا ہے۔

حق مادر نکا ہدار و ترس زایزد و الجلال و لا کرام  
کانکہ با مادر و پدر بد کرد نبود جز ہمیشہ دشمن کام

سوال: ابوالفرج رونی کی زندگی اور اس کے کلام کی  
خوبیوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

جواب: ابوالفرج بن مسعود رونی <sup>۱۰۳۳</sup>ھ کے لگ بھگ روتہ  
میں پیدا ہوا ہے۔ حمد اللہ مستوفی صاحب "تاریخ گریہ" نے لکھا ہے  
کہ روتہ خراسان میں واقع تھا۔ لطف علی خاں آذر صاحب آتش مکہ  
نے اور صاحب مجمع الفصحائے روتہ کو نیشاپور کے متلع میں ایک  
گاؤں بتایا ہے۔ علامہ محمد قزوینی نے نظامی عروضی سمرقندی

کی مشہور کتاب ”چہار مقالہ“ کے حواشی میں لکھا ہے کہ روتہ کو ایران کی سرزمین میں خیال کرنا غلطی ہے۔ اس کے ثبوت میں آپ نے لباب الیاب کے مصنف عتقی اور تذکرہ ہفت اقلیم کے مصنف امین احمد رازی کو سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس سند کے مطابق روتہ لاہور شہر کے پاس کا کوئی ٹکاؤں ثابت ہوتا ہے۔ اس اختلاف کو عتقی کا سب تذکرہ نویسوں کی نسبت زیادہ قدیم اور مستند ہونا کافی تقویت دیتا ہے۔ لیکن آقا محمد علی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ روتی کا ایران کی سرزمین سے اٹھنا زیادہ مسترین قیاس ہے۔ کیونکہ نیشاپور کے نزدیک اب بھی ایک گاؤں موجود ہے جس کا نام روتہ ہے۔ اس کے مقابلے میں پنجاب کی غالباً سب سے زیادہ مستند جغرافیائی تاریخ ”خلاصۃ التواریخ“ جو الہ آباد میں چھپی ہے روتہ کے بارے میں بالکل خاموش ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روتہ لاہور کے پاس نہیں تھا۔ اس غلط فہمی کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ روتی کچھ عرصہ کے لئے لاہور میں ٹھہرا تھا۔ مغل دربار کا مشہور شاعر فیضی روتی کا بہت زیادہ قائل رہا۔ فیضی کہتا ہے ہ

ذوقے کہ تراں گرفت از شعر از شعر ابوالفرج گرفتیم  
ہندوستان کے مشہور اہل قلم مسعود بن سعد بن سلمان  
نے روتی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا وہ لکھتا ہے ہ  
لے خواجہ ابوالفرج! بکنی یاد من تا شاد گردد ایں دلِ ناشاد من  
نادم بدایں کہ ہستم شاگرد تو شادم بدایں کہ ہستی استاد من



اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ فارسی قصیدہ نگاروں کا بادشاہ انوری تک شروع شروع میں رونی کے کلام کو سامنے رکھ کر اشعار کہتا تھا۔ انوری نے خود تسلیم کیا ہے کہ

باز معلومش کہ من خادم بشعر بوالفرج تا بدیدتم ولو عی داتم بس تمام  
 ابوالفرج رونی نے اوائل عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا سب سے پہلے اس نے محمود غزنوی کے پوتے سلطان مسعود کے بیٹے سلطان ابراہیم کی تعریف میں قصیدے لکھنے شروع کئے۔ سلطان ابراہیم نے ۵۸۸ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان جلال الدولہ مسعود سوم بن ابراہیم تخت نشین ہوا۔ میر خوند صاحب روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ رونی سلطان مسعود بن ابراہیم کی مدح میں بھی قصیدے لکھتا رہا۔ سلطان مسعود بن ابراہیم کا چھوٹا بھائی سیف الدولہ محمود حاکم ہند رونی پر سب سے زیادہ مہربان رہا اور اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ لطف علی بیگ آذر لکھتا ہے کہ جب سلطان مسعود نے سیاسی سازش کے احتمال کی بنا پر شہزادہ محمود کو قلعہ غزنی میں قید کر دیا تو رونی لاہور چلا آیا تھا تا کہ کہیں اس پر بھی سازش کا الزام عائد نہ ہو جائے۔ رونی کی وفات ۶۰۴ھ کے قریب ہوئی۔

رونی کے مطبوعہ دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ کلام ضرور تلف ہو گیا ہے یا سہواً اس میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ اس دیوان میں چار ہزار کے قریب اشعار ہیں۔

رونی نے قصائد نگاری میں ایک مستقل روش نکالی۔ یہاں تک کہ انورسی ایسے بلند پایہ قصیدہ گو کے کلام میں رونی کی پیروی کی جھلک نظر آتی ہے۔ رونی کے اشعار کا خاص جوہر پروازِ تخیل رنگینی، استعارات اور لطیف صنائعِ بدائع ہے۔ خیال اور طرزِ ادا کے لحاظ سے رونی اور اس کے پیشرو اساتذہ میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ یہی اسے ان پر بحیثیت مجموعی کوئی فوقیت حاصل ہے۔ یاں یہ ضرور ہے کہ بعض اشعار میں وہ ان سے کچھ آگے نکل جاتا ہے اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر انورسی اور فیضی ایسے مسئلہ استاد بھی اس کی شاگردی کا دم بھرنے کو عار نہیں جانتے۔

عام روش کے مطابق رونی بھی اپنے قصیدوں کو اکثر تغزل کے ساتھ شروع کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ قصیدہ کے دوران میں مناظرِ فطرت کی تصویریں بھی کھینچتا ہے۔ رونی کے قصائد میں تاریخی اشارے بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ اکثر غزنوی سلاطین کی لڑائیوں کا ذکر کرتا ہے۔

سوال: محمد بن علی سوزنی کی زندگی اور اس کے کلام پر نوٹ لکھئے۔

جواب: محمد بن علی سوزنی شہرِ نسف میں پیدا ہوا۔ اور بخارا میں علوم کی تحصیل کی مولانا جامی کا کہنا ہے کہ سوزنی کی طبیعت میں تمسخر و استہزا کا مادہ فطری تھا۔ اُسے سچو گوئی کا موجب کہا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے اربابِ متانت کی توجہ اس فنِ مستقل کی

طرف نہیں آئی تھی۔ اس فن کی بدولت سوزنی نے فارسی ادب میں اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔

سوزنی کا شمار چھٹی صدی ہجری کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے اس نے اپنے قصیدوں میں سمرقند کے امرا و وزرا کی مدح کی ہے۔ مختار غزنوی، عمتی بخاری، شمس طبری وغیرہ کی طرح اس نے ملوک قانیہ کی بھی مدح سرائی کی ہے۔

سوزنی اپنی خوش طبعی، ظرافت، ہزل گوئی اور رکیک نگاری کے سبب انورجی کے معاصر شعرا میں شہرت رکھتا ہے۔ آخری عمر میں توبہ نصوح کے بعد سوزنی نے حج کیا ہے چار چیز آوردہ ام یارب کہ در گنج تو نیست

حاجتی و نیستی، جرم و گنہ آوردہ ام! ہجویات کو خیر باد کہہ کر حکیم سنائی کی شاگردی اختیار کر لی۔ اماموں کی تعریف میں نظمیں کہیں۔ توحید، نصائح، زہدیات اور معارف کے مضامین پر بھی نہایت عمدہ قصیدے لکھے۔ سوزنی کے شاگردوں میں سے لامعی بخاری، جنتی، شمس حالہ اور شطرنجی مشہور ہیں۔

سوزنی کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے روانی اور سادگی ۵۶۹ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام :-

رفتم براہ دیو قدام بدام او      وز دیو دیو تر شدم از سیرت تباہ  
یک روز بے گناہ نبودم بعمر خویش      گویا کہ بودی گنہی نزد من گناہ

فردا بروز حشر کہ امروز منکرم اعضائے من شوند بر اعمال من گواہ  
 پیری رسید و موئے سیاہت سفید شد یار سفید و رو سیہ موئے را مخواہ  
 سوال: عمیق بخاری کی زندگی اور شاعری پر مختصر نوٹ لکھئے:  
 جواب: شہاب الدین عمیق بخاری ایک مشہور قصیدہ گو شاعر  
 گذرا ہے۔ اس نے ملوک افراسیابہ یا ایلک خانیوں کے ایک حکمران  
 ابو الحسن شمس الملک نصر کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کے علاوہ  
 اس خاندان کے ایک اور بادشاہ خضر خاں کے دربار میں اُسے خاص  
 تقرب حاصل ہوا۔ اور اس کا امیر الشعرا بن گیا۔

عمیق کی تاریخ ولادت کا علم نہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ  
 وہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا اور بڑی طویل زندگی  
 پائی۔ چنانچہ ۳۲۷ھ میں جب سلطان کی بیٹی فوت ہوئی تو اس کے  
 ماتم میں مرثیہ لکھنے کے لئے بوڑھے شاعر کو طلب کیا گیا لیکن وہ انتہائی  
 ضعف کے باعث حاضر نہ ہو سکا۔ عمیق کی پیری اور ضعف کی تصویر  
 اس کے مذکورہ ذیل اشعار سے ملاحظہ ہو۔

اگر موئے سخن گوید و گریوئے زان دارد من آن مور سخن گویم من آن مویم کہ جاں دارد  
 اگر بامور و باموئی شب روزے شوم ہواہ ز مور از من خبر یا بد نہ موی از من نشان دارد  
 بچشم مورد ز زنج زاری و بس مستی اگر تو ہا ہر اموری ہو اندر نہاں دارد  
 عمیق بخاری کے قصیدے لطیف تشبیہات چستی بندش۔ شیرینی  
 تراکیب وغیرہ کا نمونہ ہیں۔ درد و سوز بھی اس کی شاعری کی نمایاں  
 خصوصیت ہے۔ روانی اور تاثیر بھی اس کے کلام کا جوہر ہے۔ اس  
 کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انوری ایسے بنیابیہ

شاعر نے اُسے استادِ سخن تسلیم کیا ہے۔ دوسرا شیر و طواغ نے اس کے اشعار کو سندا مانا ہے۔ مرثیہ گوئی کے فن میں عمیق کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ اس فن میں جو زور اور اثر اس نے دکھایا ہے اس کی جھلک ذیل کے اشعار سے واضح ہے جو اس نے سلطان سنجر کی بیٹی کے انتقال پر لکھے۔

ہنگام آں کہ گل دمدا ز صحنِ ستاں      رفت آں گل شکفتہ و در خاک شد نہاں  
ہنگام آں کہ شاخ شجر نم کشد زابر      بے آب ماند نرس آں تازہ ارغواں  
عشق نے ۵۲۳ھ میں انتقال کیا۔

نمونہ کلام :

خیزاے بہشتی آں جام را بہار      کارِ بہشت کرد جہاں را بہشت دار  
نقشِ خورشید است ہمہ باغ و بہستان      فرشِ ستبرقا است ہمہ دشت و کوہبار  
ایں افسرِ مرقعِ شاخِ سمن نگر      وین برودہ موجِ گلہائے کامگار  
گلینِ عروس واریا راست خوشتن      وابرش مشاطہ وار ہے شویدا ز غبار  
سوال : خاقانی شروانی کی زندگی کے حالات بیان کیجئے اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے :

جواب : حضرت خاقانی ۴۷۷ھ میں گنجد (شروان) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام افضل الدین بذیل بن علی ہے۔ شروع شروع میں آپ نے حقایقی لقب اختیار کیا۔ بعد میں خاقان اکبر منوچہر بن فریدون شروان شاہ کے ساتھ انتساب کے باعث خاقانی تخلص رکھا آپ کا والد علی نجاری کا کام کرتا تھا۔ آپ کی ماں عیسائی مذہب کی تھی لیکن بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔



خاقانی ملک الشعر ابو العلامی گنجوی کے فاضل ترین شاگرد تھے اور اپنے استاد کی وساطت سے ہی خاقانی کو شروان شاہ منوچہر بن فریدیوں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ ابو العلامی کی بیٹی بھی خاقانی کے نکاح میں تھی لیکن استاد شاگرد کی زیادہ دیر نہ بچھ سکی اور دونوں نے ایک دوسرے کی سچو لکھی۔

خاقانی کی زندگی انتہائی تنگ دستی میں گزری۔ اس افلاس کا ذکر انہوں نے اپنے قصیدوں میں جا بجا کیا ہے۔ بچپن میں ہی باپ کا سایہ منبر سے اٹھ گیا۔ عین جوانی میں وہ اپنے سب سے بڑے سرپرست اور جہربان چچا کافی الدین عمر بن عثمان کی شفقتوں سے محروم ہو گئے۔ بڑھاپے میں جواں سال بیٹا رشید الدین بیس سال کی عمر میں مر گیا۔ ان مصائب کے علاوہ اپنی فضیلت و شہرت کے سبب وہ کئی درباری شعراء و امرا کے حسد کا نشانہ بھی بنے اور اپنے ممدوحین کے عتاب کا شکار ہوئے۔ یہاں تک کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ قید کے دوران آپ نے مشہور نظم ”حبیبہ“ لکھی۔ افغانستان بن منوچہر کے حکم سے ۵۷۵ھ میں جیب قید ہوئے تو ان کی عمر پچاس سال کی تھی جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:

فلک کثر و ترست از خط ترسا مراد و مسلسل را بہ آب  
مرا از بعد پنجہ سال اسلام نزدیکوں صلیبی بند بر پا

۵۸۵ھ میں خاقانی نے مکہ معظمہ کی زیارت کی۔ سفر کعبہ کے دوران انہوں نے ایک نہایت عمدہ قصیدہ لکھا۔ یہ قصیدہ .. بیت الحرام کی مدح میں ہے اور ایک سو نو شعروں پر مشتمل ہے

مکہ کے خواص نے انہیں اس قصیدے پر دلی خراج تحسین ادا کیا۔ ۵۵۲ھ میں مکہ سے مراجعت کے وقت خاقانی کو وزیر جمال الدین اصفہانی نے خلیفہ بغداد کے حضور میں پیش کیا۔ خلیفہ نے ان کی بڑی عزت کی اور دہری کا عہدہ بھی دیا لیکن خاقانی بغداد والوں سے رنجیدہ تھا۔ اس لئے یہ عہدہ قبول نہ کیا اور ایران کو لوٹ آیا۔ خاقانی نے ۵۹۵ھ میں تبریز کے مقام پر انتقال کیا۔

خاقانی کی شہرت کا دار و مدار زیادہ تر قصیدوں پر ہے، تبصرہ :- آپ کا شمار ایران کے مشہور ترین اور اول درجہ کے قصیدہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔ بادشاہ ہر قصیدے پر انہیں ایک ہزار روپیہ اور بیش بہا خلعت عطا کیا کرتا تھا۔ خاقانی کے یہاں عاشقانہ غزلیں بھی خوب ہیں۔ کلام اکثر فصیح اور پند و حکمت سے لبریز ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہجو بھی بہت بلیا کہتے ہیں۔ آپ عربی اور فارسی دونوں میں شعر کہتے اور خط و کتابت کرتے تھے۔

خاقانی کے قصائد میں معانی کی دقت کے علاوہ زبان اور روش بھی دقیق اور مشکل ہے۔ آپ کے کلام کو سمجھنے کے لئے مختلف علوم و فنون، معرفت عقاید گوناگوں، لغات اور اصطلاحات پر عبور ہونا ضروری ہے۔ صنائع بدائع پر بھی شاعر کو قدرت حاصل تھی آپ کے تشبیہات و استعارات نراے اور دلکش ہیں۔ آپ کے اشعار میں جنجیس، حسن التعلیل، لف و نشر، ایہام اور دیگر لفظی و معنوی صنعتیں بکثرت موجود ہیں۔ خاقانی کی شاعری بہت محکم اور استوار ہے۔ زبان کی لطافت اور خیال کی بلندی اور باریکی

قابل قدر ہے۔ آپ دوسرے قصیدہ گو شعرا کی روش سے الگ  
تھلگ ہو کر نئی ڈگر پر چلتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت آپ کے کلام  
کا نمایاں جوہر ہے۔ علمیت کی گہرائی آپ کا خاص وصف ہے۔

خاقانی کی وسعت مطالعہ اور علم و فضل اس بات سے عیاں  
ہے کہ آپ کے کلام میں قرآن مجید کی آیات، ضرب الامثال، کنایات  
و اشارات، علوم و فنون سے متعلق مضامین بکثرت پائے جاتے  
ہیں آپ کی ترکیبیں اور بندشیں بھی اچھوتی۔ آپ کی یہ امتیازی خصوصیت  
خراسان کے شعرا کے کلام کے ساتھ مقابلہ کرنے سے صاف نمایاں  
ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایسی تراکیب ”شہ طوفان عقل“ ”نظافان سر“ ”خوابنا  
شعر“ ”چہین صورت“ ”نکتہ دوشیزہ“ ”درع حکمت“ خاک سپرانِ حسد“  
وغیرہ دوسرے شعرا کے پاس سرے سے نہیں ملتیں یا شاذ و نادر  
پائی جاتی ہیں۔ کلام خاقانی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں  
جا بجا مقامی لہجے کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ آذری  
(آذری یا گجانی) زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔

چونکہ خاقانی کی ماں عیسائی تھی۔ اس لئے انہیں نصرانی عقائد  
انجیل اور عیسائیت کی تاریخ اور اس کی اصطلاحات سے بھی واقفیت  
تھی اس کا اثر بھی آپ کے کلام پر پڑا۔ اور آپ کے کلام کو دوسرے  
شعرا سے ممتاز کیا۔ مثلاً ذیل کے الفاظ نصرانیت کی اصطلاحات  
ہیں جو اس زمانے کے مسطور یوں میں مروج تھیں:- مطران۔ مخران۔  
بطریق مسطور۔ ملا۔ اسقف وغیرہ۔

عیسائیت کے علاوہ ان کے کلام میں اسلامی روایت۔ تاریخی

واقعات اور حدیث وفقہ کے مسائل کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے آپ کے کلام کو صرف ایک عالم ہی سمجھ سکتا ہے جس نے ایرانی ادبیات اسلام کی تعلیمات اور عیسائیت کے عقاید کا گہرا مطالعہ کیا ہو جبناچہ یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ آپ خواص کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے قصائد کی بہت سی تشریحات لکھی گئی ہیں۔ آپ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بھی عبور ضروری ہے۔ آپ کے قصیدے بڑے طویل ہیں بجز یہ بھی لمبی ہیں۔ عام طور پر ردیف بھی ہوتی ہے۔ تشبیب اور تغزل آپ کے قصائد کا لازمہ ہے۔

آپ کے کلام کا خاص جوہر سوز و گداز ہے۔ آپ کے اشعار آپ کے جذبات اور احساسات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ دردِ غم کی تصویریں خوب کھینچی ہیں مناظر نگاری بھی قابلِ داد ہے۔ جزئیات اور تفصیل کا بنیان بھی قابلِ ذکر ہے۔ آپ کے قصائد میں وہ قصیدہ جو ”مدائن“ کی تاریخ اور حستہ حالی پر لکھا گیا سوز و الم کا بہترین اظہار ہے۔ شعر شعر سے عبرت پکیتی ہے۔ زبان کا زور اور جذبات کا طوفان اول سے آخر تک نمایاں ہے۔

سفر کعبہ کے متعلق ایک مثنوی ”تحفۃ العراقین“ کے نام سے لکھی اس میں تین ہزار اشعار نہایت فصیح و بلیغ پر مضمون اور نصیحت آمیز ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مَرخ تو رونقِ قمر بشکست  
عشقِ تمام تر بشکست  
کہ سرِ نیش در جگر بشکست

لبِ تو قیمتِ شکر بشکست  
من خود از غمِ شکستہ دل بودم  
نیشِ مرغان چنان زدی بردم

ہاں لے دلِ عجزت میں از دیدہ نظر کن ہاں ایوانِ مدائن را آئینہٴ عبرت داں  
 یک رہ ز لب و جملہ منزل بہ مدائن کن از دیدہ دوم و جملہ بر خاکِ مدائن ہاں  
 خود جملہ چناں گریہ صد و جملہ بخوں گوئی کز گرمیِ فوٹاشِ کش چکد از مژگان

سرِ میفر از تا کلمہ داراں سرت بے مغز چوں کلمہ نمکسند

سوال: مجیر الدین بلیقانی کی زندگی اور شاعری پر مختصر نوٹ لکھئے۔  
 جواب: مجیر الدین بلیقانی کی زندگی کے بیشتر حالات پردہٴ تاریکی میں پوشیدہ ہیں۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ آذربائیجان کے شمال میں واقع ایک قصبہ بلیقان کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا قصیدہ گو تھا۔ وہ آذربائیجان اور عراق کے امیروں اور تاجکوں کا مداح تھا۔ اور ان سے انعام و اکرام پاتا تھا۔

مجیر الدین خاقانی کا شاگرد تھا۔ لیکن کچھ ناخوشگوار واقعات کے سبب اس کی استاد کے ساتھ چیلقتش ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس نے خاقانی کی ہجو میں شعر لکھے۔ تذکرہ نویسوں کے قول کے مطابق مجیر الدین اصفہان کا صدر بہ دار مقرر ہوا تھا۔ لیکن اچھا حاکم ثابت نہ ہوا تو اہل اصفہان نے اس کی پرواہ نہ کی۔ مجیر نے اصفہانیوں کو ہجو کا نشانہ بنایا۔ اس سے اہل شہر مشتعل ہو گئے اور ایک اصفہانی شاعر جمال الدین عبدالرزاق نے مجیر اور خاقانی دونوں کی ہجو لکھ ڈالی۔ خاقانی کا اصفہان کی ہجو کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے اصفہانیوں کو خوش کرنے کے لئے اصفہان کی مدح میں ایک پُر زور قصیدہ لکھا جس میں مجیر کی ملامت

بھی کی۔ ایک راوی کے بیان کے مطابق اصفہان کے اوباش نے  
میر کو ۸۷۵ھ میں ہلاک کر دیا۔

قصائد کے علاوہ تجمر نے غزلیات، رباعیات اور قطعات بھی  
لکھے ہیں۔ تجمر کا کلام موثر، لطیف اور شیریں ہے۔ لیکن علمیت اور  
روحانیت سے عاری ہے۔ خراسان کے شعر کی طرح اس کے اشعار  
میں صنائع بدائع لفظی و معنوی بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی تشبیہات  
و استعارات دلکش اور اچھوتے ہیں۔ مبالغہ کا مشتاق ہے۔ اس کے  
کلام میں اچھوتے مضامین اور بلند خیالی و نکتہ گوئی کمی نہیں۔  
حذبات نگاری پر بھی اسے عبور حاصل تھا جیسا کہ سلطان ارسلان  
بن طغرل کی مدح میں کہے گئے قصیدوں سے ظاہر ہے۔ امیر  
خسرو دہلوی نے تو اسے خاقانی پر بھی ترجیح دی ہے۔

اپنے استاد خاقانی کی طرح تجمر کی زندگی بھی تنگ دستی اور  
پریشانی حالی میں گذری۔ اپنے ایک قصیدے میں اس نے اپنے  
مصائب و آفات اور دشمنوں کی خست اور طعنہ زنی کا ذکر کیا ہے وہ  
موت کو خود داری کے ترک یا احسان برداری پر ترجیح دیتا تھا جیسا  
کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

تادست خوش جہاں شدم من در دست قنا عتم ممکن !  
خود را بہ ہزار فن گسستم از ہمدیہی جہان پر فن  
از خود زبرائے خود بسازم مانند عنکبوت مسکن  
شد دست از اں شدم کہ در شب خورشید بتا بدم بروزن  
ان اشعار سے شاعر کی خستہ حالی و دشمنوں کا حسد اور



لوگوں کی بے اعتنائی اور زمانے کی ستم گاری ظاہر ہے۔

سوال: نظامی گنجوی کی زندگی کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیجئے اور اس کے کلام کی گونا گوں خصوصیات لکھیے۔  
 جواب: مولانا نظام الدین ابو محمد الیاس بن یوسف گنجوی ۵۳۵ھ (۱۱۴۰ء) میں بمقام گنجدگر (جستنان) پیدا ہوئے۔ آج تک آپ کو افسانوی تنہوی لکھنے میں کوئی شاعر نہیں پہنچ سکا۔ آپ کا خمسہ یا پنج گنج فارسی شاعری کے لئے سرمایہ صد افتخار ہے۔ آپ دنیا کے زندہ جاوید شعرا میں سے ہیں۔ اور ان خوش نصیب باکمالوں کے زمرے میں شامل ہیں جن کی شہرت ان کی زندگی میں ہی چار دانگ عالم میں پھیل گئی اور ان کے مرنے کے بعد دنیا کے ادب میں ان کے نام کی عظمت روز افزوں ہوتی گئی۔

نظامی بچپن سے ہی والدین کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی تھے۔ جو بڑے ہو کر فن شعر گوئی میں پایہ استاد ی کو پہنچے اور جن کا ذکر کتابوں میں قوالی مطری کے نام سے آیا ہے۔ دونوں بھائیوں کی پرورش ان کے چچا نے اپنے ذمے لی لیکن ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ بیچارے لاوارث بھائیوں کو سخت جدوجہد اور کلفت و مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان واقعات کا نظامی کے مستقبل پر یہ اثر پڑا کہ دنیا کی بے ثباتی اور اس کی ناپائیداری اس کے دل پر نقش ہو گئی اور اسی غمگینی اور افسردہ خاطر ی کی

جھلک آپ کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ انہی ابتدائی ایام میں نظامی نے اس علم، مشاہدے اور تجربات کا ذخیرہ جمع کیا۔ جس پر اس کی اولین تصنیف یعنی مخزن الاسرار دلالت کرتی ہے۔ شروع سے ہی نظامی کی طبیعت کا میلان تنہائی، خودداری، راست شعاری اور پاکیزہ روی کی طرف تھا۔ اخلاق کے لحاظ سے ایران کا کوئی شاعر بھی آپ کی گردن تک کو نہیں پہنچ سکتا۔

گرازے شدم ہرگز آلودہ کا  
حلال خدا ہر نظامی حرام  
لیکن خوبی یہ ہے کہ درویش مشرعی اور بے نیازی کے باوجود بھی آپ میں ذرہ بھر غرور یا ترش کلامی نہ آسکی۔ نظامی کے زمانے میں ایران و عراق میں بہت چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں اور ان کے فرمانروا علماء و شعرا کی تربیت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ اسی تحریک کے باعث شاعروں کی تعداد بڑھ گئی اور مدح سراہی، معراج کمال پر پہنچ گئی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن نظامی نے خوشامد گوئی کو گوارا نہ کیا۔ وہ دربارداری سے پاس سے بھی ہو کر نہ گذرے۔ انہیں شعر و شاعری کے مرتبے کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ اسے قصیدے لکھنے میں صرف نہیں کر سکتے تھے۔

پیردہ رازے کہ سخن پرور ہیست  
سایہ از پردہ پیغمبری ست  
پیش و پسے بست صفت کبریا  
پس شعرا آمد و پیش انبیا  
نظامی نے مرتے دم تک اپنے شاعرانہ وقار کو قائم رکھا اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دیا۔ مدح گو شعرا کی نصیحت فرمائی کہ خلافت

ایک ٹھوس جہاد کیا۔ اس لحاظ سے آپ کو ایرانی شاعر میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت حاصل ہے لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے آپ نے شاعری کو اپنا واحد مشغلہ بنالیا تھا۔ اس لئے چاروں اچار کسب معاش کی خاطر کسی مرئی کا دامن پکڑنا ہی پڑا اسی خیال سے آپ نے اپنی بیش بہا مثنویوں کو کسی نہ کسی حاکم وقت کے نام سے معنوں و منسوب کیا۔

آپ کے خمسہ پنج گنج یعنی پانچ مثنویوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مخزن الاسرار۔ یہ نظامی کی اولین تصنیف ہے۔ علم الاخلاق اور تصوف سے تعلق رکھتی ہے۔ حقیقہ سنائی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ ملک فخر الدین بہرام شاہ والی ارزنگان کی خدمت میں پیش کی گئی اور ۵۷۵ھ میں لکھی گئی۔

۲۔ خسرو شیریں۔ فردوسی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد لگ بھگ سات ہزار ہے۔ ۵۷۶ھ کے قریب مکمل ہوئی اور انابیک محمد ہلوان اور اس کے بھائی قزل ارسلان (داتا گمان آذربائیجان) کے نام پر معنون کی گئی۔ یہ پہلا تاریخی شاہکار ہے جس نے نظامی کو افسانوی مثنوی لکھنے کے لئے مجبور کیا۔

۳۔ بیلی مجنوں۔ ۵۸۴ھ میں لکھی گئی اور ابوالمظفر جلال الدین اختستان والی مروان کے نام سے منسوب کی گئی۔ اس میں کوئی چار ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ پس منظر ایران کی بجائے عرب میں رکھا گیا ہے البتہ قصے کے لوازمات کو ایرانی انداز سے نبھایا گیا ہے۔ ۴۔ سکندر نامہ: اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے کا نام اقبال نامہ

ہے اور دوسرے کا نام ہے خرد نامہ۔ یہی دو حصے سکندر نامہ بحری و بری کے نام سے بھی مشہور و موسوم ہیں اور کوئی دس ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ نظامی نے اس کتاب کی پہلی اشاعت کو ۵۸۷ھ میں آتابک عزیز الدین مسعود والی موصل کے نام سے منسوب کیا اور دوسری ایڈیشن کو ۵۹۷ھ میں آتابک نصرۃ الدین ابوبکر حاکم آذربائیجان کی خدمت میں پیش کیا۔ سکندر نامہ بری میں سکندر اعظم کو ایک تاریخی فائنج کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور سکندر نامہ بحری میں اُسے ایک فلسفی اور پیغمبر کے لباس میں آشکار کیا گیا ہے۔ اشعار میں جابجا رنگ تصوف اور مسئلہ وحدت الوجود کی جھلک ہے۔

نظامی کی نینوی سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ یہ مولانا نظامی کے سحر کلام کا ہی کرشمہ ہے کہ مدرسوں کے چھوٹے بچے بھی سکندر اعظم کے نام سے بخوبی واقف ہیں۔ ہندوستان میں اس کتاب کے جتنے فرہنگ اور شرحیں لکھی گئی ہیں شاید ہی کسی اور کتاب کی لکھی گئی ہوں۔ ایران اور افغانستان میں بھی سکندر نامہ داخل نصاب چلا آ رہا ہے۔ سکندر نامہ بری کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵۔ ہفت پیکر یا ہرام نامہ: یہ نینوی ۵۹۳ھ میں لکھی گئی۔ اس میں ساسانی بادشاہ ہرام گور کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں جو سات کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ نظامی کی یہ آخری نینوی ہے۔ اور آتابک نصرۃ الدین ابوبکر حاکم آذربائیجان یا علاؤ الدین کرب ارسلان والی مراغہ کے نام پر معنون ہے۔

حسمہ نظامی کی شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ

اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کی تقلید میں بڑے بڑے اساتذہ فن نے خمسے مرتب کئے اور اس پر فخر کیا۔ ان استادان سخن میں خواجہ کرمانی امیر خسرو، جامی اور فیضی ایسے یکتائے روزگار شامل ہیں۔ یورپ میں بھی خمسہ نظامی کی مختلف شنوایاں اور ان کے ترجمے جا بجا شائع ہوئے ہیں۔ خمسہ کے علاوہ نظامی کا ایک دیوان غزلیات بھی بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس بیان کی صحت میں شک نظر آتا ہے۔ تذکروں میں بعض غزلیں نظامی کی طرف منسوب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس غزلوں اور اخلاقی قصائد کے مجموعے میں کوئی بیس ہزار اشعار ہیں۔ عوفی صبا، کباب، کایہ بیان کہ خمسہ کے سوا نظامی نے اور کوئی کلام نہیں چھوڑا زیادہ ترین صواب معلوم ہوتا ہے۔ نظامی کی تاریخ وفات کے متعلق ابھی تک مختلف محققین میں اتفاق نہیں۔ فی الحال اتنا ہی کہنے پر قناعت کرنی چاہئے کہ آپ نے ۵۹۷ھ اور ۶۰۷ھ کے درمیان وفات پائی۔ نظامی کے کلام کو بڑے بڑے تنقید نگاروں اور اعلیٰ پایہ شاعروں نے سراہا ہے۔ تنقید نگاروں میں عوفی، ترویخی، دولت شاہ اور لطف علی آذر شامل ہیں۔ شاعروں میں سعدی، حافظ، جامی اور عصمت ایسے یگانہ روزگار ہیں۔ نظامی کے کلام میں جو بات پائی جاتی ہے اس کی پیروی میں لکھنے والے شعرا کے یہاں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ مولانا شبلی نے نظامی کے کلام کی یہ خصوصیات ذکر کی ہیں:-

- ۱۔ جامعیت یعنی آپ واقعہ نگاری کے دوران میں کسی بھی تفصیلی بیان کو چھوڑ نہیں جاتے۔
- ۲۔ زور کلام یا جوش بیان۔

۳۔ بلاغت یعنی خوش بیانی اور رنگین ادائی۔

۴۔ جدت استعارات و تشبیہات۔

۵۔ ایجاد و اختراع اور قوت تخیل

۶۔ ادبیات یعنی بہت سی باتیں اول آپ نے ہی ایجاد کیں مثلاً پارچ مختلف بحروں میں تنویاں لکھنا، مخزن الاسرار میں پارچ نصیحتیں کہنا، فلسفیانہ مباحث کو نظم کرنا، قصیدہ کو مدح سے پاک کرنا وغیرہ وغیرہ۔

نظامی نے تنوی کا ایک بالکل امتیازی ڈھانچہ قائم کر دیا ہے۔ اکثر شعر آج تک آپ ہی کی ڈالی ہوئی روش پر گامزن ہیں۔ آپ نے تنویوں کو بالترتیب ان عنوانوں سے شروع کیا ہے:

۱۔ توحید۔ ۲۔ مناجات۔ ۳۔ نعت و بیان معراج۔ ۴۔ مدح

سلطان زمان۔ ۵۔ تعریف سخن و سخن وران۔ ۶۔ سبب تالیف و تصنیف کتاب۔

نام کے لئے غزل کی بنیاد سعدی سے بھی بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ قدما کے بوڑھے غمزے تھے۔ بے شبہ غزل کے موجد سعدی ہیں لیکن غزل کی اصلی روح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے۔

فلک جز عشق محرابے ندارد جہاں بے خاکِ عشق آئے ندارد  
نظامی کے کلام میں فلسفہ بھی جا بجا ملتا ہے۔

سخن گرچوں سخن بخود یہ گوید اگرچہ بد بگوید بد نہ گوید  
نا لیدن ممکن بر مردہ بیداد کہ مردہ صابری خواہد نہ قریاد



نظامی کی بلند اخلاقی اور پاک مشربی کا اندازہ ان دو اشعار سے  
ہو سکتا ہے۔

خدا از عابدان آں را گزیند کہ در راہِ خدا خود را نہ بیند  
بتقریبی کہ از حد نبش کردم خجالت را شفیع خویش کردم  
عام خیال ہے کہ رزمیہ کے بیان میں نظامی کا کلام فردوسی  
سے کم پایہ ہے لیکن رزمیہ میں تو آپ نے نہایت دل افروز گل افشائیاں  
کیں۔ مثال کے طور پر شیریں کے متعلق فرماتے ہیں۔

نبوسیدہ لبش را پیچ ہستی مگر آئینہ واں ہم مدبہ مستی  
نکردہ دست او با کس درازی مگر بازلف خود واں ہم بازی  
بسے لاغر تر از مولش میانش بسے شیریں تر از نامش دہانش  
اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خیالات اور اسلوبِ ادا کی رفعت

کے لئے نظامی کسی حد تک فردوسی کے شرمندہ احسان ہیں؛  
اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت میں بھی شک کی گنجائش  
نہیں کہ اپنے افراد کی ہو بہو تصاویر پیش کرنے۔ عشق و محبت کی  
کیفیات کا نقشہ آنار نے اور انسانی جذبات و احساسات کی صحیح  
ترجمانی کرنے کے اعتبار سے نظامی کے روبرو کسی اور شاعر کو  
کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔ فردوسی اور نظامی کے مراتب اضافی کو  
سمجھنے کے لئے ہمیں مولانا شبلی کے مذکورہ ذیل الفاظ کی حیثیت  
کو بہت حد تک تسلیم کرنا ہوگا۔

ایشیائی شعرا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی داستان کے بیان  
کرنے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقع ہاتھ آ جاتا ہے تو اس قدر

پھیلنے ہیں کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے تجاوز کر جاتے ہیں۔ نظامی اور جامی ایسے مقدس لوگ بھی اس حمام میں اگر ننگے ہو جاتے ہیں۔ لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں ایسے موقعوں پر آنکھ بھی کئے ہوئے آتا ہے اور صرف واقعہ نگاری کے فرض سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے۔

فردوسی نکتہ سنجی۔ بلاغت شعاری، مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے نہایت خوبی کے ساتھ عمدہ برا ہوا ہے۔ اس کے بزمیہ شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ترکیبیں بھی ہیں۔ وہ اپنے کیمیکل کے انداز خوب جانتا ہے۔ عشقیہ شاعری کا تحمل دکھانے کے ساتھ ساتھ وہ متانت اور شائستگی کے سررشتہ کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ متاثرین بلکہ نظامی اور سعدی تک کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے!

اس سے سرگزبر گزیر یہ خیال نہیں کر لینا چاہئے کہ نظامی کے کلام میں شائستگی تہذیب یا متانت نہیں ہے۔ بلکہ مقصد اس کا یہ ہے کہ فردوسی میں شائستگی اور متانت نسبتاً زیادہ ہے۔ یوں تو نظامی بھی اس زبیر سے آراستہ ہے۔

سوال: سلجوقیہ عہد حکومت کے دوران فارسی نثر کی ترقی کا جائزہ پیش کیجئے۔

جواب: سلجوقی دور میں فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر

نے بھی خوب ترقی کی۔ سلجوقی سلاطین و امرا اور سلجوقیوں کے ہمدرد حکمران و تائبک شعرا اور ادبا کے سرپرست تھے۔ اس لئے انہوں نے نثر نگاروں کی بھی دل خواہ حوصلہ افزائی کی اور انعام و اکرام عطا کئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہد میں بعض شاہکار وجود میں آئے جو فارسی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ اس دور میں ہر قسم اور ہر موضوع کی تالیفات مرتب ہوئیں۔ تصوف، تاریخ، اخلاق، ادب، طب وغیرہ پر بلند پایہ تصنیفات وجود میں آئیں۔ غزنوی حکمرانوں کے علاوہ خوارزم شاہیوں نے بھی علم و ادب کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دور کی نثر عام طور پر سادہ اور رواں ہے۔ لفظی و معنوی تکلفات سے پاک ہے۔ عبارت سلیس اور صاف مگر فصیح اور بچتہ ہے۔

## تصوف کی کتابیں

۱۔ کشف المحجوب: اس کتاب کا مصنف ابوالحسن غزنوی ہے اور پانچویں صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی۔ یہ اخلاقی اور صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ صوفیوں کے عقائد کو فصیح زبان میں بیان کیا گیا ہے، فارسی نثر کا عمدہ اور قابل قدر نمونہ ہے۔ کہیں کہیں عربی اشعار اور عربی جملات بھی موجود ہیں۔

۲۔ تذکرۃ الاولیاء: یہ بھی ایک بلند پایہ تصنیف ہے جس میں صوفیوں کے عقائد و اقوال کو بیان کیا گیا ہے۔ صوفی بزرگوں کے

صفات اور مقامات کا حال بھی درج ہے۔ صوفیانہ مضامین کو دلچسپ حکایات اور دلکش تصبیحتوں کے رنگ میں ادا کیا گیا ہے۔ طرز بیان بہت موثر اور پُر زور ہے لیکن عبارت آسان اور سادہ ہے۔ اس کتاب کی تالیف پر کشف المحجوب کا اثر صاف صاف ظاہر ہے۔ دونوں میں نہ صرف طرز بیان میں بلکہ معانی و مطالب میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس تصنیف کے مصنف شیخ فرید الدین عطار ہیں۔ یہ کتاب ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں تالیف ہوئی۔

۳۔ اسرار التوحید: یہ تصوف پر ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ اس کا لکھنے والا محمد بن منور ہے جس کا سلسلہ نسب شیخ ابوسعید ابوالخیر سے ملتا ہے۔ اس کتاب کا طرز تحریر سادہ اور شیریں ہے۔ یہ کشف المحجوب کے سو سال کے بعد لکھی گئی۔ اس میں شیخ ابوسعید ابوالخیر کے حالات، اقوال، عقاید اور کرامات کا ذکر ہے۔ ضمنی طور پر اس میں صوفیانہ حکایات اور اشعار بھی آگئے ہیں۔ شیخ ابوسعید کی مناسبت سے کئی دوسرے ہم عصر صوفیاء اور علما کا حال بھی مذکور ہے۔

## تاریخی کتب

۱۔ زین الاخبار: یہ قدیم تاریخی تصنیف ہے۔ اس کا مصنف ابوسعید عبدالحی بن ضحاک بن محمود ہے۔ یہ آدمی گریز کا باشندہ تھا جو غزنہ سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یہ کتاب سلطان

محمود غزنوی کے بیٹے عبدالرشید کے عہد حکومت میں تالیف ہوئی۔ اس میں مصنف کے زمانے تک کی تاریخ ایران (مختصراً) ظہور اسلام کے بارے میں اور خلفاء کی تاریخ اور واقعات کا بیان ہے۔ سامانی اور غزنوی خاندانوں کی تاریخ کے مطالعہ میں یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

۲۔ تاریخ بہیقی۔ اس تاریخی شاہکار میں غزنوی خاندان کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ چونکہ اس کے مصنف ابو الفضل بہیقی نے اکثر مذکورہ واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت میں کوئی شک نہیں۔ مصنف نے لگ بھگ بیس سال غزنوی دربار کے دیوان رسائل میں منشی گیری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اس لئے وہ حکومت کے کئی مخفی معاملات سے بھی واقف تھا۔

تاریخ کی قدر و منزلت اس وجہ سے بھی بڑھ گئی ہے کہ مصنف ایک اعلیٰ پایہ نثر نگار تھا۔ اس نے یہ کتاب نہایت فصیح اور پُر زور مگر شستہ، سادہ اور ادبی زبان میں لکھی ہے۔ بیان واقعات کے ضمن میں کہیں کہیں مناسب حال اور مفید مطلب اشعار بھی استعمال کئے ہیں۔ اس لئے یہ کتاب فارسی نثر کے شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے۔

اس کتاب کی تیس جلدیں تھیں لیکن صرف چند جلدیں باقی ہیں بیشتر ناپید ہو چکی ہیں۔ جو جلدیں زمانے کی دستبرد سے بچ گئی ہیں وہی تاریخ بہیقی کے نام سے مشہور ہیں۔

جو جلد میں محفوظ ہیں ان میں سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے حالات درج ہیں۔ اس لحاظ سے اسے تاریخ مسعودی بھی کہتے ہیں۔ مصنف حق پسند، نیکو کار اور انصاف پرور شخص تھا۔ اس لئے اس نے واقعات کے بیان میں جھوٹ یا مبالغہ سے مطلق کام نہیں لیا۔ بطور ایک مورخ کے اس نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

۳۔ مجمل التواریخ والقصص۔ اس کتاب کا مصنف ابو الحسن علی بن زید بہیقی ہے۔ یوں تو اس میں ابتداءً دنیا سے ۵۲۰ھ سن تا لیف کتاب تک کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن ایران کی تاریخ کا خاص ذکر ہے۔ تاریخ کے ضمن میں جابجا داستانیں اور قصے کہانیوں سے کام لیا گیا ہے جس سے اس کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تالیف ہوئی۔ اس میں ولایت بہیقی کی تاریخ اور اس علاقے کے بزرگوں، عالموں اور حکیموں کے حالات مندرج ہیں۔ ان بزرگوں میں ابو الفضل بہیقی بھی شامل ہے۔

۴۔ راحت الصدور۔ راحت الصدور ایک بلند پایہ تاریخ ہے۔ اس کا مصنف ابو بکر محمد راوندی ہے جو کاشان سے قریب موضع راوندکار رہنے والا تھا۔ راحت الصدور میں سلجوقیوں کے حالات اور واقعات مذکور ہیں۔ اس کتاب میں سلجوقی خاندان کی مکمل تاریخ ابتدا سے آخر تک بیان کی گئی ہے۔ ابو بکر محمد سلجوقیہ خاندان کے آخری حکمران طغرل بن ارسلان کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اور سلجوقی دربار سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی تاریخی



اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے آخر میں لکھی گئی اور روم کے سلجوقی حکمران کیخسرو بن قلیج ارسلان کے نام پر معنون کی گئی۔ شاہی دربار میں راوندی کو بلند درجہ اور عزت حاصل تھی۔ تاریخی اہمیت کے علاوہ اس کتاب کی ادبی حیثیت بھی قابل قدر ہے۔ اس میں کئی شاعروں اور عالموں فاضلوں کے نام مذکور ہیں۔ اور ان کے اشعار اور قصیدے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ اس نئے علاوہ اس میں عربی امثال بھی جا بجا ملتی ہیں۔

راوندی کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ اس نے راجت اصد میں اپنے کئی قصیدے کیخسرو اور قلیج ارسلان کی مدح میں دیئے ہیں۔

## ادبی، اخلاقی اور طبی کتب

(۱) چہار مقالہ۔ عہد سلجوقیہ کے وسطی زمانہ کو چہار مقالہ پر کیا طور سے ناز ہے۔ اس کتاب کا لکھنے والا ابوالحسن احمد سمرقندی بلقب بہ نظامی عروضی ہے۔ یہ ماورالنہر کے شاہان غور کے دربار میں منتالیس سال تک فارسی نثر اور نظم کی خدمت کرتا رہا۔ اس نے ۵۶۷ھ کے پس و پیش میں مجموع النواد اور کتاب چہار مقالہ حکمت علمی اور آداب خدمت ملوک میں لکھی۔ چہار مقالہ اصل میں دیرمی شاعری، نجوم اور طب کے ارباب فن کا ایک چر حکمت اور سیر حاصل تذکرہ و تبصرہ ہے۔ اس میں ایک دیباچہ اور چار باب ہیں۔ ہر باب میں نہایت دلچسپ حکایتیں اور اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ تاریخی

نقطہ نگاہ سے چہار مقالہ مستند ترین کتابوں میں سے ایک ہے اگرچہ ادھر ادھر مصنف کے بیانات میں شکوک کی گنجائش ہے۔ یہ کتاب غزنوی شہزادے ابوالحسن حسام الدین علی کے نام سے منسوب کی گئی۔ عروسی نہ صرف فارسی انشا پر دازی کا استاد تھا بلکہ خود شعر بھی کہتا تھا اور عالم و فاضل تھا۔ اس کتاب میں چونکہ بہت سے شعرا اور علما و ادبا کے حالات مذکور ہیں اور ان میں سے بیشتر شعرا اور علماء مصنف کے قریب العہد تھے یا ہم عصر تھے اس لئے اس تصنیف کو برطی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ مقامات جمیدی۔ یہ کتاب مسیح عبارت آرائی کی وجہ سے بہت شہرت رکھتی ہے۔ اس کا مصنف حمید الدین ابوبکر بن محمود ہے جو بلخ کا رہنے والا تھا اور شہر کا مشہور قاضی تھا۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی۔ حمید الدین کی فضیلت اور علمیت کی تعریف بڑے بڑے شاعروں نے کی ہے۔ مثلاً انوری نے اپنے اشعار میں اس کی مدح کی ہے۔ اور اسے ایک بلند پایہ ادیب کا درجہ دیا ہے یہ کتاب ۲۳ مقامات پر مشتمل ہے اور اس میں ادبی مباحث و مناظرات اور مطالب و چلبستان درج ہیں۔

۳۔ حدائق السحر: اس کتاب کا مصنف مشہور قصیدہ گو شاعر رشید الدین دطوطا ہے۔ کتاب کا پورا نام حدائق السحر فی دقائق الشعر ہے۔ اس میں صنائع لفظی و معنوی کا بیان ہے اور فارسی زبان میں اس موضوع پر یہ قدیم ترین دستیاب تصنیف ہے۔ یہ کتاب درحقیقت فرخی کی کتاب ترجمان البلاغت پر لکھی گئی تھی جو ناپید ہے حدائق السحر

فصیح و بلیغ زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی نظم و نثر کی امتثلہ دی گئی ہیں۔

۴۔ مرزبان نامہ۔ یہ کتاب کلید و دمنہ کی طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں کئی قسم کی حکایات اور قصص مذکور ہیں۔ اس کا مصنف خاندان باوندیان کا حکمران مرزبان بن رستم بن شروین تھا جس نے اسے قدیم طبرستانی زبان میں تالیف کیا تھا۔ بعد ازاں ساتویں صدی کے شروع میں بلشی سعد الدین ورا دینی نے اسے اری فارسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ آذربائیجان کا رہنے والا تھا۔ اصلی طبرستانی ایڈیشن چوتھی صدی ہجری کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔

۵۔ کیمیائے سعادت۔ اس کتاب کا مصنف مشہور اریب امام غزالی ہے جس نے اسے پانچویں صدی ہجری کے آخر میں تالیف کیا۔ اس کتاب کا موضوع دین و اخلاق ہے۔ کیمیائے سعادت دراصل مصنف کی عربی تصنیف احیاء العلوم کا فارسی زبان میں خلاصہ ہے۔ اس میں اسلام کی تعلیمات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور اخلاق و مذہب اسلام پر بہترین اور مستند ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۶۔ سیاست نامہ۔ خواجہ ابوعلی نظام الملک طوسی مشہور سلجوقی بادشاہوں کا وزیر اس کتاب کا مصنف ہے۔ اس کے ادبی مذاق اور غیر معمولی ذہانت نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے گوناگوں فرائض کے باوجود کسی ادبی خدمت کے لئے وقت نکالے۔ چنانچہ اس نے فن حکومت کے موضوع پر سیاست نامہ کے نام سے ایک قابل قدر

کتاب لکھی۔ اس کتاب میں حکمرانی کے جو اصول اور نظریات درج ہیں ان کی بنیاد قابل مصنف نے اپنی تاریخی معلومات اور وسیع تجربات پر رکھی۔

سیاست نامہ کے پچاس ابواب ہیں۔ ان ابواب میں ہر قسم کے شاہی فرائض اور حقوق امتیازی کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے حکومت کے ہر ایک محکمے کے متعلق پُر از معلومات بحث کی گئی ہے اس کتاب کی تصنیف کے متعلق مشہور ہے کہ ملک شاہ نے اپنے قابل مشیروں کو سیاست علمی و عملی کے متعلق ایک مستند ترین کتاب لکھنے کو کہا۔ اس فرمائش کی تعمیل میں نظام الملک نے یہ معرکتہ الآرا شاہ کار ۹۲-۹۱ء میں یعنی اپنی ہلاکت کے تھوڑا ہی عرصے پہلے پیش کیا تھا۔ پروفیسر براؤن سیاست نامہ کو فارسی نثر کی مفید ترین اور دلچسپ ترین کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں بہت سادہ دلچسپ تاریخی مواد ہے اور کہ ایک ایسے عظیم المرتبت وزیر اعظم کے سیاسی خیالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں جس پر مشرق کو بجا طور سے ناز ہو سکتا ہے۔ سیاست نامہ کا انداز تحریر نہایت سادہ و صانع و بدائع سے پاک اور حقیقت حال کا پورا پورا ترجمان ہے۔ بعض اوقات تو سیاست نامہ یا سیر الملوک کا مصنف تصنع سے بچتا بچتا قدیم انداز بیان کی الجھن میں پھٹس کر رہ جاتا ہے۔ سات باب ملحدوں کا ذکر کرنے کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ خاص کر فرقہ باطنی اور فرقہ اسماعیلی کو بہت کو سا گیا ہے۔ یہ باب نہایت دلچسپ ہیں۔ نظام الملک کی رائے میں چھوٹے

چھوٹے فرقوں اور طبقوں کا وجود سلطنت کی طاقت اور اقتدار کو ضعف کی طرف لے جاتا ہے۔ مصنف شیعوں کے خلاف نہایت پر جوش استدلال کرتا ہے اور ان میں سے بعضوں پر پیغمبرِ مکیوٹنسٹ مزدک کے عقاید و نظریات کی پیروی کا الزام دھرتا ہے (مزدک ساسانی بادشاہ قباد کے وقت میں ایک بڑا فصیح و بلیغ شخص گذرا ہے۔ اس نے ایک نیا مذہب نکالا تھا،

سیاست نامہ نہایت اہتمام کے ساتھ ۹۷۰-۹۹۱ء میں بمقام پیرس چھپ چکا ہے۔

۶۔ قابوس نامہ۔ قابوس نامہ کا مصنف زیاری حکمران قابوس بن دشمنگیر کا پوتا کیکاؤس بن اسکندر تھا۔ جس کا لقب عنصر المعالی تھا۔ اس نے ۱۲۱۲ھ میں ولادت اور ۵۷۵ھ کے بعد وفات پائی۔ قابوس نامہ ۵۷۵ھ میں لکھا گیا۔ کتاب کسی حد تک سیاست نامہ نظام الملک کا جواب ہے۔ کیکاؤس نے پیشہ ور زماں کتاب اپنے بیٹے گیلان شاہ کے استفادہ کے لئے لکھی۔ اس میں کل چوالیس باب ہیں جو حکمت عملی، تدبیر منزل، سیاست مدن، تدبیر شاہی اور نصائح اخلاقی کے سے مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ بحث کی تاثیر اور دلکشی کے چمکانے کو قابل مصنف نے ایران کی نامور ہستیوں ہوشانگ، جمشید، لقمان اور نو شیروان عادل کے سے ارباب تدبیر و تدبیر کی حکمت عملی کا سہارا لیا ہے۔

قابوس نامہ میں دلچسپ اور حکمت آمیز کہاوتوں کی بھرمار ہے۔ زبان نہایت فصیح، رواں اور بے تکلف ہے۔ یہاں تک کہ

فارسی نثر کی بہت تھوڑی کتابیں اس شاہکار کی سطح پر کھجاسکتی ہیں۔  
سوال: حجت الاسلام امام غزالی کی زندگی اور ادبی خدمات  
پر مختصر نوٹ لکھئے۔

جواب۔ آپ ۱۰۵۸ھ اور ۱۰۶۰ھ کے درمیان یعنی الپ ارسلان  
کی تخت نشینی کے لگ بھگ طوس کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بچپن  
ہی میں یتیم ہو گئے۔ آپ کے باپ کا ایک صوفی دوست تھا جس  
نے آپ کی تعلیم و تدریس شروع کی۔ پھر آپ طوس کے ایک کالج  
میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد امام ابو نصر الاسماعیلی کی  
خدمت میں زائرئے ادب تہ کیا۔ پھر نیشاپور گئے جہاں آپ کے  
مضامین خاص و عام کی ترجمہ کو اپنی طرف میزول کرنے لگے۔ ۱۰۹۱ھ  
و ۱۰۹۲ھ میں نظام الملک نے آپ کو نظامیہ کالج بغداد میں ایک  
پروفیسر کی حیثیت سے لے لیا۔ آپ نے خانہ کعبہ کا حج کیا اور  
وہاں سے شام پہنچے۔ جہاں آپ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف  
احیاء العلوم الدین مکمل کی۔ یہ کتاب عربی زبان میں تھی۔ بعد میں  
آپ نے اسے اختصار کے ساتھ کیمیائے سعادت کے نام سے  
فارسی زبان میں ڈھالا۔ ازاں بعد طوس کی طرف مراجعت کی۔  
۱۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

آپ کی متعدد تصانیف میں سے بعض فرقہ اسماعیلیہ یا  
باطنی کے خلاف استدلال سے لبریز ہیں۔

آپ کو اہل اخلاق، اہل کلام اور اہل تصوف کے زمرے میں  
ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ احیاء العلوم الدین دینیات اسلام



کا ایک جامع اور مکمل ذخیرہ ہے۔ مصنف کے عقائد و نظریات تصوف کی طرف مائل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود الغزالی نے دین مبین کے بنیادی اصولوں کی جو دقیق اور بلیغ وضاحت کی ہے اس نے اس کے لئے حجت الاسلام کا لقب حاصل کر لیا ہے، بلکہ السیوطی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر حضرت محمدؐ کے بعد کوئی پیغمبر ہو سکتا تو یقینی طور پر وہ الغزالی ہوتا۔

الغزالی نے تصوف کی ایک بے نظیر خدمت کی ہے صوفی شعرا نے جن تعلیمات کو اس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ان کی ترتیب و تدوین کا سہرا الغزالی کے سر ہے۔ اُس زمانہ میں امام غزالی کی بدولت فلسفہ، منطق اور علم کلام نصاب میں شامل ہو گیا تھا۔ اور ان علوم کی تعلیم علمائے معقولین کے دائرہ سے نکل کر عام ہو گئی تھی۔ شیخ ابو علی فارمدی جو امام غزالی کے پیرو تھے حکیم سنائی کے دادا تھے اس رشتے سے سنائی امام غزالی کے بھتیجے تھے۔ یہ بھی اس بات کا سبب ہوا کہ سنائی کو علم کلام کے ساتھ لگاؤ تھا۔ چنانچہ صوفیانہ مسائل کے ساتھ علم کلام کے دلائل بھی درج کرتے ہیں۔

سوال: خوارزم شاہان اور ان کے کارناموں پر مفصل نوٹ لکھئے۔

جواب: سلطان سنجر کے عہد میں سلجوق اقتدار کا شدید مقابلہ کرنے والی تین طاقتیں تھیں:-  
۱۔ خاندان غور جس نے شاہان غزنوی کی گھٹتی ہوئی طاقت کا

خاتمہ کر دیا۔

۲۔ فرقہ اسماعیلیہ یا ملاحدہ۔ جس کی طاقت ایران اور شام میں روز بروز ترقی کرتی گئی۔

۳۔ خاندان خوارزم شاہان جس نے سلجوقیوں کی طاقت پر کاری ضرب لگائی۔ خوارزم کا علاقہ دریائے جیحون کے کنارے بخیرہ اسود تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے خیوا بھی کہتے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ ایرانی سلطنت کے ساتھ ملحق تھا۔ کچھ حصے پر توران (پارتھیا) کا تسلط تھا۔ خوارزم پر حکومت کرنے والے ہر بادشاہ کو اور خاص کر علاء الدین محمد (۱۲۱۷ء تا ۱۲۲۷ء) کو خوارزم شاہ کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ ان بادشاہوں کا سلسلہ ملک شاہ کے ایک غلام ازشتگین سے ۱۰۷۷ء میں شروع ہوتا ہے۔

اتسز کی تخت نشینی (۱۱۲۷ء) کے بعد خوارزم شاہی سلطنت کی طاقت روز افزوں ہونے لگی۔ اتسز نے ۱۱۲۷ء میں خود مختاری کا اعلان کر کے سنجر کے خلاف بغاوت کر دی۔ سنجر کو شکست فاش ہوئی۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ سنجر کی یہ پہلی شکست تھی اور شدید ترین تباہیوں کی تمہید اس میں مضمر تھی۔

رشید الدین محمد و طو اظ بلخی صاحب ”صد کلیمہ“ و ”حدائق السمر“ اسی اتسز کا درباری شاعر اور صاحب دیوان تھا۔ سنجر کے مشہور شاعر ادیب صابر کو بھی اسی اتسز نے بقول دولت شاہ سمرقندی سنہ ۵۲۰ھ - ۱۱۵۱ء میں دریائے جیحون میں ڈبوادیا تھا اس لئے کہ ادیب صابر نے سنجر کو اس سازش کی اطلاع دے دی تھی جو

اتسنر کے ایک کارندے نے سنجر کو قتل کرنے کی غرض سے سوچ رکھی تھی۔

نیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اتسنر کا پڑپوتا علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ سلجوقی طاقت تو ایک مدت سے ختم ہو چکی تھی۔ خوارزم شاہی طاقت پورے یوں پر آگئی۔ لیکن عباسی خلیفہ الناصر اور محمد خوارزم شاہ کی باہمی کشمکش اسلام کے اقتدار پر اثر انداز ہونے لگی۔

آخر چنگیز خاں کے خونیں حملوں کی آفت (۱۲۱۹ء تا ۱۲۲۷ء) ایران پر نازل ہوئی۔ ان حملوں کے دوران کفر شتار دشمنوں کے خلاف اسلام کے آخری محافظ خوارزم شاہ جلال الدین سنکوبرنی بن سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ آج تک اہل تذکرہ تعریف کرتے ہیں۔

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے سوانح نگار اور صاحب دیوان انسوی نے اپنے تذکرے میں سلطان جلال الدین کے حالات عربی زبان میں قلم بند کئے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۷-۱۲۷۱ء میں مکمل ہوا۔ تاریخ جہان کشائے جوینی میں بھی سلطان جلال الدین کے کارناموں کا ذکر آتا ہے۔ اس تاریخ کی دوسری جلد حالات و واقعات خوارزم شاہان کے لئے وقف ہے۔

تذکرہ خوارزم شاہی محمد خوارزم شاہان کی مشہور یادگار ہے۔ یہ کتاب علم طب کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جسے زمین العابدین ابو ابراہیم اسماعیل انجو جانی نے بارھویں صدی عیسوی کے

آغاز میں مرتب کیا۔ اور التسنر کے باب قطب الدین خوارزمشاہ کے نام پر معنون کیا۔ یہ کتاب حقیقت میں شیخ ابو علی سینا کے شاہکار کا فارسی زبان میں خلاصہ ہے۔

سوال۔ تصوف کی تعریف و توضیح کیجئے اور فارسی شاعری میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

جواب۔ تصوف صوفیوں کے مذہب کا نام ہے۔ یعنی وجدانِ ذوق اور مشاہدہ اہل تصوف کو صوفی اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے دل صاف ہوتے ہیں یا اس لئے کہ وہ صوف کے کپڑے پہنتے ہیں۔ انگریزی میں تصوف کو THEOSOPHY یا

MYSTICISM کہتے ہیں۔ تھیوسوفی کی تعریف یہ ہے۔

“THE KNOWLEDGE OF DEITY OBTAINED BY SPIRITUAL ECSTASY, DIRECT INTUITION OR DIVINE ILLUMINATION”

اہل فلسفہ کے نزدیک تمام چیزوں کے ادراک کا ذریعہ جو اس ظاہری ہیں۔ لیکن ارباب تصوف کے نزدیک ان سب کے علاوہ ایک اور حاسہ یا ظنی ہے جو مشق اور ریاضت سے پیدا ہوتا ہے اس حاسہ سے کشف، مشاہدہ یا الہام پیدا ہوتا ہے۔ عالم غیب یعنی خدا، ملائکہ، آخرت، بہشت، دوزخ کے متعلق اہل شریعت اور فلسفہ جو کچھ جانتے ہیں قیاس اور استدلال کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔ لیکن صوفی جانتا نہیں بلکہ دیکھتا ہے۔ تصوف میں ایک حالت

طاری ہو جاتی ہے جس سے خود بخود اخلاق پیدا ہوتے ہیں تصوف میں فلسفہ کبھی شامل ہے تصوف کے مسائل یہ ہیں :-

وحدت وجود یعنی ہمہ اوست تصوف کی اصلی بنیاد علم باطن یعنی تزکیہ نفس ہے۔ کشف حقائق اور عشق حقیقی تصور کا خمیر ہے۔ اربابِ حال کے نزدیک ذاتِ باری کا وجود کسی استدلال کا محتاج نہیں بلکہ کائنات کے ذرے ذرے میں اُسی محبوب روحانی کی جھلک ہے۔ تزکیہ نفس اور مجاہدہ سے روح کو ایک اور ادراکِ غیبی حاصل ہوتا ہے۔ عرفانِ الہی کا یہی ذریعہ ہے۔ سالک کے لئے آخری منزل مقصود ”فنا فی اللہ“ ہے۔ صوفیا فنا کو بقا کا دیباچہ جانتے ہیں۔ عارف جس حالت میں بھی اُسے قیدِ فنا اور حبس سمجھتا ہے۔ وہ ہر وقت اس حالت سے آگے ترقی کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اگر عشق حقیقی دل و دماغ کی وسعتوں پر چھایا جائے تو اس کے مقابلہ میں ذکر و شیع بیکار ہے۔ صوفی کی سرشت کا تقاضہ ہے کہ وہ بے اختیار ہو کر لطفِ الہی کی خواہش یا عتابِ ربانی کے ڈر کے بغیر پاکیزہ ترین زہد و عبادت میں مستغرق رہے۔ روح ایک ازلی وابدی جوہر ہے جو اپنے عوارض کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ انسان خود ہی تمام عالم اور صانعِ عالم کا منظر ہے۔ وہ خود کو جان لے تو گویا اس نے صانعِ ازل اور اس کی صنعت کے حقائق کو جان لیا۔ کائنات کے اسرار معلوم نہیں ہو سکتے اور پھر بہت سے اسرار ایسے ہیں کہ ان سے پردہ اٹھانا خلافِ مصنوع ہے۔ صوفی کا مسلک رسوم و قیود اور زمان و مکان

کی حدود سے بالاتر ہے۔ صوفیا خدا کی رضا میں راضی رہتے ہیں۔  
 تسلیم و قناعت ان کا شیوہ اولین ہے۔ ارباب تصوف انسان  
 کی قوت خیر کو فرشتہ اور اس کی قوت شر کو شیطان تصور کرتے ہیں۔  
 فارسی ادب میں تصوف کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ہم جناب

شبلی نعمانی ڈاکٹر براؤن، پروفیسر نکلسن، دین شاہ جے ایرانی، بیوی  
 اور ایسے ہی دوسرے ارباب تنقید کی ادبی کاوشوں کے علاوہ  
 صوفی شاعروں کے تذکروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔

بقول شبلی ”فارسی“ شاعری اس وقت تک قالب بے جان  
 تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا۔ شاعری  
 اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے۔ تصوف سے پہلے جذبات کا  
 سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ قصیدہ ملاحی اور خاشاک کا نام تھا۔  
 مذہبی واقعہ نگاری تھی۔ غزل زبانی باتیں تھیں۔ تصوف کا اصلی  
 مایہ خمیر عشق حقیقی ہے۔ جو سرتاپا جذبہ اور جوش ہے۔ عشق حقیقی  
 کی بدولت عشق مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے تمام  
 سینہ و دل گرمادینے۔ اب زبان سے جو کچھ نکلتا تھا گرمی سے  
 خالی نہ تھا۔ ارباب دل ایک طرف، اہل ہوس کی باتیں بھی  
 تاثیر آگئی۔ سب سے پہلے صوفیانہ خیالات حضرت سلطان ابو سعید  
 ابوالخیر نے ادا کئے۔

اس زمانے تک تصوف کے حقائق اور مسائل شاعری سے  
 آشنا نہیں ہوئے تھے۔ صرف عشق اور محبت کے جذبات تھے  
 لیکن ان کا مخرج چونکہ عشق حقیقی تھا اس لئے تصوف کا رنگ



جھلکتا تھا۔ سلطان صاحب کے بعد حکیم سنائی نے اس باغ کی  
آبیاری کی۔ سنائی پر امام غزالی کا فلسفہ، منطق اور علم کلام بھی  
بہت حد تک اثر انداز ہوا۔

ایرانی تصوف کا تعلق یونانی، ہندوستانی اور عرب فلسفہ  
و اخلاق کے ساتھ ہے۔ تصوف میں جو فلسفہ بتدریج رونما ہوا  
اس میں جدید افلاطونی فلسفہ کا عنصر غالب ہے۔ وان کریمر کا  
عقیدہ ہے کہ اصلی تصوف کی بنیاد حقیقتاً ہندوستانی فلسفہ خاص  
طور پر ویدانت پر ہے۔

فارسی شاعری میں تصوف کی ترقی کا ایک بڑا سبب تانایوں  
کا ہنر گامہ تھا۔ اُس نے تمام اسلامی دنیا کو زیر و زبر کردیا مشرق  
سے مغرب تک سناٹا چھایا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے  
قدری اور بے حقیقی پر ہے۔ یہ سب کو آنکھوں سے نظر آگئی۔  
اس حالت میں جو دل متاثر اور قابل تھے ان کو خدا سے لڑ گئی۔  
انابت، خضوع، تضرع، رضا بالقضا، توکل جو تصوف کے خاص  
مقامات ہیں خود بخود دل پر طاری ہوئے۔ بڑے بڑے صوفی شاعر  
مثلاً سعدی، اوحدی اور عراقی سب انہیں اسباب کے نتائج ہیں۔  
ایک اور بڑا سبب صوفیانہ شاعری کی ترقی کا یہ ہوا کہ تصوف  
میں ابتدا سے ہی اخلاق کے مسائل شامل ہو گئے تھے کیونکہ اخلاق  
کو تصوف سے ایک خاص تعلق ہے۔ اخلاق کا فن اسی زمانہ میں  
نہایت وسیع ہو گیا تھا۔ احیاء العلوم (امام غزالی) نے اس فن  
کے دقیق اسرار عام کر دیئے تھے محقق طوسی نے اخلاق نامہ میں  
ارسطو کے اخلاق ادا کئے۔ اس کے اثر سے اخلاق کا ایک

سرباہ جہتیا ہو گیا اور یہ سب تصوف کے حصے میں آیا۔ چھٹی صدی ہجری میں فلسفہ کو عام رواج ہوا اور مذہبی گروہ میں بھی فلسفہ کی کتابیں درس میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ اس دور کے جس قدر مذہبی علما ہیں فلسفہ سے بھی آشنا ہیں۔

صوفیاء کے گروہ میں مولانا روم اور شیخ محی الدین اکبر فلسفہ کے پورے ماہر تھے۔ اس لئے خود بخود ان کی تصنیفات میں فلسفہ کا امتزاج ہو گیا۔ تصوف کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی سرحد فلسفہ سے ملتی ہے۔ ان اسباب سے صوفیاء شاعری کی وسعت اور گہرائی بڑھ گئی۔

تصوف نے فارسی ادب کو مداحی سے پاک اور جہذبہ بان اور لطیف استعارات سے رنگین کر دیا ہے۔ فلسفہ اخلاق عشق حقیقی۔ نئے الفاظ، اصطلاحات اور تلمیحات بھی دراصل تصوف ہی کی راہ سے فارسی ادب میں داخل ہوئے ہیں۔ عزت نفس اور بلند خیالی تصوف ہی کے نتائج ہیں۔ تصوف نے اخلاق کو گروہ مسلمان کے جھگڑوں بکھڑوں سے بھی پاک کیا۔

ذیل کے نامی گرامی شعرا و ادبا کی شاعری تصوف اور اخلاق کے مضامین سے لبریز ہے۔

سلطان ابوسعید ابوالخیر، حکیم سنائی، امام غزالی، ادھال دین کرمانی، اودھدی اصفہانی، خواجہ فرید الدین عطار، عراقی، سعدی، مولانا روم، شیخ محی الدین اکبر، محمود شبستری، امیر خسرو اور حسن دہلوی، مغربی تبریزی، شاہ نعمت اللہ، قاسم الانوار، عبدالرحمن جامی

خواجہ حافظ، عارفی، نظیری، محنتی، شفا علی۔

تصوّف کی مذکورہ ذیل تصنیفات کو فارسی ادب میں نہایت ممتاز مقام حاصل ہے :-

حدیقۃ الحقیقت اور سیر العباد (حکیم سنائی) مصباح الارواح  
 (اوحد الدین کرمانی) جام جم (اوحدی اصفہانی) منطق الطیر (خواجہ  
 فرید الدین عطار) احیاء العلوم (امام غزالی) اخلاق ناصری (محقق  
 طوسی) نشوی (مولانا روم) گلشن راز (محمود شبستری) رباعیات  
 ابوسعید ابوالخیر وغیرہ۔

---

# منگول اور تیموری دور

سوال: منگول حملے اور خلافت بغداد کی تباہی کے ایران کی ادبیات اور تمدن پر اثرات واضح کیجئے۔

جواب: منگول حملے کی وحشت اور بربریت کی مثال تاریخ عالم میں بہت کم ملے گی۔ چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور تیمور حیب اپنے لشکر کے ساتھ بڑھے اور ایران پر حملہ آور ہوئے تو انہوں نے خوفناک تباہی مچائی۔ ایسی درندگی کا ثبوت دیا کہ اس سے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے جتنے شہر اور دیہات راستے میں آئے سبھی کو آگ کی نذر کر دیا۔ قتل عام اور غارت گری کا بازار گرم کیا۔ بے دریغ عورتوں اور معصوم بچوں کو تلوار کی گھاٹ اتارا۔ کھٹے ہوئے سروں سے مینار کھڑے کئے۔ ان ظالموں اور آدم خوروں نے بیگناہوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی۔

باوجود اس ستم گری کے ایران کی روح فنا نہیں ہوئی۔ ان کی تہذیب اور تمدن وحشی اور جاہل حملہ آوروں پر غالب آیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ان میں تہذیب و تمدن پیدا کیا۔ جتنے بھی منگول ایران میں آباد ہوئے سبھی نے اسلام قبول کر لیا۔ ایرانی روایات اور تمدن اختیار کیا۔ قومی علوم و فنون نے ترقی کی۔ گوشت و شعار منگول اور تیموری حملہ آوروں کو فنون لطیفہ سے رغبت نہ تھی لیکن وہ سائنس اور دوسرے مفید علوم کے دلدادہ تھے۔ ہلاکو تک کو

تاریخ نگاروں کا احترام منظور تھا۔ اس لئے ہلاکو کی اولاد ایلخانی حکمرانوں کے عہد میں بہت سی مستند اور معیاری تاریخیں لکھنے میں آئیں۔ تا تاریخ اثرات کا ایک یہ بھی نتیجہ ہوا کہ قصبہ گونی کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا۔

منگول حملے کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ دور دراز رہنے والی قوموں کا میل جول ہوا جس سے ایشیا کی زندگی میں ایک نئی روح سراپت کر گئی۔ جمود و تعطل کی فضا ختم ہو گئی اور تازگی اور حرکت نے اس کی جگہ لی۔ تمام ایشیا جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان کے بیچ سینکڑوں حدود و حائل تھیں منگول حملہ نے ان تمام حدود اور رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ اس سے غیر ملکی سیاستوں کے لئے سفر کرنا اور ایشیا کے طول و عرض میں گھوم کر اس کے رازوں سے پردہ اٹھانا آسان ہو گیا۔ یورپ ایشیا کے حالات آشنا ہو گیا اور دونوں براعظموں میں راہ و رسم کے راستے کھل گئے۔ صدیوں بعد ایرانیوں اور عربوں کا اہل چین و تبت کے ساتھ براہ راست میل جول پیدا ہوا۔ علمائے اسلام نئے عیسائی مبلغوں، بودھی لاموں اور منگول تختیوں کے ساتھ مباحث و مناظرے ہوئے۔

جب ہلاکو کے وارث حکمران ایران کی سرزمین پر آباد ہو گئے تو انہوں نے اپنی بربریت اور وحشت ترک کر دی، توہمات اور بیدینی یا کفر چھوڑ کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اپنے اہل وطن اور خوارج قبیلوں کے ساتھ رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ ایرانیوں کے ساتھ کھل مل گئے اور ان میں تمدنی طور سے

جذب ہو گئے یعنی ایرانی قوم کا جزو بن گئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہلاکو جس نے خلافت بغداد کو تباہ کیا اور اسلام کا جانی دشمن تھا اس نے اس عہد کے دو بلند مرتبہ ایرانی مصنفوں کی خوب دلداری اور قدر کی یہ دو برگزیدہ ہستیاں ہیں۔ منجم نصیر الدین طوسی اور مورخ عطاء الملک جوینی۔ ان کے علاوہ دو اور مورخ حضرت صدقات اور رشید الدین فضل اللہ نے غازان خاں کے عہد میں خوب نام اور شہرت پائی۔ درحقیقت منگول حملہ سے ادبیات ایران کو ناقابل تلافی نقصان تو ضرور پہنچا لیکن اس کا خاتمہ نہیں ہوا۔ ایران کے تین عظیم اور نامور شاعر یعنی مولانا روم، شیخ سعدی اور خواجہ فرید الدین عطار منگول عہد میں ہی ہوئے ہیں اور متعدد بلند درجہ شاعر اور ادبا عین اس دور کے پیدا آئے۔ البتہ سیاسی طور پر اسلامی دنیا کو سخت عدمِ بہنچا جو اتحاد خلافت بغداد کے دم سے قائم تھا وہ مغول حملہ سے پائش پاش ہو گیا اور ساتھ ہی ایران میں عربی زبان کو زوال آیا اور اس کی جگہ فارسی نے لے لی۔ اب عربی صرف دینیات اور فلسفہ کی زبان رہ گئی۔ عربوں کی حکومت ایران میں ختم ہو گئی کیونکہ ہلاکو کے وارث ایلخان صاحب اقتدار ہوئے۔ انہوں نے ایران کی چھوٹی چھوٹی منتشر ریاستوں کو اپنی حکومت کی ایک لڑی میں پرو دیا اور ساتھ ہی ایران پر بیرونی حملہ کے خطرہ کا انسداد کر دیا۔ ایرانی قوم اور ملک کے لئے ایلخانی ایک رحمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئے انہوں نے سارے ایران میں امن و امان قائم کیا۔



ایک مرکزی حکومت قائم کر دی۔ اور اس کی ایک جہتی اور سلامتی کے ضامن ہوئے۔

اس امن و امان کی فضا میں ایران کی ادبیات کو بھی ترقی نصیب ہوئی۔ خاص طور پر صوفیانہ شاعری نے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ چونکہ بے دین منگول حملہ آوروں کا اپنا کوئی مذہب نہیں تھا اس لئے اسلام کو پھیلنے پھولنے کا موقع میسر ہوا۔ حملے کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ فارسی زبان میں بے شمار تاتاری اور ترکی زبان کے الفاظ داخل ہو گئے۔

سوال: ایران میں منگول اور تیموری عہد حکومت کے دوران فن تاریخ نگاری کی ترقی پر مفصل نوٹ لکھئے۔ یا ایلخانی (منگول) عہد کے تاریخ نگاروں پر نوٹ لکھئے :

جواب: (الف) عہد ایلخانی کے آغاز میں جو تاریخ نگار عربی زبان میں لکھتے تھے ان میں سے ابن الاثیر صاحب الکامل و الاسد الغابہ اور ابوالفرج صاحب مختصر التاريخ الاول نمایاں ترین حیثیت رکھتے ہیں، فارسی زبان میں لکھنے والوں میں مہناج سراج بوزجانی صاحب "طبقات ناصری" کو نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔ "طبقات ناصری" ۲۳ ابواب پر مشتمل ہے اور شروع سے لے کر منگول کے حملے کے وقت تک کے واقعات کا جائزہ دیتی ہے۔ یہ تاریخ تاتار حملہ کے متعلق ایسی بہت سی دلچسپ باتیں بیان کرتی ہے جو دوسری کتابوں میں درج نہیں۔ ابوالشرف تاصح نے تاریخ الیمینی "کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ "جہانکشاہ" جوینی پر نظر پڑتی ہے۔ جو عطا ملک

جوینی کی تصنیف ہے۔ انسوی نے عربی زبان میں جلال الدین خوارزم شاہ کی سوانح عمری ۴۲-۱۲۲۱ء میں مکمل کی۔ ابن علیکان کی مشہور کتاب ”وفایات الاعیان“ ۱۲۷۲ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ جوینی کی مشہور تصنیف ”باب الایاب“ بھی اسی زمانہ میں وجود پذیر ہوئی۔

عبد اللہ بن فضل اللہ شیرازی و صاف کی تصنیف تاریخ و صفات تاریخ جہا نکشائے جوینی کے ضمیمہ کے طور پر لکھی گئی اور پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ زبان اس کی نہایت سنجیدہ اور مشکل ہے۔

مشہور تاریخ نویس رشید الدین فضل اللہ غازان کا وزیر تھا اس نے اپنی تصانیف کی کتابت، آرائش اور حفاظت پر وصاف کے قول کے مطابق ساٹھ ہزار دینار کی کثیر رقم صرف کی تھی۔

غازان نے رشید الدین کو بہت ادا ددی اور حوصلہ افزائی کی، ایلمخانی بادشاہ نے قابل مصنف کو فارسی زبان میں ایک جامع، مبسوط اور حقیقت پر مبنی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ جس میں ہر تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ہلاکو کی اولاد کے کارناموں اور فتوحات کی ہر وہ تصویر اتاری جائے۔ چنانچہ ۱۳۱۰ء میں ”جامع التواریخ“ مکمل ہوئی۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔

جامع التواریخ فارسی زبان میں بہترین تاریخوں میں سے ایک ہے۔ رشید الدین دو سال بعد تک التجائتو کے عہد حکومت کی تاریخ ضمیمہ کے طور پر لکھتا رہا۔ جامع التواریخ میں ہر ممکن ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دنیا کے وجود میں آنے سے لے کر التجائتو کے عہد تک کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

جامع التواریخ کے علاوہ رشید الدین نے عربی زبان میں بھی کچھ کتابیں لکھیں۔

رشید الدین کے بعد اس کے قابل ترین شاگرد حمد اللہ مستوفی قزوینی نے فن تاریخ کی ایک اہم خدمت انجام دی اس نے ۱۳۳۱ء میں تاریخ گزیدہ مکمل کی جس سے متعلق اس نے کم و بیش چوبیس ماخذ بیان کئے ہیں۔ تاریخ ”گزیدہ“ ایک فاتحہ چھ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ یہ کتاب انسائیکلو پیڈیا کے طور پر لکھی گئی ہے۔

حمد اللہ نے ۱۳۳۱ء میں ظفر نامہ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ شہنوی ظفر نامہ ایک منظوم تاریخ ہے جو شاہنامہ فردوسی کی تقلید میں اور اس کے ضمیمہ کی صورت میں لکھی گئی۔ اس میں حضرت محمد صلعم کی زندگی سے آغاز کیا گیا ہے اور مصنف کے وقت تک کے یعنی ۳۲۱-۳۳۱ء تک کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

نصیر الدین البیضوی کی کتاب ”نظام التواریخ باو آدم سے لے کر ۹۵۴ھ تک کے واقعات بیان کرتی ہے۔

۱۳۱۷ء میں ابوسلیمان داؤد نے ایک تاریخ تالیف کی۔ ابوسلیمان ماورالنہر کے ایک قصہ بناکت کارہنے والا تھا۔ اس نے کتاب کا نام تاریخ بناکتی رکھا گیا۔ یہ کتاب دراصل جامع التواریخ ہی کا خلاصہ ہے جس میں سلطان ابوسعید کے عہد حکومت تک کے حالات مندرج ہیں۔ تاریخ بناکتی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کئی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو عام طور پر مسلم مصنفین

کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔

محمد ابن علی کی تصنیف مجمع الانساب میں شروع سے لیکر عہد مصنف تک کی تاریخ دی گئی ہے۔

احمد تبریزی نے ایک منظوم تاریخ شہنشاہ نامہ یا چنگیز نامہ کے نام سے لکھی۔ اس میں اٹھارہ ہزار شعر ہیں اور ۳۸۸-۳۸۹ھ تک کی تاریخ نظم میں مرتب کی گئی ہے۔ شہنشاہ نامہ اپنے پیشرو ظفر نامہ کے معیار کو نہیں پہنچتا۔ شہنشاہ نامہ ابو سعید کے نام پر مکتوب ہے۔

نور الدین ابن شمس الدین محمد نے ۶۲-۶۱ھ عیس میں شہنشاہ نامہ کی مانند ایک منظوم تاریخ غازان نامہ کے نام سے مکمل کی۔ یہ نظم بحر متقارب میں لکھی گئی ہے اور نو دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے فنی اعتبار سے یہ دونوں تاریخی نظمیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ (ب) تیموری عہد حکومت کو بھی تاریخ نگاری کے لحاظ سے امتیاز حاصل ہے۔ تیمور بھی محمود غزنوی کی طرح اس بات کا خواہشمند تھا کہ مفتوحہ علاقوں سے اہل فن کو آڑا کر لے جائے۔ اور اپنے دربار کی علمی و ادبی زینت میں اضافہ کیا جائے۔ ایسے اہل فن میں سعد الدین تفتزانی، السید الشرف جرجانی اور ابن عرب شاہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ابن عرب شاہ کو تیمور ۷۱۷ھ میں اپنے ساتھ دمشق لے گیا تھا۔ ابن عرب شاہ کی مشہور ترین تصنیف عجائب المقدور فی ذائب تیمور ہے۔ یہ کتاب امیر تیمور کی سوانح عمری ہے مصنف نے

محمود کے خلاف اس میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن عرب شاہ کی تصنیف فقہ الخلافہ بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔  
 الفیروز آبادی صاحب قاموس (وفات ۱۰۱۲ھ) بھی سوانح نگاری کے لئے مشہور ہے۔

تیمور کے وقت کا اولین تاریخ نگار نظامی شامی تھا۔ اس نے تیمور کی زندگی ہی میں ظفر نامہ لکھا۔ بعد میں شرف الدین علی بنوی نے بھی نظامی شامی کی پیروی میں ایک ظفر نامہ لکھا۔ اگرچہ شرف الدین کے ظفر نامہ کو نظامی شامی کے ظفر نامہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ شہرت حاصل ہے تاہم جس تصنع عبارت کی پیروی کی۔ تراکیب کی شان و شوکت اور الفاظ کی مار دھار سے شرف الدین نے کام لیا اسے ایک تاریخ نگاری زبان کے لئے پسند نہیں کیا جاسکتا۔ حافظ آبرو امیر تیمور اور شاہ فرخ (پسر امیر تیمور) کا درباری مورخ تھا۔ اس نے اپنی مفصل اور جامع تاریخ دو زبدۃ التواریخ کہ ۱۰۲۶-۱۰۲۷ء میں مکمل کیا۔ یہ تاریخ چار جلدوں پر مشتمل ہے اور دنیا بھر کی تاریخ پر حاوی ہے۔ عبدالرزاق سمرقندی (وفات ۱۰۸۲ھ) نے زبدۃ التواریخ کو سامنے رکھ کر مطلع السعدین لکھا۔ اس کی دو جلدیں ہیں جن میں تقریباً ۷۰ سال کے واقعات درج ہیں۔ یعنی خاندان ہلاکو کے آخری تاجدار ابو سعید کی پیدائش (۱۰۳۵ھ) سے لے کر امیر تیمور کے پڑپوتے ابو سعید کی وفات (۱۰۶۸-۱۰۶۹ھ) تک بلکہ اس سے بھی دو ایک سال زیادہ عرصے تک مصنف ان دونوں ہمنام حکمرانوں کو مبارک ستارے

(سعدین) فرض کرتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنی کتاب کا نام مطلع سعدین رکھا۔ جزوی تفصیلات، واقعہ نگاری اور غلبہ مشاہدات نے اس تاریخ کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

معین الدین محمد نے روضۃ الجنات فی مدینۃ الہرات کے نام سے ہرات کی تاریخ لکھی۔ اس میں ۱۷۷۱ء تک کے واقعات درج ہیں۔ میرخوند نے روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخواص کے نام سے دنیا بھر کی ایک مفصل اور بسیط تاریخ لکھی۔ اس میں تخلیق عالم کے وقت سے لے کر ۱۷۷۱ء تک کے واقعات درج ہیں۔ کتاب کے خاتمے پر آخری تیموری حکمران سلطان حسین کی تاریخ خاص طور پر لکھی گئی ہے۔ میر علی شیر نوائی اسی سلطان حسین کا وزیر تھا۔ ایران جدید کے مایہ ناز ادیب رضاقلی خاں لالہ باغی ہدایت نے روضۃ الصفا کو اپنے وقت تک مکمل کر دیا ہے، 'خوند میر کی پہلی تصنیف خلاصۃ الاخبار و روضۃ الصفا ہی کا خلاصہ ہے۔ اسی کی مفصل تر تصنیف حبیب السیر ۱۵۲۳ء میں لکھی گئی۔

قصیحی کا شاہکار مجمل تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا ایک بیش قیمت مرقع ہے۔ اس کی خاص دلچسپی اور فوائد کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لکھنے میں قصیحی نے غیر معمولی ماحذوں سے امداد لی ہے۔

سوال: شیخ سعدی شیرازی کی زندگی کے حالات قلم بند کیجئے اور اس کی شاعری پر سیر حاصل تمیزہ لکھئے۔ یعنی اس کے کلام کی خوبیاں بیان کیجئے۔



جواب: شیخ مشرف الدین بن مصلح الدین بن عبد اللہ سعدی شیرازی کی تاریخ ولادت کے متعلق محققین میں ابھی تک چند اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ عام خیال کہ آپ ۱۱۸۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے قرن صواب نظر آتا ہے مگر سرگوسلی کی رائے کہ آپ کی پیدائش ۵۸۹ھ میں ہوئی سب سے زیادہ قابل اعتنا ہے۔ ایک بات جو ہم پرے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ شیخ سعدی مظفر الدین تھلا بن رنگی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اور مدرسہ نظامیہ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے تعلیم پائی۔ آپ کی کلی رغبت فقر، درویشی، دینیات، علم، سلوک اور علم و ادب کی طرف مائل تھی۔ شیخ نے اپنا تخلص اپنے سرپرست سعد بن رنگی کے نام کی نسبت سے کیا تھا۔

۱۲۲۶ھ تک شیخ تعلیم میں مصروف رہے۔ ۱۲۵۶ھ تک سفر میں۔ سرگوسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطہ سے قطع نظر سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیاح دیکھنے میں نہیں آیا۔ اسلامی ممالک کی وسیع سیاحت کے علاوہ چار بار ہندوستان میں آنا ہوا۔ دس بارہ دفع پایادہ چمکے۔ شیخ کی زندگی کا تیسرا اور اہم ترین دور جو ۱۲۵۶ھ سے شروع ہوا کہ ۱۲۹۱ھ یا بقول دیگر ۱۲۹۱ھ میں بہر حال ان کی وفات کے ساتھ ختم ہوا سب سے زیادہ قابل التفات ہے کیونکہ اس دوران میں ہی آپ کے غیر فانی شاہکار معرض وجود میں آئے۔

شہرہ آفاق مثنوی بوستان ۱۲۵۷ھ میں اور ملی جلی نشر و نظم

کایے مثال مرقع گلستان<sup>۱۲۵۸</sup> میں ظہور پذیر ہوا۔

شیخ کی نشر میں مستحج اور مضع فقرے سادہ فقروں میں ایسی آمیزش رکھتے ہیں جس طرح کہ شمیم کی مثال میں، رشم کے تار فطرت کے بیان میں سعدی کا کلام فی الواقع لاثانی ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں بتاتا بلکہ صرف بھولی بسری وارداتیں یاد دلانا ہے۔ علم و ادب کا حال و قال اور قص و سرود کی محفلوں میں سعدی کے اکثر اشعار دلوں کو گرماتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ سعدی نے پند و موغلت کے جو قص کرتے ہوئے دریا بہائے ہیں ان میں براہ راست حاصل کئے ہوئے بجز بات کی رنگین موحیں کچھ اس انداز سے مچھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ اہل نظر کے دل و دماغ مسحور ہو جاتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ کیفیات عارضی نہیں ہوتیں۔ سعدی کی لطافت، لطافت اور بذلہ سنجی یونان کے مشہور شاعر ہوریس سے ملتی ہے شیکسپیر اور سعدی میں جو مشترکہ چیز پائی جاتی ہے یہ ہے کہ دونوں عقل و عادت کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتے۔ بالکل فطری اور حقیقت حال پر مبنی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ بیان سادہ، صاف اور دھلا ہوا ہوتا ہے۔ کلام کی بنیاد بلند نظری اور نصیحت پر رکھتے ہیں۔ مولانا حالی نے گلستان کی یہ خوبیاں بیان فرمائی ہیں :-

داستان کی سادگی، الفاظ کی ترکی اور گھلاوٹ، ترکیبوں کا سادھاؤ، بیان کی صفائی، عبادت کی دلنشینی، خیالات کی ہمواری، مبالغہ میں اعتدال، ماخذ کی سہولت، حسن ترتیب، تمثیلات کی لطافت اور ہر جہتی، استعارات کی نزاکت اور کلمات ..

کی شوخی۔

شیخ کی غزلیات کے چار دیوان موجود ہیں:-

(۱) غزلیات قدیم (۲) خواتیم (۳) بدائع (۴) طبیات۔

چاروں میں صفائی، روانی، بے محایا نگاری اور سلاست

کے اعتبار سے بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ فارسی غزل چھٹی

صدی ہجری کے دوران وجود میں آچکی تھی۔ اس کی نسبت یہ امر

مسلم ہے کہ سب سے پہلے کمال نے ہی اس کا خاکہ قائم کیا تھا

جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجدین گئے۔ اس

میں کوئی شبہ نہیں کہ سعدی ہی سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے

اپنی سخن نگاری سے غزل کو مقبول عام بنایا۔ اگرچہ خواجہ شیرازی

(حافظ) نے کسی حد تک خواجہ کرمانی کی پیروی میں غزلیں لکھیں

لیکن آپ نے سعدی کو استاد ماننے سے انکار نہیں کیا ہے۔

استاد غزل سعدی ست پیش ہمہ کس اما

دارد سخن حافظ طرزِ روشِ خواجو

غزل کا جو انداز سعدی نے قائم کیا وہی فارسی اور اردو

میں آج تک رائج ہے۔ مسائل تصوف، فلسفہ زندگی، رموز

عشق اور اخلاق و حکمت کی باریکیاں غزل میں سب سے پہلے

سعدی نے ہی بیان کیں۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جو آج بھی غزل

کی جان ہیں۔ شیخ کی غزلوں میں کمال درجے کی صفائی اور سادگی

کے پہلو بہ پہلو ایک گونہ نزاکت اور چھل پن بھی ہے۔ سنگریزوں

کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گراں بہا

بنادینا کچھ آپ ہی کے حصے میں آیا ہے  
 دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست  
 تا ندانند حریفان کہ تو منظور منی  
 گر کند میل بہ خوبان دل من خورده مگیر  
 کایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند  
 شیخ کا کلام دنیا کے ہر مہذب انسان کے لئے ہمیشہ کے واسطے  
 مشعلِ راہ رہے گا

بداند حق مردم نیک و بد      مگوائے جوانمرد صاحبِ خرد  
 کہ بد مرد را خصم خود مے کنی      و گر نیک مرد است بد می کنی  
 یہ تقسیم جس قدر فلسفیانہ ہے اور اس استدلال میں جس  
 قدر فلسفہ ہے اسی قدر واقعی اور عملی ہے۔ علامہ شبلی نے شیخ کی  
 اس تلخ پردہ دہری کو بہت سراہا ہے جو آپ نے نام نہاد صوفیوں  
 کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ ایک جگہ نظر بازوں کے متعلق کس پوش  
 کے ساتھ فرماتے ہیں

گرد ہے نشینند با خوش پسر      کہ با پاکبازیم و اہل نظر  
 زمن پسر فرسودہ روزگار      کہ برسفرہ حسرت خورد روزہ دار  
 چرا طفل یک روزہ ہوش نبرد      کہ در صبح دیدن چہ بالغ چہ خورد  
 ایک قطعے میں شیخ نے چغل خوری کی کیا خوب مذمت کی

زباں کرد شخصے بہ غیبت دراز      بد وقت دانندہ سر فراز  
 کہ یاد کساں پیش من بد مکن      مرا بد گماں در حق خود مکن

سعدی کے جوشِ عشق کا اندازہ اس کے ایک ہی شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

من آن نیم کہ حلال ز حرام نشنم شراب با تو حلال است و آبِ تو حرام  
گلستانِ بوستانِ اور غزلیات کے علاوہ شیخ کی کلیات میں قصائدِ شری، قصائدِ فارسی، مرثی، قطعات، ترجیع بند، رباعیات، ہزلیات، غزلیات، مضمون کات اور ہند نامہ کے سے عناصر بھی ملتے ہیں۔ قصیدے میں شیخ کو دیگر تمام شعرا پر اس بات میں فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے بھول کر بھی کبھی چاپلوسی اور خوشامد کی طرف دھیان نہیں دیا بلکہ دلیرانہ نصیحتیں کی ہیں اور ظلم و بدی کے برے نتائج کے خلاف بادشاہوں اور امیروں کو متنبہ کیا ہے اور انہیں نیکی پر مائل ہونے کی تلقین فرمائی ہے۔

مندرجہ ذیل چار خوبیاں شاعری کی روح ہوا کرتی ہیں۔ اور چاروں ہی شیخ کے ہر شعر سے جھانگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

۱۔ خیالات حقیقت اور واقعہ پر مبنی ہوں۔

۲۔ خیالات ایسے ہوں کہ ان میں ایک قسم کا نرالا پن اور اچھڑتا انداز پایا جائے۔

۳۔ خیالات کو عمدہ بیان کا جامہ پہنایا جائے۔

۴۔ شاعر کے دل میں جبکہ وہ کوئی مضمون ادا کر رہا ہو کم و بیش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہئے۔

دومی ٹیسی کا عقیدہ ہے کہ سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی زبان میں شعر کہا لیکن ہندی شعرا کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے

سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ وہ سعدی دراصل دکن کی سرزمین سے اٹھا تھا۔

شیخ سعدی کی ہمہ گیر شہرت اور مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کے یہاں ہر ذوق کے موافق اور ہر مزاج کے مطابق کافی مسالہ موجود ہے۔

سوال: محمود شبستری کی زندگی اور اس کے فلسفہ یا تصوف پر نوٹ لکھئے یعنی اس کے صوفیانہ عقائد کی وضاحت کیجئے۔

جواب: شیخ سعد الدین محمود بن عبدالکریم شبستری تبریز کے نزدیک قصبہ شبستر میں پیدا ہوئے۔ اسی جگہ پرورش اور ابتدائی تعلیم پائی ان کی زندگی سے متعلق زیادہ واقفیت دستیاب نہیں ہے۔ البتہ انہیں الحاکم اور ابوسعید کے عہد میں کافی شہرت نصیب ہوئی اور آپ کا شمار تبریز کے نامور صوفیاء اور علما میں ہوتے لگا۔ دین و حکمت کے مسائل میں آپ کو گہری دلچسپی اور دسترس تھی۔ اس لئے ایسے معاملات میں آپ سے اکثر رجوع کیا جاتا تھا۔ ان مسائل کے حل کے لئے لوگ آپ سے سوال کرتے اور آپ ان کا جواب دیتے۔ آخر انہوں نے صوفیانہ مسائل پر سوال اور جواب کی صورت میں ایک کتاب لکھی جس کا نام گلشن راز رکھا۔

اس کتاب میں دینی معاملات اور تصوف کے عقائد و مسائل پر بحث کی گئی ہے گو وہ باقاعدہ شعر و شاعری نہیں کرتے تھے۔ اور عام طور پر صوفیانہ موضوعوں پر نثر میں ہی رسالے اور کتب تالیف



کرتے تھے۔ لیکن گلشن راز انہوں نے مثنوی کی صورت میں لکھی۔ اور آپ کی شہرت کا مدار اسی منظوم تصنیف پر ہے۔ اس میں تصوف کے دقیق اور مشکل مسائل کو دلکش اور صاف اشعار میں سلجھایا گیا ہے۔ فن شعر پر البتہ مطالب و معانی کو ترجیح دی گئی ہے۔ بعض مقامات پر حسن بیان اور شعریت کی داد دی گئی ہے۔ آپ نے سنیہ میں وفات پائی اور شبستر میں مدفون ہوئے۔

نثر فارسی میں آپ کی تصنیف ”حق الیقین“ قابل قدر ہے۔ اس کے علاوہ ”شواہد نامہ“ بھی آپ کی منشور تالیف ہے۔ دین کے مسائل پر یہ قابل اعتناء تصانیف ہیں۔

گلشن راز میں ذیل کی قسم کے مضامین ہیں:-

وحدت: انسان کا اصلی کام یہ ہے کہ حق و باطل میں تمیز کرے وہ دنیا کی ہر شے میں فیروذات دیکھے۔ عارف جزئیات عالم میں کل (ذات حق) کو پاتا ہے۔ اسے سوائے ذات خدا کے کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ وحدت کا جلوہ کثرت میں دیکھتا ہے۔ دنیا کی گونا گونی اور رنگا رنگی وہ خدا کی ذات کے مختلف مظاہر سمجھتا ہے۔ حقیقت ایک اور واحد ہے البتہ اس کی صفات یا جلوے بے شمار ہیں۔

محقق را کہ وحدت در شہود است      نخستین نظر بر نور وجود است  
دے کمز معرفت نور و صفادید      ز ہر چیزے کہ دید اول خدا دید

ایمان بالغیب: انسان ضعیف العقل ہے۔ ذات حق کا دیدار جو اس کی حدود سے بالاتر ہے۔ عقل کو درک ذات حاصل نہیں ہو سکتا۔ عاقل جتنا عقل و دانش سے کام لیتا ہے۔

اور صنائعِ عالم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی وہ اس سے  
 دُور ہوتا جاتا ہے۔ عقل انسان کو راہِ راست سے بھٹکاتی ہے  
 اور اُسے گمراہ کر دیتی ہے۔ خدا کی ذاتِ دلیل و برہان اور عقل  
 و فہم کی دسترس سے باہر ہے۔ تزکیہ نفس سے عالمِ غیب اور  
 ذاتِ حق تک رسائی ہو سکتی ہے۔ جس طرح چمگا دُر نورِ آفتاب  
 سے چند صیّا جاتی ہے اور اس کا دیدار نہیں کر سکتی اسی طرح  
 انسان کی عقل نورِ ذات سے متجَر و پریشان ہو جاتی ہے نہ  
 رہا کُن عقل را با حق ہے باش کہ تاب خورندار و چشمِ خفاش  
 ہمہ عالم ز نورِ اوست پیدا کجا او گردد از عالمِ ہویدا  
 منازلِ معرفت؛ عارف یا سلاک کو راہِ حقیقت پر چہرہ  
 خاص منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں:-

۱۔ پہلی منزل وہ ہے جب وہ اپنی خامیوں اور بُرائیوں کو دُور  
 کرتا ہے۔ اپنی ہستی کو ہر قسم کے غیب اور نقص سے پاک کرتا ہے،  
 دل کو آلائشِ گناہ سے صاف کرتا ہے۔ اس منزل یا عمل کو  
 تخلیہ کہتے ہیں۔

۲۔ دوسری منزل یا مرحلہ یہ ہے جب وہ اچھی عادات و  
 فضائل کا اکتساب کرتا ہے۔ نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے اپنے  
 نفس کو اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کرتا ہے۔ زہد و تقویٰ کی مشق  
 لیتا ہے۔ یہ تخلیہ کا درجہ ہے۔

۳۔ ان دو منزلوں کو عبور کرنے کے بعد وہ شریعت کے احکام  
 و اصول کی پیروی کرتا ہے۔ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتا

ہے۔ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بناتا ہے۔ ایثارِ نفس سے کام لیتا ہے۔ حرص و آرزو کے پنجے سے رہائی پالیتا ہے۔ خودی یا ”میں“ کی قید سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا نفس روشن ہونے لگتا ہے۔ مقامِ علم سے گزر کر وہ عرفانِ یکشف و شہود میں قدم رکھتا ہے، یہاں تک کہ شریعت سے طریقت میں پہنچ جاتا ہے اور قربِ ذات حاصل کرتا ہے۔ اب وہ جلوہ کثرت میں وحدت کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ تجلیہ کا مقام ہے۔

۴۔ اس چوتھی منزل میں وہ علم و دانش کی حد سے گذر کر حقیقت شناسی کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب وہ عارف کا درجہ پالیتا ہے۔ اس کی نظر میں عالم و معلوم، من و تو، عارف و معروف کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ خودی یا ہستی کے احساس سے بالاتر ہو جاتا ہے اور ذاتِ حق اور اپنی ہستی کو ایک ہی سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انا الحق کا نعرہ لگائے لگتا ہے کیونکہ اب اسے اپنے وجود میں سوائے حق کے کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔

ہر آنکس را کہ اندر دل شکست نیست یقین داند کہ ہستی مجزئیکہ نیست  
جناب حضرت حق را دولی نیست در آنحضرت من و ما و توئی نیست  
”گلشنِ راز“ میں ایک ہزار شعر ہیں جن میں صوفیانہ مطالب و معانی کو تفصیل اور توضیح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جیسے انسانی لفظ اور اس کے حدود، جزو کل، حادث و قدیم، حق سے عارف کا وصال اور تصوف کی اصطلاحات اور کنایات کی وضاحت وغیرہ وغیرہ

سوال : مولانا جلال الدین رومی کی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ سپرد قلم کیجئے۔

جواب : مولانا روم جس زمانے میں ہوئے ہیں (۱۲۰۷ھ تا ۱۲۷۳ھ) دین شاہ جے ایرانی اُسے ”عصر عرفان و اخلاق“ کا نام دیتا ہے۔ تصوف اور فلسفہ کے دقیق مسائل کے اظہار اور روحانی جذبات کی ترجمانی کے لحاظ سے مولانا روم کی شنوی کا آج تک جواب نہیں ہو سکا۔

شنوی مولوی معنوی بہت قرائں در زبان پہلوی  
مولانا کی غزلیں بھی ایک گونہ سرور اور نشے سے معمور ہیں۔ لیکن انہیں شنوی کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اوحادی کے بعد خواجہ فرید الدین عطار، مولانا روم، عراقی وغیرہ نے غزل کی نہایت ترقی دی۔ لیکن یہ لوگ چونکہ عشق حقیقی کے جاندار تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں حقیقت کا پہلو غالب رہتا تھا۔ اس بنا پر ان کی غزلیں عام نہ ہوئیں۔

مولانا روم کو زمرہ متکلمین سے خارج کرنا سخت نا انصافی ہے کیونکہ شنوی میں دینی مسائل کو خوبی اور وضاحت کے ساتھ سلجھایا ہے۔ علم کلام کا مطلب ہے فلسفہ قرآن یا شریعت جس کی توضیح شنوی میں قابل داد ہے آیات قرآنی کی تشریح سادگی، سلاست، تمثیل اور وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے۔

مولانا روم کا نام محمد اور لقب جلال الدین ہے اور عرف مولانا روم۔ حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد سے تھے۔ آپ کے والد بہاء الدین

۶۱۰ھ میں نیشاپور پہنچے۔ خواجہ فرید الدین عطار ان کو ملنے آئے مولانا روم کی عمر اس وقت پچھ برس کی تھی۔ عطار نے اپنی مثنوی ”اسرارنامہ“ مولانا کو پیش کی۔ اس زمانہ میں جو لوگ سلاطین روم کہلاتے تھے وہ سلجوقیہ کی تیسری شاخ تھی جو ایشیائے کوچک پر قابض ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ایشیائے کوچک کو روم کہتے تھے یہاں قیام پذیر ہونے کے باعث مولانا کا تخلص روم ہوا۔

مولانا روم ۶۱۷ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ شیخ بہاء الدین کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بلند پایہ فاضل تھے۔ مولانا کے والد نے مولانا کو ان کی آغوش تربیت میں دے دیا۔ مولانا نے اکثر علوم و فنون انہی سے حاصل کئے ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں قزوین میں آئے۔ جب ان کے والد نے انتقال کیا تو اس کے دوسرے سال یعنی ۶۲۹ھ میں تکمیل فن کے لئے شام کا قصد کیا۔ اس زمانے میں دمشق اور حلب علوم و فنون کے مرکز تھے۔ مولانا کی زندگی کا دوسرا دور در حقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے۔ مختلف تذکروں اور تاریخوں میں یہ واقعہ مختلف اور متناقض طریقوں سے منقول ہے۔

حسام الدین چلبی مولانا کے معتقدان خصوصی میں تھے۔ آپ ہی کی استدعا پر مولانا نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ مولانا نے ۶۷۲ھ میں وفات پائی۔

جن دنوں مولانا کی عمر چالیس برس کی تھی اور آپ تحصیل علوم

میں مصروف تھے دمشق میں شیخ محی الدین اکبر سے آپ کی ملاقات ہوئی۔

شیخ سعدی لکھتے ہیں "بلاد روم میں ایک صاحب جلال پیدا ہوا ہے یہ غزل اُسی کے ثرائی حقیقت کا ایک نغمہ ہے۔"  
کیسی لطف کی بات ہے کہ شیخ سعدی اور مولانا روم دونوں ہی تاتاری سیلاب کے ٹھنڈے پانی سے متاثر نہ ہوئے۔

مولانا کی تصنیفات - ۱۔ فیہ مافیہ - یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

۲۔ دیوان - اس میں تقریباً پچاس ہزار شعر ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ درحقیقت مولانا روم کے اصلی دیوان میں تیس ہزار شعر تھے۔ باقی اشعار بعد میں ان کے نام سے منسوب کر دیے گئے۔

۳۔ مثنوی - یہی کتاب ہے جس نے مولانا روم کے نام کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو مات کر دیا۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۶۶۶۰ چھبیس ہزار چھ سو ساٹھ ہے جیسا کہ کشف الظنون میں مذکور ہے۔  
دیوان صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ قصیدہ یا قطعہ وغیرہ مطلق نہیں ہے۔ مولانا کی شاعری کا دامن مدح کے داغ سے پاک ہے حالانکہ ان کے معاصرین میں سے عراقی اور سعدی تک جو آریاب حال میں نامور ہیں اس عیب سے نہ بچ سکے۔



تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ مولانا کے کلام میں جو وجد، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے اور وہ اس کے کلام میں نہیں۔ وہ خطرناک جوش طبیعت رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں جو جلال، ادعا، بے باکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے صوفیہ میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ مرزا غالب مولانا کے ایک شعر پر جو بقا کی حالت کا ہے سر دھنا کرتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے۔

بزیز کنگرہ کبریا شش مرغانند فرشتہ صید پیغمبر شکار ویزداں گیر  
خیام نے اکثر رباعیوں میں وجود روح، معاد اور جزا و سزا سے انکار کیا ہے۔ اور اس پر خطابی یعنی شاعرانہ دلائل قائم کئے ہیں مولانا نے اکثر اشعار میں اس قسم کے خیالات کو اسی شاعرانہ پیرایہ میں رو کیا ہے۔

صاحب ”مجمع الفصحی“ نے لکھا ہے کہ ایران میں شاہنامہ، گلستان، مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کے برابر کسی کتاب کو مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ یہ امر یقینی ہے کہ مولانا نے حدیقت سنائی اور مد منطق الطیر کو سامنے رکھ کر مثنوی لکھی۔ مولانا زیادہ تر قیاس مثنوی سے نہیں بلکہ قیاس تمثیلی سے استدلال کرتے ہیں۔ اے کہ باہر دل ترا رازے دگر ہر گدا و بردرت نازے دگر مثنوی صفت تصوف ہی نہیں بلکہ عقائد و مسائل دینی اور علم کلام کی بھی عمدہ ترین کتاب ہے۔

گفت پیغمبر اگر کو بی درے لاجرم ازوے بروں آید سرے

موجودہ علمِ کلام کی بنیاد امام غزالی نے قائم کی اور رازی نے اس عمارت کو عرشِ کمال تک پہنچایا۔ اس وقت سے آج تک سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ سارا دفتر ہمارے سامنے ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ مسائل و عقائد جس خوبی سے ثنوی میں ثابت کئے گئے ہیں یہ تمام دفتر اس کے آگے بچ نہیں۔ شمس تبریز سے مولانا کو ایسی عقیدت تھی کہ کئی صدیوں سے آپ کا دیوان ”دیوان تبریز“ کے نام سے مشہور ہے۔ شمس تبریز کی موت نے مولانا کے دل پر اس قدر یاس و الم طاری کر دیا تھا کہ آپ ایک عرصہ تک غم میں محو رہے۔ سماع کرنے والے درویشوں کا طبقہ (مولوی) اُسی وقت سے چلا آ رہا ہے۔

”مولانا کے کلام میں حافظ کے کلام کا سا حسن رنگ و مہر نہیں اگرچہ شعر کو تصوف کی لطیف چاشنی دینے میں مولانا نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی“ (نگارین)

اگر بعض مغربی نقاد مولانا کی غزلوں کے اشعار کو ثنوی پر ترجیح دیتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آخر ان کی غزلوں میں ایسے ایسے جواہر پارے بھی تو موجود ہیں۔  
بخدا خبر ندارم چو نماز مے گذارم کہ تمام شدر کوئے کہ امام شہر فلانے

سوال: کمال الدین اسماعیل کی زندگی کے حالات پر نوٹ لکھئے اور اس کے کلام شمسِ خوں کا جائزہ پیش لیجئے۔  
جواب: آپ کا نام اسماعیل اور کمال تخلص تھا۔ آپ کے

والد حمید الدین عبدالرزاق ایک بلند پایہ اور نامور شاعر تھے۔ اور صاحب دیوان بھی۔ اسماعیل نے مذہبی علوم حاصل کئے شاعری کا ملکہ فطری اور موروثی تھا۔ شاعری میں آپ نے واقعی کمال پیدا کیا۔ خاندانِ شاعرانہ سے تعلق رکھتے تھے اور خوارزم شاہ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا۔ اہلِ شاعرانہ سخن فہم تھے اس لئے شعر کی قدر کرتے تھے چنانچہ وہ کمال کو بھی راضی دیتے تھے۔ ایک تذکرہ میں مذکور ہے کہ کمال نے ایک قصیدہ سلطانِ سیجریا کی مدح میں بھی لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

جبابِ ظلم تو برداشتی ز چہرہ عدل      نقابِ کفر بکشادی از رخِ ایمان  
حضرت شہاب الدین سہروردی کی مدح میں بھی ایک قصیدہ کہا جو اس کے دیوان میں موجود ہے۔

شاعر کی وفات نہایت دردناک حالات میں ہوئی۔ ۶۳۵ھ میں جب اوکٹائی قان نے اصفہان میں قتلِ عام کا حکم دیا اس وقت آپ گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اور کوئی ان کے ساتھ داخل نہ کرتا تھا۔ اکثر لوگ نقدی وغیرہ ان کے گھر میں لا کر امانت کے طور پر رکھ دیتے تھے۔ گھر میں ایک کنواں تھا وہ ان امانتوں کا مخزن تھا۔ جب شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا تو ایک ترک کمال کے گھر کی طرف آہٹھا۔ اس نے ایک پرندے کو غلیل سے مارنا چاہا اتفاق سے زہ گیر اڑ کر کنوئیں میں جا گری۔ ترک کنوئیں میں اتر۔ زہر و جاہر کا انبار دیکھا۔ اس کی آتشِ حرص بھڑک اٹھی۔ سمجھا کہ اور بھی خزانے ہوں گے۔ کمال اسماعیل کو دھوکا دیا کہ بتاؤ باقی مخزن کہاں ہیں۔

شاعر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ترک نے غصے میں آکر آپ کو ہلاک کر دیا  
مرنے وقت ذیل کی رباعی اپنے خون سے دیوار پر لکھی ہے  
دل خون شد و شرط جانگدازی بین آں در حضرت تو کمینہ بازی این است  
بایں ہمہ بیج دم منے باید زد شاید کہ ترابندہ نوازی این است  
بید جینا میں لکھا ہے کہ ترک کی انگوٹھی کنوئیں میں گر گئی تھی اس  
لئے وہ انگوٹھی کو نکالنے کے لئے کنوئیں میں آئرا۔ اس کے مطابق یہ واقعہ  
۶۲۶ھ کا ہے۔

تبصرہ: کمال کی شاعری تقدس اور متاخرین کے درمیان کے  
سلسلہ کی بیچ کی کڑی ہے یعنی قایم اور جدید کے مابین حد فاصل کا کام  
کرتی ہے۔ اس کا ایک سرا قدما اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے۔  
قایم شعرا کی متانت بختگی استواری اور متاخرین کی مضمون بندری  
خیال آفرینی نزاکت مضمون دونوں یکجا جمع ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے  
کہ متوسطین اور متاخرین دونوں آپ کے معترف ہیں۔ خواجہ حافظ  
فرماتے ہیں :-

گر باورت تے شود از بندہ این حدیث از گفتہ کمال دلیلے بیبا ورم  
گر بر کم دل از تو ویر دارم از تو ہر آں ہر کہ افگم و دل کجا برم  
عرفی خراج تحسین ادا کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

مر از نسبت ہمدردی کمال غم است دگر نہ شعر چہ غم دارد ار غلط خوانی  
آپ کے ہم عصر محقق طوسی نے بھی آپ کی بلند پایگی کو تسلیم کیا  
ہے اور اپنی کتاب معیار الاشعار میں آپ کا ذکر انتہائی تعظیم اور قدر  
کے لہجے میں کیا ہے۔

کمال کی شاعری کی خصوصیات: ۱۔ جدت خیال و مضمون  
آخری - اپنے کلام میں کمال نے نئے نئے مضامین باندھے ہیں۔ ان نادر  
اور اچھوتے خیالات پر ہی متاثرین کی مضمون آفرینیوں کی بنیاد ہے۔  
پوشیج باز کردہن را بوعفیاو چرخش درست اشرفی اندر دہان نہاد  
افکند چارفل ہلال آسمان دوبار تبارکاب خواجہ عنان بر عنان نہاد  
۲۔ مشکل طرہیں: آپ بعض اوقات مشکل اور ادق طرحوں میں شعر

کہتے ہیں۔ اور ان میں نئے نئے مضامین پیدا کرتے ہیں۔  
در گرد عزم او نہ رسد برقی گرم رو وراثتش بود بشل چوں شرابائے  
از زمین بہت لبر آرام چوں مور پر از غلط عجز اگرچہ نادر چوں ماربائے  
۳۔ سلاست زبان: کمال کی شاعری کی خاص خصوصیت زبان کی صفائی  
اور روانی اور الفاظ کی سادگی ہے۔ اس لحاظ سے فارسی کے مشہور شاعر  
ظہیر قاریابی پر سبقت سے گئے۔

سپیدہ دم کہ نسیم بہار سے آید نگاہ کردم و دیدم کہ یار سے آید  
شراب در سرو چہرہ ز شرم رنگسبز چہن میانہ شرم و حقار سے آید  
ز لبکہ داشت دل خستہ بستہ در فراک چہن نمودم انز شکار سے آید

۴۔ بھوگوئی میں لطافت پیدا کی۔ بھوگوئی کا مہیا سوزنی اور انوری  
نے لگادیا تھا۔ یہ بھوجوں کی زبان بن گئی تھی۔ کمال نے اس میں نفاست  
و لطافت پیدا کی جس سے بھوکا نشانہ (امیر یا حاکم) خود مزہ لیتا تھا۔  
کمال نے بھوج میں طراقت کا رنگ پیدا کر کے اسے خوشگوار صورت  
دی۔ ایک بھیل کی بھوج میں فرماتے ہیں۔

بدن نان خواجہ چوں بُردم خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم

گفتش خواہ میر و خواہ میر  
۵۔ غزل کی نسبت یہ امر مسلم ہے کہ سب سے پہلے غزل کا خاکہ کمال  
نے ہی قائم کیا۔ جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ جو جاہلین گئے  
کمال نے غزل میں سادگی، صفائی، رنگینی اور وحدت مضمون پیدا کی  
دوش بگوشم و در شام ہمیداد مرا  
خدا متشکرم و پنداشت کہ من نشنیدم  
چوں نذر دین تیرے کتم در سینه تیرے  
بدان تانے بہ تر تیرے دیگر اندازد  
یہ ہمیشہ جان من رسم تو بے گنہ گشتی  
ہمچہ نمے کشی مرا من چہ گناہ کردہ ام  
۶۔ ربابی کو جس قدر کمال نے ترقی دی اس کی نظیر قدما و متوسطین

میں نہیں ملتی ہے

در دیدہ روزگار غم بائے یا با غم او صبر بہم بائے  
یا مایہ غم چوں عمر کم بائے یا عمر بہ اندازہ غم بائے

سوال: اوحدی مراغہ ای پر مختصر نوٹ سپرد قلم کیجئے۔

جواب: رکن الدین اوحدی مراغہ کارہنے والا تھا اور سن ۷۷۵  
کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ اس کی ولادت مراغہ میں ہوئی اور ابتدائی  
تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی لیکن زندگی کا بیشتر حصہ اصفہان میں  
 بسر کیا۔ شاعر کو مشہور صوفی و عارف ابو جابد اوحد الدین کرمانی سے  
بیعت تھی۔ اس نسبت سے ہی اوحدی تخلص کیا۔

اوحدی، آذربائیجان کے مشہور صوفی شعرا میں سے تھا اور دنیا  
تصوّف، عرفان اور اخلاق کے مسائل میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔  
اسے آخری مثنوی اہل خانہ سعید کے عہد میں خاصی شہرت



و عزت حاصل ہوئی۔

اوحدی نے اپنے قصائد میں سلطان ابو سعید ایل خانی اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد بن خواجہ رشید الدین فضل اللہ کی مدح سرائی کی ہے۔ اوحدی کے دیگر ان میں قصاید کے علاوہ غزلیات میں عرفان و تصوف کے مضامین خوش اسلوبی کے ساتھ دوائے ہیں۔ قصاید میں مدح گوئی کے ساتھ ساتھ معرفت کے نکتے بھی بیان کیے ہیں۔ مرثیوں میں زور اور لطافت ہے۔ اس کے علاوہ ایک شہنوی "منطق العشاق" بھی ہے جو وحید الدین شاہ یوسف زبیر خواجہ نقیر الدین طوسی کے نام پر مفعول ہے۔ اس شہنوی کا دوسرا نام "وہ نامہ" ہے۔

اوحدی کی ایک اور بلند پایہ اور مشہور شہنوی "جام جم" ہے۔ یہ سلطان ابو سعید ایل خانی کی مدح میں ہے۔ اس کے وزیر غیاث الدین محمد کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ یہ شہنوی پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ۸۳۲ھ میں لکھی گئی۔ پہلی شہنوی "وہ نامہ" ۸۳۸ھ میں نظم ہوئی۔ اوحدی نے ۸۳۸ھ میں انتقال کیا اور مراغہ میں مدفون ہوا۔

اوحدی کی شہرت کا مدار زیادہ تر اس کی شہنوی "جام جم" پر ہے۔ اس میں تصوف اور معرفت کے دقیق مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اخلاق اور ہند و موعظت کا رنگ بھی خوب ہے۔ اس شہنوی کو فارسی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

نہودنہ کلام :-

عدل بے علم بیخ و بیر نکند  
برقوی پنجہ دست کیں مکشا  
حکم بے عدل و علم اثر نکند  
برضیعت وزیوں کیں مکشا

شرم داراے پدر ز فرزند  
بالسر قول زشت و فحش مگو  
ناپسندیدہ بیچ مپسند  
تا نگر دو لبیم و قاحتہ گو  
نظرش ہم ز کار باز مدار  
نکشد محنت او ز بد بختی  
بچہ خویش را ہناز مدار  
چوں بخواری بر آید و سختی

سوال : امیر خسرو کی زندگی کے حالات لکھئے اور اس کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔

جواب : ایران میں عہد الیمانی فارسی شاعری کے لئے کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ لیکن ہندوستان میں نظامی گنجوی کی روح کا گم کر رہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں ایک بہت بڑا شاعر وجود میں آیا جس کا فارسی کلام اہل زبان (ایرانیوں) تک کے لئے قابل رشک ہے۔ وہ امیر خسرو تھا۔ نام اس بادشاہ سخن کا یمین الدولہ ہے۔ امیر تیمور کا ہم وطن تھا۔ سیف الدین محمود باپ اس کا چنگیز خاں کے زمانے میں شہر کش سے بھاگ کر ہند میں آیا۔ ناصر الدین محمود ابن شمس الدین التمش بادشاہ دہلی نے ارکان دربار میں داخل کر لیا۔ غیاث الدین بلبن کی طرف سے چند روزہ سندھ و بہ پنجاب کی پائی۔ وہ قضا کے الہی سے ایک لڑائی میں مارا گیا خسرو اس

وقت سات یا نو برس کا تھا۔ خسرو کا بڑا بھائی یا نانا اس کا بچا  
 اس کے نو گری یاد شاہی بجالاتا تھا اور اس کی پرورش کرتا تھا۔  
 امیر خسرو <sup>۵۳۲ھ</sup> میں بمقام پٹیالی پیدا ہوا۔ اس زمانہ کے  
 ایک ولی مشہور تھے۔ باب اُسے ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے  
 دور سے دیکھتے ہی کہا تو صاحب کمال کو لئے آتا ہے کہ جو خاقانی سے  
 کئی تیر آگے بڑھ کر قدم مارے گا۔ سلطان نظام الدین اولیا کے دل  
 میں ان کی گرمی کلام کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ اشعار سن کر مزے  
 لیتے تھے اور کہتے تھے۔ اہی ترک بچے کے سوز دل کا واسطہ میرے  
 گناہ بخشدے۔

اسپر نگر صاحب کہتے ہیں کہ خسرو شہزادہ محمد سلطان ابن  
 غیاث الدین بلبن کے دربار میں ملازم ہوا۔ خسرو کو قرآن داری  
 کی خدمت تھی۔ اگرچہ خسرو علم فاضلانہ اور طبع حلیمانہ رکھتا تھا لیکن  
 نیکو کاری اور بے آزاری کو اپنا دستور العمل کیا تھا۔ عبادت اور  
 ریاضت کے ساتھ مذہب صوفیانہ اور بے تعصب رکھتا تھا  
 شاعری میں ایسا نازک خیال اور صاحب اختراع کم پیدا ہوا  
 ہے۔ بہت سے صنائع و بدائع میں خود صاحب ایجاد ہے۔ قصاید  
 اس کے خاقانی اور انوری سے مرتبہ میں کم نہیں۔ بلکہ صنائع و بدائع  
 تجنیس، ایہام وغیرہ میں متقدمین پر فائق ہے۔

امیر خسرو کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی  
 لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی  
 تاہم یقینی ہے کہ پندرہ بیس برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و

فنون سے فارغ ہو چکے تھے۔

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا جب سلطان محمد نے ان کو بلا کر شہر اپنے خاص میں داخل کیا۔ جب وہ سلطان کا حاکم مشرر ہو کر گیا تو ان کو دوران کے ساتھ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے۔

ارغواں ہلاکو خاں کا پوتا تھا۔ اس کے امرا میں سے تیمر خاں نے جن دنوں ہندوستان پر حملہ کیا وہ امیر خسرو اور حسن کو گرفتار کر کے بلخ لے گیا۔ امیر خسرو نے نہایت پُر اثر مرثیے لکھے اور دلی بھیجے دو سال گزرنے پر امیر کو تارکیوں کی قید سے کسی طرح رہائی نصیب ہوئی اور وہ دہلی میں واپس آ گئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کی موت کے بعد سلطان جلال الدین خلجی نے اپنی تخت نشینی کے بعد خسرو کو اپنا ندیم خاص بنایا۔ جلال الدین خلجی کے بعد علاؤ الدین خلجی اور اس کے بعد قطب الدین مبارک تخت نشین ہوا۔ قطب الدین امیر خسرو کو نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے مثنوی ”نہ سپہر“ کے معاوضہ میں امیر کو باغی کے برابر روپے تول کر دیئے۔

خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد سلطان غیاث الدین نے خسرو کی خوب قدر دانی کی۔ امیر نے اس کے نام پر ”تغلق نامہ“ لکھا جس میں تغلق کے عہد حکومت کی تاریخ مفصل درج ہے۔ خسرو نے ۷۳۲ھ میں انتقال کیا۔

امیر خسرو علم موسیقی میں مہارت کلی رکھتے تھے۔ کئی رسالے

اس ضمن میں ان کی تصنیف سے ہیں ”نثر آنہ“ انہیں کی ایجاد ہے۔  
 ریاضی کے فن پر بھی آپ کی تصنیفات موجود ہیں۔  
 پنج گنج نظامی کے مقابلے میں امیر خسرو نے غنیمت لکھا ہے۔  
 بعض اہل تنقید غنیمت خسروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ اس ترجیح  
 میں قدرے مبالغہ نظر آتا ہے۔

خسرو خسروی میں ذیل کی شہادیاں شامل ہیں:۔

۱۔ مطلع الانوار: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کے  
 جواب میں لکھی گئی۔ اس میں دینی اور اخلاقی مضامین اور مسائل ہیں۔  
 یہ ۶۹۸ھ میں تصنیف ہوئی اور علاء الدین محمد شاہ کے نام سے  
 منسوب کی گئی۔

۲۔ شیریں و خسرو: یہ مثنوی نظامی کی اسی نام کی مثنوی کے  
 جواب میں ۶۹۸ھ میں منظم ہوئی۔ یہ مثنوی بھی علاء الدین محمد  
 کے نام پر معنون کی گئی۔

۳۔ مہجوں و لیلیٰ: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی لیلیٰ و مہجوں کے  
 مقابلے پر لکھی گئی۔ یہ مثنوی بھی مذکورہ بالا سال یعنی ۶۹۸ھ میں  
 پایہ اختتام کو پہنچی۔

۴۔ آئینہ سکندری: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ”سکندر نامہ“  
 کا جواب ہے۔ اور ۶۹۹ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ بھی اسی سلطان یعنی  
 علاء الدین کے نام سے منسوب کی گئی۔

۵۔ ہشت بہشت: یہ مثنوی ۷۰۰ھ میں لکھی گئی اور نظامی  
 کی تصنیف ”ہفت پیکر“ کے جواب میں ہے۔

یہ پانچ مثنویاں تین سال کی مدت میں مکمل ہوئیں۔  
ایک روایت کے مطابق امیر نے گلستان سعدی کی پیروی  
نیں ایک کتاب "شکرستان" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ  
امیر خسرو کا دیوان ہے جس میں بیشتر قصائد ہیں جو دہلی کے سلاطین  
کی مدح میں ہیں۔ اس دیوان کے پانچ حصے ہیں:-

۱۔ تحفۃ الصغرا۔ یہ امیر خسرو کی جوانی کا کلام ہے جو قصائد  
غزلیات اور ترجیع بند پر مشتمل ہے۔ محمد وحید میں سلطان غیاث الدین  
بلبن، اس کا بیٹا اور حضرت نظام الدین اولیا شامل ہیں۔

۲۔ وسط الحیوة: یہ شاعر کے کلام کا وہ حصہ ہے جو بیس اور  
تیس سال کی عمر کے درمیان کہا گیا۔ اس میں وہ قصائد شامل ہیں جن  
میں سلطان بلبن، اس کے بیٹے اور شاعر کے مرئی نصرت الدین  
سلطان محمد اور سلطان معز الدین کی قباد کے علاوہ حضرت نظام الدین  
اولیا کی مدح کی ہے۔

۳۔ غرۃ الکمال: یہ اگلے دس سال کا کلام ہے۔ اس میں  
قصائد کے علاوہ فارسی شاعری کی خوبیوں اور عربی شاعری پر اس کی  
برتری کا بیان ہے۔ اور بلند پایہ شعرا مثلاً سنائی، خاقانی، سعدی  
اور نظامی کے ذکر سے استناد کیا ہے۔ قصائد میں سلطان کی قباد  
جلال الدین فیروز شاہ، رکن الدین اور علاء الدین وغیرہ کے علاوہ  
حضرت نظام الدین اولیا کی مدح ہے۔ اس میں ترجیع بند اور  
قطعات بھی ہیں۔

۴۔ بقیہ نقیہ: یہ امیر کی پچاس سال کی عمر کے بعد کا کلام ہے۔



اس میں قصائد میں جن میں علاء الدین محمد شاہ اور اس کے بیٹے اور دیگر امراء کی مدح سرائی ہے۔

۵۔ نہایت الکھماں۔ یہ کلام امیر کے بڑھاپے کے آخر ہی لیا گیا ہے۔ اس میں جتنے قصائد شامل ہیں وہ سلطان غیاث الدین تغلق کی مدح میں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مرثیہ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کا بھی ہے۔

مذکورہ بالا کلام کے علاوہ امیر خسرو کی اور تصنیفات منظوم و منثور یہ ہیں۔

قرآن السعیدین، مہر، مفتاح الفتوح۔ آپ نے ہر قسم کے صنف نظم پر طبع آزمائی کی۔ مثلاً غزل، قصیدہ، ثنوی، رباعی، مستزاد، نظمیں، ترکیب بن، ترجیع بند وغیرہ۔ اشعار کی مجموعی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ برج بھاشا میں بھی آپ نے بہت کچھ کہا۔ غزل، پہیلیاں وغیرہ آپ کے نام سے مشہور ہیں۔ ترکی اور فارسی کے علاوہ عربی اور سنسکرت میں بھی کامل مہارت حاصل تھی۔

نثر میں آپ کی تصنیف عجائب خسروی بھی ہے۔ یہ انشائیہ دہلی کا قابل قدر نمونہ ہے۔ مناقب ہند، تاریخ دہلی بھی آپ کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

دول رانی اور خضر خاں میں آپ نے تاریخی واقعات کو نظم کیا ہے۔

سوال: عبید زاکانی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ لکھئے؛  
جواب: عبید زاکانی ہجو اور ہزل میں نہایت مشہور شاعر ہے۔

ایسا فحش و اہیات کہنا ہے کہ جسے کوئی اشتراک لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ مگر باوجود اس کے جو کلام کہ اس رو سیاہی سے پاک ہے وہ ایسا صاف از رنگین ہے کہ شریعت خضر کی لذت رکھتا ہے۔ زانہ ایک قصبہ کا نام ہے جو قزوین کے علاقے میں ہے۔ یہ اصل میں تیریا کا رہنے والا تھا۔ بتدریج حال میں علوم درسیہ کو بڑے شوق سے حاصل کیا۔ علم معانی و بیان میں کتاب تصنیف کی قزوینی اور صلہ کی امید پر خوشی خوشی بادشاہ کے پاس بے چلا۔ جب دروازہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بادشاہ کے پاس کوئی نسخہ ہے کسی کو بار نہیں۔ علیحدہ کوبرا معلوم ہوا اور خیال کیا کہ جب جاہ و دولت اور بادشاہوں کی قربت میں کمال کا کوئی کام نہیں تو پھر راتوں کو جاگنا اور خون جگر کھا کر عیش و آرام کو اپنی جان پر حرام کرنے سے کیا حاصل؟ وہیں سے اٹھ کر پھر اور یہ رباعی کہی

دعالم و ہنر مشو چون صاحب فن      تانزد عزیزان نہ شوی خوار چو من  
خواہی کہ شوی قبول ارباب زمن      گنگ ورو گنگری کن و گنگرہ زن

اور اسی وقت سے ہزل اور ہجو میں پڑ کر ایسا و اہیات کہنا شروع کیا کہ جس کی کچھ حد نہ رہی۔ باوجود اس کے فصاحت لفظی الفاظ کی خوبی، صفائی نظم کی اور حسیت بندش کی اور ترکیب کی ایسی ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی سنجیدہ نظموں میں شیراز کی تعریف نمایاں ہے۔ وہ مثنوی المذہب تھا جیسا کہ نبی کریم صلعم اور چاروں خلفاء کی تعریف سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن ہزلیات کے علاوہ بھی اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کی اتنی خواہش یا محبت

اس کے دل میں موجود نہیں تھی۔ فرض اور مفلسی عبید کی قسمت میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

شیخ ابوالفتح البخاری کے عہد میں عبید شیراز میں رہا۔ عبید کی موت ۳۳۷ھ میں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغداد یا تبریز یا ان دونوں مقامات پر اسے سلطان اولیس کی سرپرستی حاصل تھی (شیخ اولیس جلائری خاندان کے بانی شیخ بزرگ کا بیٹا اور جانشین تھا۔ خاندان جلائری ایلخانی طاقت کے زوال پر وجود میں آیا تھا) جو وہنزل گئی میں عبید زاکانی سلطان بخر کے درباری شاعر سوزنی کا پیروکار تھا۔ نثر میں اخلاق الاشرف عبید زاکانی کی مشہور تصنیف ہے جس میں اس نے اخلاق کی رواجی کتابوں کا مذاق اڑایا ہے۔ یہ کتاب ۳۴۷ھ میں لکھی گئی۔ اس میں یادہ سرائی سے قطع نظر بہترین طنز کا خوب حق ادا کیا گیا ہے۔ عبید کا مذاق سلیم مسلمہ ہے۔ اس کی شوخی اور جرات سے کسی کو انکار نہیں۔ اس کے انداز بیان کی تقلید ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دوسرے شاعروں کے سنجیدہ اشعار کی مضحکہ خیز تفسیر اس کا خاص فن ہے۔

اس کی تصنیف تعریفات اس وقت کے مذہب اور رسم و رواج کی خوب خاک اڑاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند تعریفات ملاحظہ ہوں۔

غور و فکر: وہ جو انسان کو بے فائدہ لے ڈوبتا ہے۔

عالم: وہ جسے اپنی روزی کما سنے کی عقل نہ ہو۔

جاہل: خوش بختی کا لاڈلا۔

دلال: بازار کار خستہ شدہ چور۔  
 غم کے بعد خوشی، آخری طلاق وغیرہ وغیرہ۔  
 رسالہ جانگشا کے سبق امیر لطیف اور رسالہ صد پند کے دلا فرزند  
 چٹکلے عبدی زاکانی کے کماں تجربات، واقفیت عامہ، دنیا داری  
 اور اس کے نلم و فن پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کی تصنیفات  
 میں ریش نامہ، عشاق نامہ اور فالنامہ بھی شامل ہیں۔  
 عبدی نے فارسی اور عربی نظم و نثر میں قریباً ایک سو دس برس  
 دکھائی دیے۔ انیسویں صدی کے مشہور ادیب مرزا حبیب اعظمی  
 نے ہزلیات میں عبدی کی پیروی کی ہے اور بعض اوقات اس پر ہفت  
 بھی لے گیا ہے۔

سوال: خواجہ کرمانی کی زندگی کے حالات بیان کیجئے اور  
 اس کی شاعری پر تنقید و تبصرہ لکھئے۔

جواب: کمال الدین ابو العطار محمود بن علی بن محمود خواجہ کرمانی  
 کی تاریخ ولادت کے متعلق محققین میں ابھی تک پورا اتفاق نہیں۔  
 براؤن تاریخ ادبیات ایران میں خواجہ کی پیدائش کا سال ۱۷۷۷ء  
 مطابق ۱۲۸۱ء بتایا ہے لیکن خواجہ کے کچھ اپنے اشعار سے جو کہ اس  
 کی شاعری ”گل و نوروز“ میں ملتے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۸۶ء  
 مطابق ۱۲۹۰ء پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف یعنی کرمان  
 میں ہی پائی۔

اس نے بچپن ہی میں ایک بار آنے والی شہرت اور مقبولیت  
 کا خواب دیکھا تھا۔ اور یہ رفتار زمانہ کے ساتھ درست ثابت ہونا گیا۔

خواجہ کو کسی خاص دربار کا شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ سب سے پہلے اس نے مظفری خاندان کے بانی مبارز الدین محمد کے دربار میں شعری شاعری کے گل رکھلائے۔ اور بعد ازاں شیخ ابوالسحاق فرمانروائے شیراز کے دربار میں ممتاز ترین شاعر خیال کیا جانے لگا۔ یہاں سے وہ شروان شاہ اور پھر قزل ارسلان شہزادہ عراق کے حضور میں جا پہنچا۔ تاہم اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد اور شیراز میں ہی بسر ہوا اگرچہ تمام عمر کرمان کی یاد ستاتی رہی۔

خواجہ نے مشہور مرد کامل علماء الدولہ سمنانی سے تصوف کی تعلیم پائی۔

غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اس کو ترقی دی۔ اگرچہ ان شیریں ذراؤں کے سامنے خواجہ کی غزل گوئی کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم وہ قصیدہ اور مثنوی میں اس قدر ممتاز اور نام آور تھا کہ اس کے اثر نے غزل میں بھی کام دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خواجہ نے غزل میں کچھ جدتیں بھی پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق و طبع کے موافق تھیں۔ اس طرح سے خواجہ کی غزلوں میں شیخ سعدی کی سادگی، ادا اور شگفتگی بیان کے پہلو بہ پہلو ایک امتیازی رنگینی بھی آگئی حتیٰ کہ جب غزل کے بادشاہ خواجہ حافظ شیرازی نے انکھیں کھولیں تو تمام ملک پر خواجہ ہی کا رنگ چھار پاتا تھا۔ جس طرح سے خواجہ نے غزل نگاری میں سعدی کی پیروی کی تھی ویسے ہی خواجہ حافظ نے خواجہ کی تقلید کی۔ حافظ نے خود فرمایا ہے کہ استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس آتا

دارد سخن، حافظ طرز روشنی خواجو  
خواجہ حافظ اور خواجو کی ہم طرح غزلوں میں عیا بجا مصرعے تک  
اڑ گئے ہیں۔ اور مضامین اور ترکیبوں میں تو کثرت کے ساتھ توازن  
پایا جاتا ہے۔

سعدی، خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی  
کے جذبات اور معاملات بیان کئے جاتے تھے۔ خواجو نے دنیا کی  
بے ثباتی، وسعتِ مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا۔ اکثر مسلسل  
غزلوں کو انہیں خیالات کے لئے وقت کر دیا۔ حافظ نے بھی اپنے کلام  
کے ایک معتد بہ حصے کی بنیاد انہیں خاکوں کو سامنے رکھ کر ڈالی۔

علامہ شبلی نعمانی نے خواجو اور حافظ کے کچھ اشعار کا موازنہ کیا ہے  
گرچہ حافظ کی ترجیح میں کسی کو کلام نہیں تاہم کچھ اشعار میں خواجو کے یہاں  
زیادہ بے تکلفی، رنگینی، معاملہ بندی، برہستگی، صفائی، لطافت، وسعت  
اور خوش بیانی پائی جاتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

## خواجو کرمانی

(۱)

دورِ اہانتِ مغال ماینر ہمدستانِ شدم  
کاچنیں رفت است از روز ازل تقدیر ما

(۲)

عقن اگر داند کہ دل در بندش چوں خوش است  
عادلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما

(۱)

گر شدم از بادہ بدنام جہاں تدبیر چیست  
بچین رفت است از روز ازل تقدیر ما

(۲)

مادل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم  
لے بسا عاقل کہ شد دیوانہ زنجیر ما



از رنگین گو عالم سوز ما غافل مشو (۳)  
تیر کہ باز گویں بگذر جانان خوش  
کز کمان بریم رخش سخت باشد تیر ما  
رحم کن بر جان خود پر سیر کن از تیر ما  
(۴)

منزل زیارتی بہت ہے۔ دوزخ چہ بہشت  
ہر کس طالب یارانہ چہ ہر شیار و چہ مست  
بچہ کہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ گشت  
ہر جا خانہ بخشق است چہ سیر چہ گشت  
خواب جو کے رنگ تغزل کا ایک ہی شعر ہے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے  
آزاد گشت از ہم آن کو غلام گشت  
بیگانہ شد ز خویش کسے کاشانی گشت  
دیہ کی ناپائیداری کا بیان کس جوش اور عیرت آمیز اشارے کے ساتھ  
کیا ہے۔

مشہور ملک ایمان مالی قاروں شد  
کہ مال و ملک بود در حقیقت یاد  
براؤں کا خیال ہے کہ خواب جو کے کلام میں اچھوتی یا امتیازی خوبیاں بہت  
کم ہیں۔ البتہ طرز ادب میں روائی اور رنگینی ہے۔ اکثر مشرقی نقادوں کو  
اس رائے سے اتفاق ہے۔ کیونکہ غزل، قصیدہ اور مثنوی میں خواب جو کو  
کئی اور شعرا نے مات کر دیا ہے۔

خواب جو کے دیوان میں غزلیات اور قصائد کے علاوہ مقطعات اور  
رباعیات وغیرہ بھی ہیں۔ اس نے اپنے مشہور پیشرو نظامی گنجوی کی پیروی  
میں ایک نمونہ بھی لکھا ہے جس کو اس نے ۱۳۲۳ء میں مکمل کیا۔ اور  
جس میں ذیل کی شنوایاں شامل ہیں :-

۱۔ ہمائے ہمایوں : تاریخی رنگ میں لکھی ہوئی عشقیہ داستان  
ہے۔ اس میں تین ہزار دو سو تین اشعار ہیں۔ ۱۳۲۳ء میں پایہ  
اختتام کو پہنچی۔

۲۔ گل و نوروز: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ”خسر و شیریں“ کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس میں دو ہزار چھ سو پندرہ اشعار ہیں۔ تاج الدین عراقی کے نام پر معنون ہے۔ خواجہ کی بہترین مثنوی ہے۔

۳۔ روضۃ الانوار: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ”محزن الاسرار“ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس کا موضوع عرفان و تصوف ہے۔ ۸۴۳ھ میں نظم ہوئی اور شیخ ابوالاسحاق کے وزیر شمس الدین محمود صابن کے نام پر معنون ہے۔

۴۔ کمال نامہ: یہ مثنوی نظامی کے ”ہفت پیکر“ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور شیخ ابوالاسحاق اینجو کے نام پر معنون کی گئی ہے۔ اس میں عرفان و تصوف کے مسائل پر بحث ہے۔

۵۔ گہر نامہ: یہ مثنوی خسر و شیریں کے وزن پر لکھی گئی ہے۔ اور اس میں تصوف کے مضامین ہیں۔

اس کے علاوہ خواجہ نے شاہنامہ فردوسی کے پیش نظر ایک تاریخی نظم بعنوان سامنامہ بھی لکھی۔

خواجہ نے ۷۵۰ھ اور ۷۶۳ھ کے درمیان غالباً ۷۵۳ھ میں وفات پائی اور خواجہ حافظ کی مرغوب سیرگاہ ”تنگ الشراکبر“ میں مدفون ہوا۔

سوال: عراقی ہمدانی پر نوٹ لکھئے۔

جواب: عراقی نے ۷۸۹ھ میں وفات پائی۔ آپ کے کلام میں جا بجا پرچوش صوفیانہ خیالات، جدت ادا اور بلند بانگ جذبات کی لطیف چاشنی پائی جاتی ہے۔ عراقی ایک حد تک آزاد مشرب

قلندر تھے۔ جن کا مذہب محبت تھا۔ اور جنہیں کائنات کے ذرے  
 ذرے میں محبت ہی کا نور موجزن نظر آتا تھا۔ حسن ازلی وابدی کی  
 جھلک آپ حسن انسانی کے ہر آنے میں دیکھتے تھے۔ ستر برس کی  
 عمر میں عراقی کو قلندروں کے ایک جمع کے ساتھ ہندوستان میں آنا  
 ہوا۔ جہاں آکر وہ ملتان میں شیخ بہاء الدین ذکرِ پاک کے مرید خاص  
 ہو گئے۔ یہیں انہوں نے مولانا خیر غزل کی جس کا مشہور شعر یہ ہے  
 ہر عالم ہر کجا درد و غمے بود بہم گردند و عشقش نام گردند  
 عراقی نے اشعار میں شاعر اعظم ابن العربی کا فلسفہ جگہ جگہ نظر  
 آتا ہے۔ عراقی عشق حقیقی کا جاندار تھا۔ اس لئے اس کے کلام  
 میں حقیقت کا پہلو غالب رہتا ہے۔ عراقی کی غزلوں میں زور ہے  
 گداز اور روانی۔ اس کے تخلیل میں ندرت ہے اور بیان میں جوش۔  
 اس کے وجد اور تغزل کا نمونہ حاضر ہے۔  
 بر لبِ خود بوسہ و آنگہ سپں      ذوقِ آبِ زندگانی اے سپر

زر دے لطف و دلداری بیاسا مانِ کارم کن  
 کہ خود را بے تو ساماتے نئے بنیم نئے بنیم

بزمیں جو سجدہ کردم ز زمیں ند ابر آمد      کہ مرا خراب کردی بہ سجدہ ربانی  
 چوں براہِ کعبہ رستم بہ حرم رہم نداؤند      کہ بیرون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

غزلیات کے علاوہ نثر میں لمعات آپ کی مشہور ترین تصنیف ہے

جس کی تفسیر مولانا جاحی نے لکھی ہے۔ دیوان کے علاوہ عراقی نے دو قطعیں بھی ثنوی کی صورت میں لکھیں۔ جن میں سے ایک کا نام عشاقی نام ہے۔

سوال: ابن تمین کی زندگی کے حالات مختصر طور پر لکھیے  
اور اس کی شاعری پر تبصرہ کیجیے۔

جواب: ابن تمین کے والد کا نام محمود تھا۔ قوم کے ترک اور ترکستان وطن تھا۔ سلطان محمد خدا بندہ کے زمانے میں خراسان میں آئے۔ اور قصبہ فرکرید میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں جانا داور زمین خریدی۔ یہ زمانہ سلطان الحجازی کی حکومت کا تھا۔ اور علاء الدین محمد وزیر تھا۔ علاء الدین ان کا بڑا اندر دان تھا۔

ابن تمین فرکرید میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا فن اپنے باپ سے سیکھا۔ اور ابتدا میں انہی طرحی میں شعر کہے جن میں باپ کہتا تھا۔ شروع شروع میں سرمداروں کی مداحی کی۔ آخر کار فقر و قناعت اختیار کی اور دربار داری سے کنارہ کش ہو گئے۔ تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی۔ اس پر کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ۷۹۰ھ میں وفات پائی اور مرثیہ وقت یہ رباعی کہی ہے۔

منگر کہ دلی ابن تمین پر خوش شد      ہنر کہ ازیں سہ لے فانی چوں شد  
صحف بکفت تو شمیم بر روی دوست      بایک جاہل غمزہ زناں ہیروں شد

ایرانی شعر میں ایسے شاعر کم ہوئے ہیں جنہیں ابن تمین کی طرح زمانے کے مصائب و آلام سے اکثر سامنا کرنا پڑا۔ ابن تمین نے جبکہ

جگہ کی خاک چھانی اور در در کی کٹھن کو کھائی۔ امیرزوں سے درویشی اور  
سربداروں و قیدیوں کی بایں تڑائیوں اور فتنہ و فساد کے سبب  
ایران کے بہت سے حصوں خاص طور پر خراسان میں قتل و غارت  
کا بازار گرم رہا شاعر کو جان بچانے کے لئے جا بجا گھومنا پڑا اور  
ایک دربار سے دوسرے دربار میں پناہ لیتی پڑی۔

شروع میں ابن زین نے خواجہ غلام الدین محمد اور کھبر اس کے  
بھائی خواجہ غیاث الدین محمد کی مدد کی مگر ان کی وجہ سے سربداروں  
نے اقتدار حاصل کیا تو وہ غلام الدین کے ساتھ گراں پڑنے لگے۔ اور  
وہاں طفایہ پور کی مدد کی۔ اس کے بعد خراسان کا رخ کیا اور سربداروں  
باخداوس و جہیر الدین مسعود کی مدد بہر قصیدے لکھے۔ اس کے  
بعد میرات چلے گئے اور امرائے آل کرت کے تلاح ہوئے۔ ان میں  
معز الدین سے خاص طور پر انعام و اکرام پایا۔

ابن تیمین کی زندگی کا نہایت دردناک واقعہ اس لئے کلام کا  
تلف ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں جب سربداروں اور آل کرت کے مابین  
جنگ ہوئی تو شاعر کا دیوان گم ہو گیا۔ غالباً ضائع ہو گیا۔ شاعر کا بھی  
گراں قرار کے ہر ات لایا گیا جہاں امیر حسین کے رحم و کرم سے رہائی  
پائی۔ غلام علی آزادید بھٹا میں لکھتے ہیں کہ میں نے ان کا دیوان وال  
کی رہنمائی تک دیکھا ہے۔ لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہو گا۔ تذکرہ  
سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ غزنوی اور قصائد سب لکھتے تھے  
بعد بھٹا میں ان کی غزل کے بعض اشعار نقل کئے گئے ہیں۔  
سرمہ لکھ دیکھ ہر دم اشکیا غماز مرا تانسا ز دناش پیش مردمان راز مرا

ز خود بیگانه بودن در رہ عشق بہ آں معشوق طرح آشنائی است  
 ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں لیکن ہن  
 کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت اور خود داری  
 ان کا خاص حصہ ہے۔ ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کسی اور  
 نہ کر سکا اور چونکہ ان کا قال حال کی تصویر ہے اس لئے خاص اثر  
 رکھتا ہے جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکتا ہے

دو قرص نان اگر از گندم است یا از جو دو جامہ اگر کہنہ بہست یا خود نو  
 بہ چار گوشہ دیوار خود بخاطر جمع کہ کس نگویا زیں جابجوز و آنجا رو  
 ہزار یار فروں تر بہ نزد ابن یمن ز فتر مملکت کی قباد و کیجھسرو

اگر دو کاؤ بدست آری و مرعہ یکے امیر و یکے را وزیر نام گنی  
 ہزار قدر جو کفایت معاش تو نہ شود روی و نان جوے از یہود و ام گنی  
 ہزار بار ازاں بہ کہ از پے خدمت مکر بندی و بر مرد کے سلام گنی

ابن یمن عالم و فاضل ہونے کے علاوہ بڑا پرہیزگار اور نیکسل  
 تھا۔ خوش خلقی اور انکساری ان کی خاص خوبیاں تھیں۔ اوصاف حمیدہ  
 کے انشباب کے بارے میں شاعر خود کہتا ہے

من اندر کسب اسباب فضائل نکر دم بیچ تقصیر و توانی  
 ہنر پروردہ ام زنیساں کہینی بیا انکار کن گر می توانی  
 ابن یمن کے قطعات پند و مواعظت کے مرقعے ہیں۔ ان  
 میں شاعر نے سعی و کوشش اور جدوجہد کی تلقین کی ہے۔ زور یارو



اور عرق جبین سے روزی کمانے کی ترغیب دی ہے۔ حرام کی کمائی سے اجتناب کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ شاعر نے نہ صرف ایسی تعلیم پیش کی ہے بلکہ اس پر خود عمل بھی کیا اور صبر و قناعت کی بے نظیر مثال سامنے رکھی۔ اور کامل طور پر گوشہ گیر ہو گئے۔ یہاں تک کہ دوستوں سے بھی ملنا ترک کر دیا۔

گوشہ لے گیر و کناری ز ہمہ خلق جاں نامیان تو دو غیرے نبود داد و ستد  
 بگذر از صحبت بہر دم کہ ترا ہست دلی بھی آئینہ و آئینہ زد دم تیرہ شود  
 ابن تمیم مذہب کا شیعہ تھا اور صوفی طبع بھی۔ اس طبیعت کے تعلق سے پر اس نے اشعار بھی کہے ہیں۔ وہ ان قدیم شعرا کے زمرے میں شامل ہے جنہوں نے ائمہ اور شہیدان کو بلا کا ذکر خیر کیا ہے۔  
 ابن تمیم نے قطعہ گوئی کے فن کو خاص صورت اور ترقی دی۔

اس سے پہلے قطعہ پر شعرا نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ قطعات میں ابن تمیم نے ہر قسم کے اخلاقی نکتے بیان کئے ہیں۔ مثلاً حرص و آرزو دنیا پرستی کی مذمت کی ہے۔ خوشامد کو خاص طور پر ایک بری عادت قرار دیا ہے۔ شرافت اور راستبازی کی تعریف کی ہے۔ کم سمی اور کسنگی پر لعنت بھیجی ہے۔ ابن تمیم کو تقدیر پر اعتماد تھا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی روزی منقسم و مقدر کر دی گئی ہے۔ اس لئے حرص و آرزو فضول ہے۔ اور ناکسوں کے آگے ہاتھ پھیلا نا بے غیرتی اور جہالت ہے۔ کسی کی چاپلوسی کو ناحقارت آمیز فعل ہے۔ البتہ کوشش اور عمل زندگی کی شرط ہے۔ جدوجہد انسان کا فرض اولین ہے۔ انسان کو ہر حال میں راضی رہنا چاہئے۔ قناعت اور صبر راحت و سرور کی

کتنی ہے اخلاص میں بھی ظاہر داری اور مہمت کے اظہار کی یوں یقین  
کی ہے ۔

بگاہ فقر تو انگریزائی مہمت باش کہ گرچہ بیچ نداری تیر گد ارتد  
نہ آنکہ باہمہ مستی شوی خمیس مزاج شوی اگرچہ تو خوار و نگدا شمار ند  
مطلب یہ کہ مال سے کمال بہتر اور فزون تر ہے ۔ جیسا کہ سعدی  
نے فرمایا ہے ۔

تو انگریز بدل است نہ بمال  
بزرگی بہ عقل است نہ بمال

الغرض ابن کبیر ایک بے مثال اخلاقی شاعر ہے جس نے  
دین و ایمان اور اخلاقی و عرفان کے نکتے سادہ زبان اور پرتاثر  
ادب میں بیان کئے ہیں اس کے قصائد اور غزلیات میں بھی یہی  
رنگ غالب ہے ۔

سوال : سلمان ساوجی کی زندگی کے واقعات مختصر بیان کیجئے  
اور اس کی شاعری پر مفصل تبصرہ قلم بند کیجئے ۔

جواب : صاحب آتش کدہ کے مطابق خواجہ جمال الدین سلمان بن  
خواجہ علاء الدین محمد بمقام سادہ پیدا ہوئے ۔ سلمان جلا نر خاندان  
کے بانی شیخ حسن بزرگ اور اس کے بیٹے شیخ اویس کا درباری  
شاعر تھا ۔

خواجہ سلمان کی ابتدائی تقریب کا یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے  
حسن ایلخانی کی قیاضیوں کا شہرہ سن کر بغداد کا قصد کیا اور دربار  
میں پہنچے ۔ ایک دن حسن تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا سلمان بھی اس

موقع پر موجود تھے۔ برحسب یہ اشعار لکھنیش کئے سے  
 چودہ بار چابی کہاں رفت شاہ  
 دو تراغ کہاں باغیاں سے پر  
 تہا ز تدر سر بر سر گوش شاہ  
 ہوا ز شمسیت بکشاد و خسر و گرہ  
 شہا تیر در بند تدر بیر تست  
 یہ شعر حسن کر حسن سے سلمان کو اس کی غیر معمولی قدر الکلامی  
 کی بدولت اپنے مقررین خاص میں داخل کیا۔

سلطان حسن کی ترم و لشاد خاتون نہایت قابل اور لائق عورت  
 تھی۔ سلطان پرانے نام بادشاہ تھا سلطنت کا نظم و نسق و لشاد  
 خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شعرا اور علما کی قدر دانی کرتی تھی۔ سلمان  
 نے بھی اس کی نارح میں ہی کھول کر زور طبع دکھایا۔

سلطان اویس کو شاعری کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ خود شعر کہنتا  
 تھا اور سلمان سے اصلاح لیتا تھا۔ اس بنا پر سلمان نے اس کے  
 دربار میں نہایت تقرب حاصل کیا۔

ایک دفعہ سلمان رات کے وقت سلطان اویس کی مجلس عیش  
 میں شریک تھے جلسہ ختم ہو چکا تو سلمان اٹھے۔ سلطان نے ملازم  
 ساتھ کر دیا کہ روشنی دکھانے کے لئے شمع ساتھ لے جائے۔ گھر  
 پہنچے تو ملازم شمع وہیں چھوڑ آیا۔ صبح کو شمع لینے گیا تو خواجہ صاحب اس  
 بنا پر گھبرائے کہ شمع کے ساتھ طلائی تھالی بھی تھی۔ وہ بھی ہاتھ سے  
 جاتی ہے۔ اسی وقت یہ شعر لکھ کر ملازم کو دیا کہ سلطان کی خدمت

میں پیش کرنا ہے

شمع خود سوخت بہ زاری شبِ دوش و امرو

گر لگن مے طلبد شاہِ زمن مے سوزم

سلطان نے ہنس کر کہا کہ شاعر سے کوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے۔

سلمان جب بہت ضعیف ہو گئے تو ملازمت سے استعفا دینا

چاہا اور مسلسل چار قطعے لکھ کر پیش کئے لیکن سلطان نے مزید انعام

و اکرام کا لالچ دے کر مستعفی ہونے سے روکا۔

آخر سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جب تک زندہ رہے

برقم کے تعلقات سے آزاد رہے۔ حسب روایت دولت شاہ

۱۹۹۹ء میں وفات پائی لیکن مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ میں

نے سلمان کا ایک نسخہ ۱۹۹۹ء کا لکھا ہوا دیکھا۔

تبصرہ: سلمان کی شاعری کے کمال کا تمام اساتذہ نے اعتراف

کیا ہے۔ خواجہ حافظ جو اس کے معاصر تھے فرماتے ہیں کہ

سر آمد فضلائے زمانہ دانی کیست زراہ صدق و یقین زراہ کن و بگماں

شہنشاہ فضل بادشاہ ملک سخن جمال ملت و دیں خواجہ جہاں سلمان

سلمان نے شاعری کی عمارت کمال اسماعیل اور ظہیر خاریابی کی

داغ بیل پر قائم کی۔ اکثر قصائد انہی دونوں کے جواب میں اور اسی طرز

میں لکھے ہیں۔ مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ سلمان کے اکثر

مضامین اساتذہ قدیم خصوصاً کمال اسماعیل سے ماخوذ ہیں۔ لیکن

سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں۔

شاعری میں سلمان کا ایک خاص درجہ ہے۔ یعنی وہ قدما اور

متوسطین میں برزخ ہیں۔ ان کا کلام قدما کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے۔ انہوں نے کمال اسماعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے اور اس میں ایجاد مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے مضمون ابتدائی جو متوسطین اور متاخرین کا مایہ انقیاز ہے گو کمال نے شروع کی لیکن سلمان نے اسے حد کمال تک پہنچا دیا۔

سلمان نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے۔ مثنوی ”جمشید و خورشید“ ان کی مشہور مثنوی ہے۔ البتہ سلمان کی شاعری کا اصلی میدان قصیدہ گوئی ہے۔

## فوائد سلمان کی خصوصیات

- ۱۔ زبان کی صفائی اور روانی ۲۔ تراکیب میں چستی ۳۔ مضمون آفرینی (۴) نازک خیالی ۵۔ مخلص یعنی گرمی میں جدت پیرایہ ۶۔ مشکل ردیفیں روانی اور صفائی کے ساتھ۔

سلمان نے نہایت کثرت کے ساتھ قطعات لکھے ہیں اور ان میں ہر قسم کے عجیب و غریب مضامین ادا کئے ہیں۔ مثلاً گھوڑے کی بچو و تعریف، دربار میں جانے سے معذرت کا اظہار، بدن پر کپڑے نہ رہنے کا گلہ وغیرہ وغیرہ۔

سلمان سب سے پہلے شخص ہیں جس نے صنعت ایہام کو نہایت کثرت سے برتا ہے۔ اور اس میں اکثر لطیف اور نئے نئے پیرائے پیدا کئے ہیں۔ لیکن اکثر اس قدر بے اعتدالی برتی کہ ضلع و جلالت کی حد تک نوبت پہنچ گئی۔

مسلمان کی غزلیں چنداں مقبول نہیں ہوئیں۔ ان سے پہلے سعدی کا رنگ عالم کو مسخر کر چکا تھا۔ اس رنگ میں وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس لئے مضمون آفرینی شروع کی۔ لیکن لوگوں نے توجہ نہ دی کیونکہ ان کے کانوں میں سعدی کی آواز گونج رہی تھی۔ سعدی ہی کا رنگ جب خوابہ حافظ نے اختیار کیا اور اس شراب کو اور تیز کر دیا تو دیکھو

”حریفان را نہ سمر حاند و نہ دستار“

اپنی ذوق کی ضیافت طبع سے لئے مسلمان کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

یکشب خیال چشم تو دید بیا خواب      زان شب دیگر چشم ندیدم خواب را  
سوال: خواجہ حافظ کی زندگی اور اس کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالئے۔

جواب: ترجمان البلاغت لسان الغیب خواجہ شمس الدین محمد غفرلہ مطابقت ۱۳۲۰ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا صفحہ کے مصنفات کے رہنے والے تھے۔ آبا کاں قارس کے وقتوں میں شیراز میں آئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ خواجہ صاحب کے والد بہاء الدین نے تجارت سے ہرست خاتمہ اٹھایا۔ خواجہ صاحب کے بچپن ہی میں خواجہ بہاء الدین انتقال کر گئے۔ خواجہ صاحب کے بچپن ہی میں خواجہ بہاء الدین انتقال کر گئے۔ خواجہ صاحب کے دوسرے بھائیوں کو انتظام کا کوئی سلیقہ نہ تھا۔ اس لئے قہورے عرصے میں ہی باپ کی کمائی اٹر گئی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے۔ خواجہ صاحب سن شعور کو پہنچ تو خیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی رات



سے اٹھ کر صبح تک خمیر کو دھتے۔ گھر کے پاس ہی ایک مکتب تھا۔  
 محلے کے سب لڑکے اسی میں پڑھتے تھے۔ خواجہ صاحب اکثر اصرار سے  
 نکلے تو دل میں تعلیم کا شوق پیدا ہوتا۔ رفتہ رفتہ یہ شوق اس قدر بڑھا  
 کہ مکتب میں داخل ہو گئے۔ خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اس میں سے  
 ایک تہائی ماں کو اور ایک تہائی معلم کو دے دیتے۔ بقیہ خیرات کرتے  
 مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا۔ یہی مناسبت آپ کے تخلص کا  
 موجب ہوئی۔

اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چلتا تھا۔ خواجہ صاحب  
 نے بھی طبع آزمائی کی۔ شروع میں چونکہ طبیعت موزوں نہ تھی آپ کے  
 بے تکیہ اشعار اور لغو گوئی کا جگہ جگہ مذاق اڑایا جاتا۔ دو سال تک  
 یہی حالت رہی۔ ایک دن حد سے زیادہ رنجیدہ ہوئے اور بابا کو سہی  
 کے مزار پر جا کر بھوٹ بھوٹ کر روئے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ  
 ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام  
 علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب  
 خضر علیہ السلام ہیں۔ صبح کو اٹھے تو اپنی وہ شہرہ آفاق غزل لکھی جس  
 کا مطلع یہ ہے۔

دوش وقت سحر از غصہ بجا تم دارند و اندر ان ظلمت شب آب جہا تم دادند  
 پھر کیا تھا آپ کی موزونی طبع اور لطافت سخن کے چرچے پھیل گئے  
 مولانا شبلی کا خیال ہے کہ خوش اعتقادی اور ہم پرستی ان واقعات  
 کے دو بڑے ستون ہیں۔

خواجہ صاحب کی رنگ و بو سے معمور زندگی کے بیشتر ایام مغربی

شہزادوں کے زیر سایہ بسر ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بہت سے سیاسی انقلابات دیکھے۔ ۳۵۲ء میں شاہ ابواسحاق ایجو کا عہد سلطنت ختم ہو کر مظفری خاندان کا دور دورہ شروع ہوا۔ محمد بن مظفر مبارز الدین شیراز اور فارس کا حکمران بنا۔ اس نے تمام میخانے بند کر دیے۔ خواجہ حافظ نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی تھی۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلر نیاست یہ بانگ جنگ خورمے کہ محتسب تیر است  
امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمانروا ہوا۔ اس نے میخانوں کو روک ٹوک سے آزاد کر دیا۔ اور آزادی تجارت کی اجازت دے دی۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

سحر با تفت غنیم رسید مزہ بگوش کہ دور شاہ شجاع استمے دلیر نبوش  
شاہ شجاع نے ۳۵۸ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد شاہ منصور

بن محمد مظفر بادشاہ بنا۔ منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کیا۔ چنانچہ ۳۵۹ء میں خاندان مظفری کا بھی صفایا ہو گیا۔ تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا: ”میں نے تمام عالم کو اس لئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو آباد کروں۔ تم ان کو ایک تل کے عوض میں دیئے ڈالتے ہو۔ تیمور کے پیش نظر خواجہ صاحب کا یہ شعر تھا۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا بہ خال ہند داشن ہشتم سمرقند و بخارا را  
خواجہ صاحب نے تیمور کو جواب دیا کہ ”انہی فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی۔“

یہ وہ سیاسی انقلابات تھے جن سے حافظ کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا گہرا اثر ہوا۔

مجدد رستی عہد از جهان سست نہاد کہ این عجز و عروس ہزار داماد است  
اس وقت تک خواجہ صاحب کی غزلیں چار دانگ عالم میں پھیل  
چلی تھیں خود فرماتے ہیں کہ

بشعر حافظ شیرازی گویتہ میں قصید  
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی  
ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ

طے مکان بدین زماں در سلوک شاعر  
کایں طفل یک شبہ رہ یک سالہ میرود  
اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ

صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں۔ چنانچہ عراق، عرب، دکن اور  
بنگال وغیرہ ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے۔ لیکن وطن کی محبت تھی کہ آپ  
کادامن چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہ

نئے دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر نسیم خاک مصلے و آب رکن آباد  
اس کے علاوہ آپ مال و دولت کی ہوس میں جان کو خطرے میں نہیں  
ڈالنا چاہتے تھے کہ

بے باغم لبہ بردن جہاں یکسر نمی آزد بے بفر و شوق خود کزین بہتر نمی آزد  
حافظ کے مزاج میں خود داری، بے نیازی اور آزاد شہری تھی۔ تاہم  
ضرورت کے لحاظ سے آپ کو کئی مدحیہ اشعار بھی لکھنے پڑے۔ گو یہ  
مدح خوشامد کی حد تک نہیں پہنچتی تھی۔ آپ کے مدد و حین میں شاہ  
ابو اسحاق خانجو، امیر مبارزالدین، شاہ شجاع مظفری، شاہ منصور اور  
سلطان احمد بن اولیس جلائری فرمانروائے بغداد اور حاجی قوام الدین  
سن وغیرہ شامل ہیں اگر صلہ نہیں ملتا تھا تو بھو شروع نہیں کر دیتے  
تھے۔

شہزادوں کے زیر سایہ بسر ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بہت سے سیاسی انقلابات دیکھے۔ ۱۳۵۳ء میں شاہ ابواسحاق ایجو کا عہد سلطنت ختم ہو کر مظفری خاندان کا دور دورہ شروع ہوا۔ محمد بن مظفر مبارز الدین شیراز اور فارس کا حکمران بنا۔ اس نے تمام میخانے بند کر دیے۔ خواجہ حافظ نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی تھی۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلر زیست    یہ بانگ جنگ خورے کہ محسب تیر است  
امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمانروا ہوا۔ اس نے میخانوں کو روک ٹوک سے آزاد کر دیا۔ اور آزادی تجارت کی اجازت دے دی۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

سحر زہانت غلیم رسید مزوہ بگوش    کہ دور شاہ شجاع است سے دایر نبوش  
شاہ شجاع نے ۱۳۵۴ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد شاہ منصور

بن محمد مظفر بادشاہ بنا۔ منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کیا۔ چنانچہ ۱۳۵۶ء میں خاندان مظفری کا بھی صفایا ہو گیا۔

تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا: ”میں نے تمام عالم کو اس لئے دیران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو آباد کروں۔ تم ان کو ایک تل کے عوض میں دیئے ڈالتے ہو۔ تیمور کے پیش نظر خواجہ صاحب کا یہ شعر تھا۔  
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا    بہ غل ہند دشن بچشم سمرقند و بخارا  
خواجہ صاحب نے تیمور کو جواب دیا کہ ”انہی فضول خرمیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی۔“

یہ وہ سیاسی انقلابات تھے جن سے حافظ کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا گہرا اثر ہوا۔

موجود رستی عہد از جهان سست نہاد کہ این عجز و عروس ہزار دانا داست  
اس وقت تک خواجہ صاحب کی غزلیں چار دانگ عالم میں پھیلی  
چکی تھیں خود فرماتے ہیں کہ

بشعر حافظ شیرازی گویندہ مقصد  
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی  
ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ

طے مکان بیسی زبان در سلوک شعر  
کایں طفل یک شہرہ یک سالہ بود

اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ  
صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں۔ چنانچہ عراق، عرب، دکن اور  
بنگال وغیرہ ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے۔ لیکن وطن کی محبت تھی کہ آپ  
کا دامن پھوٹنے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہ

نئے دہندہ اجازت مرا بہ سیر و سفر نسیم خاک مصلے و آب رکنا باد  
اس کے علاوہ آپ مال و دولت کی ہوس میں جان کو خطرے میں نہیں  
ڈالنا چاہتے تھے کہ

دے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی اوزد بے بفروش ملی خود کزین بہتر نمی اوزد  
حافظ کے مزاج میں خود داری، بے نیازی اور آزاد شہرٹی تھی۔ تاہم  
ضرورت کے لحاظ سے آپ کو کئی مدحیہ اشعار بھی لکھنے پڑے۔ گویہ  
مدح خوشامد کی حد تک نہیں پہنچتی تھی۔ آپ کے مدد و حین میں شاہ  
ابو اسحاق خانجو امیر مبارز الدین، شاہ شجاع مظفری، شاہ منصور اور  
سلطان احمد بن اولیس جلائری فرمانروائے بغداد اور حاجی قوام الدین  
حسین وغیرہ شامل ہیں اگر صلہ نہیں ملتا تھا تو ہجو شروع نہیں کر دیتے  
تھے۔

خواجہ صاحب نے ۵۹۳ھ (۱۳۸۹ء) میں وفات پائی اور اپنے محبوب مقام مصلا میں مدفون ہوئے۔ تاریخ و کلمات خاکِ مصلا“ ہے۔ خواجہ صاحب کے مقبرے کا نام حافظیہ ہے۔ ہفتہ میں ایک خاص دن لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ کہیں کہیں شراب کا دُور بھی چلتا ہے۔ کوئی رنگین مزاج خواجہ کے نام کا حصہ خاکِ برگِ اَدیتا ہے۔ خواجہ صاحب نے موت سے کئی سال پہلے ہی فرما دیا تھا کہ: ”قدم درینِ مدار از جسنارِ حافظ“ کہ گرجہ غرقِ گناہ است ہمہ روز بہشت اور

بر سر تربتِ باچوں گذری ہمت خواہ کہ زیارتِ گہرِ زندانِ جہاں خواہ بود خواجہ صاحب کی آوارہ مزاجی اور زندگی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے بکھٹروں سے آزاد ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی۔ صاحبِ زندگانی کا نام شاہ متاع تھا۔ وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں برہان پور کے مقام پر وفات پائی۔ خواجہ صاحب کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علوم و رسم کی تحصیل مستعدانہ کی تھی۔ اکثر غزلوں میں عربی کے مصرعے جس برجستگی سے آئے ہیں اس سے آپ کی عربی دانی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خود کہتے ہیں کہ

اگرچہ عرضِ ہنر پیش یاربِ ادبی است زبانِ خموش و لیکِ ہانچ از عربی است  
قرآنِ کریم اور تفسیر کے ساتھ آپ کو خاص لگاؤ تھا۔ خوش آوازی سے آیاتِ سبحانی پڑھنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ خواجہ صاحب کی انصاف پسندی کا یہ عالم تھا کہ غزل کے



لازوال اور مستحکم تاجدار ہونے کے باوجود دوسرے شعرا کو نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ان کا پیرو کہتے ہیں۔  
 استاد غزل سعدی ست پیش ہم کس آتا دار و غزل حافظ طرز و روش خواجو  
 اور یہ بات ہے بھی سچ۔ جب خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو  
 سلمان اور خواجو کا رنگ رنگ پر بھایا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ نے غزل  
 کہنا شروع کیا تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھا کئی غزلیں ہم طرح ہیں۔  
 اور ان میں بھی اس قدر جا بجا تو ارد ہے کہ دونوں کے کلام میں اشتباہ  
 پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حافظ، خواجو اور سلمان کی کئی  
 غزلوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ  
 سعدی، خواجو اور سلمان ہی کے خاکے ہیں جن میں حافظ نے نقش  
 آرائیاں کی ہیں۔ سعدی، خسرو، اور حسن تک غزل میں زیادہ عشق  
 و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے۔ خواجہ صاحب  
 نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔  
 سلمان کا خاص مذاق مضمون آفرینی، جدت تشبیہ اور صنائع  
 لفظی ہے۔ خواجہ حافظ بھی ان باتوں کو لیتے ہیں لیکن یہ ان کا خاص  
 انداز نہیں۔ خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن آپ  
 فطرتاً تشگفتہ مزاج اور ولولہ فیز طبیعت رکھتے تھے۔ اس لئے در عشق  
 سوز و گداز، بیان غم و شوق اور تصویر یاس و حسرت کے نوے آپ  
 سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے تھے۔

خواجہ صاحب نے کچھ ثنویاں اور قصائد بھی لکھے ہیں ان میں  
 بھی آپ نے اچھی خاصی دسترس دکھائی ہے بلکہ ثنوی میں تو

وہ صفائی، لطافت اور زور ہے کہ نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی کا دھوکا ہوتا ہے۔ لیکن آپ کا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں خواجہ حافظ کا ہمسر نہیں ہو سکا۔ متوسطین اور متاخرین غزل کے بزم آرا ہیں لیکن ان کو تسلیم ہے کہ خواجہ صاحب کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ خواجہ صاحب کے کلام میں بہت سی امتیازی خوبیاں ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے۔

’آنجہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری‘  
خواجہ صاحب کے کلام کے عام اوصاف اختصار کے ساتھ سپرد قلم ہیں:-

۱۔ جوش بیان: خواجہ صاحب کے کلام میں جو جذبات ہیں۔ وہ خود ان کے واردات اور حالات ہیں۔ اس لئے ان کو وہ اس جوش بیان اور زور کلام کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے اور سننے والے پر وہی رقت طاری ہو جاتی ہے جو خود خواجہ صاحب کے دل میں ہوتی ہے۔

۲۔ بدیع الاسلوبی یعنی جدت و خوبی ادا: سب سے بڑی چیز جو حافظ کے کلام میں ہے حسن بیان، خوبی ادا، لطافت اور دلاوری ہے۔ لیکن یہ ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ جو کسی قاعدہ اور قانون کی پابند نہیں۔ فصاحت و بلاغت کے تمام اصول اس کے احاطہ سے عاجز ہیں۔ ایک ہی مضمون ہے۔ لوگ سو سو طرح سے کہتے ہیں لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ ایک شخص اسی خیال کو نامعلوم کن لفظوں میں اور کس ادا سے

بیان کرتا ہے کہ جادو بن جانا ہے۔ یہ خوبی فارسی زبان میں حافظ کے برابر کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

۳۔ فلسفہ محبت اور بخودی: خواجہ صاحب کے نزدیک وصال الہی کے لئے وصال دوست سب سے بڑا لازمہ ہے۔ پاک محبت سے جو بخودی پیدا ہوتی ہے اس کا کام ہے عاشق کی رضا کو رضا کے محبوب میں محو کر دینا۔ خواجہ صاحب محبت کو بے عیب جانتے ہیں یہ

مہر رخت سرشت من خاکِ درت بہشت من  
عشق تو سر زشت من راحت من رضا ہے تو  
فراق و وصل چہ باشد رضا کے دوست طلب

کہ حیث باشد ازو غیر او تمنائے  
خلل پذیر بود ہر بنا کہ سے بینی

مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

۴۔ واردات عشق: خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے اور ہر نوع کو اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ لیکن ان کی اصلی شاعری عشق و عاشقی اور رندی و سرمستی ہے۔ زندانہ مضامین وہ جس آزادی، رنگینی، برہنگی، بلند آہنگی، لطیف طبع، خوش ظریفی اور جوش انداز کے ساتھ ادا کرتے ہیں وہ محتاج تعریف نہیں۔ خواجہ صاحب کے عشقیہ جذبات درد و غم سے کم تعلق رکھتے ہیں۔ عین چہرہ بھی بنانا چاہتے ہیں تو چہرے سے شگفتگی نہیں جاتی یہ

شے محنوں بہ لیلی گفت کاے معشوق بے ہمتا  
ترا عاشق شود پیاوے لے محبوں خواہ شد

مے ترسم از خرابی ایمان کہ می برد

محرابِ ابروے تو حضورِ نماز من

۵۔ فلسفہ۔ خواجہ صاحب کا فلسفہ تقریباً وہی ہے جو حکیم عمر خیام کا ہے۔ آپ نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل، توضیح اور جوش کے ساتھ ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس میدان کے شہسوار شمار ہوتے ہیں، مہماتِ مضامین یہ ہیں۔  
تعبش، زندگی و مستی، قناعت، گوشہ نشینی، واعظوں کی پردہ

دری وغیرہ وغیرہ۔

یہ مضامین کوئی پانچ سو برس سے پامال ہو رہے ہیں۔ لیکن آج تک حافظ کے عبور زبان، نزاکتِ تخیل، لطافت، لوح، شہرینی اور سلاست کا جواب نہیں ہو سکا۔ حضراتِ صوفیہ کے نزدیک ادراک کا اصل ذریعہ جو اس جذبہ اور اشیائے خارجی نہیں بلکہ خود دل میں ایسی استعداد اور قابلیت ہے کہ اگر اس کا ترکیب کیا جائے تو تمام اشیاء اس میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔ اس علم کو علمِ باطن کہتے ہیں اور یہ کتابوں کے مطالعہ سے نہیں بلکہ ترکیبِ قلب یعنی دل کی صفائی سے حاصل ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو متعدد اشعار میں بیان کیا ہے۔ آپ نے اربابِ فزوق و مشاہدہ کا نام ساتھیِ یادہ فروش رکھا ہے اور اسی بنا پر ہر جگہ ہر مغان اور بادہ فروش کے حضور میں حلقہ بگوشی کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں علمائے ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں۔  
ساہا دل طلبِ جامِ ازمائے کرد

شرح مجموعہ گل مرغ سحر دانہ دوس کہ نہ ہر کو رتے خواند معافی دانست  
 ستر خدا کہ عارف و سداک گنگ گفت ورجہ غم کہ بادہ فروشن ز کجا شنید  
 ۱۔ فلسفہ اخلاق: خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم اعلیٰ درجہ  
 کے فلسفہ انسانیت کی تصویر ہے۔ ان کا طرز عمل خود ان کی زبان  
 سے ظاہر ہے۔

میراث دینے آزار و ہرجیتو ہی کن کہ در شریعت ماغیر ازین گناہ نیست  
 ۲۔ طاہر دار عالموں، نام نہاد صوفیوں اور وضع دار و غفلوں  
 کی پردہ دری:

سب سے پہلے یہ فرض ادا کرنے کی عمر خیاں نے جرأت کی۔  
 اس کے بعد شیخ شہ عی نے دلی زبان میں کچھ کچھ کہا۔ لیکن جس  
 دلیری آزادی اور بے باکی سے خواجہ صاحب نے یہ حق سراخیاں دیا  
 وہ کچھ اتنی کا حصہ ہے۔

بیابانیکہ و چہرہ ارغوانی کن مرو بہ صومعہ کہ آنجا سیاہ کار اند  
 بادہ باحتساب شہر نہ نوشی زہار کہ شور و باتوئے و سنگت جا انداز

۸۔ روزمرہ و محاورہ۔ خواجہ صاحب کے یہاں کلام میں روزمرہ  
 اور محاورے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ آپ کی قادر الکلامی کی ایک  
 بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے نہایت فصیح، سلیس اور رواں خواہرات  
 اور مصطلحات اچھی خاصی مقدار میں استعمال کئے ہیں۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا بیس تفاوت رہ از کجا است تا کجا  
 حاشا کہ من بہ موسم گل ترکی می کنم من لاف عقل مے زغم این کار کے کنم  
 ۹۔ خوش نوازی۔ حافظ کے کلام میں ایک خوشگواری خاص پائی

جاتی ہے۔ اکثر وہ غزلوں کی بحر میں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں شعروں کے ارکان اور ان کے اصول ایسے لاتے ہیں جو نال اور ستم کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ خواجہ بعض اوقات عام ردیوں بہہ گئے ہیں اور مراعات النظر ایہام اور تضاد ایسی صنائع لفظی کو شوق سے اپناتے ہیں۔

۱۰۔ ہندش کی چستی: اس چیز کی تعریف و تحدید نہیں ہو سکتی لیکن فرق سلیم کے لئے اس کا محسوس کرنا بالکل آسان ہے۔

صوفیاں جبرہ حریف اند و نظر باز رہے زان بیان حافظ سودا زودہ بدنام افتاد  
۱۱۔ شوخی و ظرافت: خواجہ کی شاعری میں جا بجا شوخی بھی ہے اور ظرافت بھی۔ لیکن لطیف اور نازک۔ آپ سعدی اور خیام کی طرح زیادہ کھل نہیں جاتے۔

واعظ شہر کہ مردم بدکش رہے خوانند قول نیز نہیں است کہ او آدم نیست  
بدردم رودند و عنوان دکانم ہر خست تا خلف با ہم اگر من بہ جوے نہ فروشم  
۱۲۔ تسلسل مضامین: ایشیائی غزل گوئی کا ایک بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی خیالی کو مسلسل ظاہر نہیں کر سکتے۔ ہر غزل متعدد اور مختلف بلکہ متضاد مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے۔ سب سے پہلے خواجہ نے ہی مسلسل غزلیں کو ترقی دی جن میں کوئی خاص واقعہ یا خیال یا سماں دکھایا گیا ہے۔

منہرئی نقاد بھی اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حافظ کا کلام دنیا کے اکثر بڑے شعرا کی شاعری پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ غرضیکہ ہر مذاق اور ہر طبقے کو



یکساں طور پر محفوظ کرنے کے لئے اس میں کافی سرمایہ موجود ہے۔ شتربان اور دیہقان کے پہاؤ بہ پہلو ایک شہزادہ بھی حافظ کے مطالعہ سے تسکین قلب حاصل کرتا ہے۔

میرزا تقی زوی کا عقیدہ ہے کہ اگر سعدی کے کلام کو شاعری کا جسم تصور کیا جائے تو اس جسم کا دل حافظ کا کلام ہوگا۔

جامی۔ ملا نور الدین عبدالرحمان جامی ۱۴۱۲ء میں جام میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۴۷۱ء میں ہرات کے مقام پر انتقال فرمایا۔ فارسی زبان کے شعرا میں کوئی ایسا نام نہیں لیا جاسکتا جس نے جامی کے برابر قریب قریب ہر فن، ہر علم اور ہر صنف سخن میں اس درجہ دسترس حاصل کی ہو۔ بہت کھوڑے اہل قلم ایسے ہیں جنہیں ان کی زندگی کے دوران ہی اس قدر عزت نصیب ہوئی ہے۔ اپنے مستقل جلوہ زار شاعری کے علاوہ جامی نے قرآن کریم، احادیث، اولیاء، تصوف، صرف و نحو عربی، قافیہ، عروض اور موسیقی سے متعلق بھی کئی ایک تصانیف پیدا کیں۔ جامی کا اخلاق بھی اتنا ہی بلند تھا جتنا کہ اس کا تخیل، پرانے درجے کی سادگی پر طرہ یہ کہ خوشامد کے پاس سے بھی ہو کر نہ گذرتے۔ طبیعت میں خلوص، منانت اور عجز تھا (گو کبھی کبھی ترش بھی ہو جاتے)۔

بندہ عشق شادی ترک نشیب کن جامی۔ کہ دریں راہ فلاں بن فلاں چیرے سے  
جامی کی نثر میں بہارستان، دارج، شواہد النبوت، شرح لغات عراقی، نفحات الانس، مناسک حج اور طریق صوفیاں خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔ نظم میں تین دیوان اور سات مثنویاں (ہفت اور نگ یا سبھ) شامل ہیں دیوان اکثر حسن و عشق کے گیتوں سے لبریز ہے۔ دیوان یہ ہیں: فاتحۃ الشرباب، واسطۃ العقدر، خاتمۃ الحیات۔ مثنویاں یہ ہیں: سلسلۃ الذهب، سلمان البسال، تحفۃ الاحرار، سجنۃ الابرار، یوسف زلیخا، لبلی مجنون، خردنامہ سکندری، آخر کی پانچ مثنویاں خمسہ نظامی کے جواب میں ہیں سلسلۃ الذهب حدیقۃ سنائی کے جواب میں ہے۔

سلسلۃ الذهب: اس مثنوی میں فلسفیانہ مذہبی اور اخلاقی مضامین و مسائل پر بحث ہے۔ اسلامی عقائد کی وضاحت قرآن شریف کی بعض آیات کی تفسیر، چند فلسفیانہ موضوعات مثلاً جبر و قدر و عرفان حقیقت ذات وغیرہ کی تصریح کی گئی ہے۔ جاہجا حکایات اور امثلہ سے حسن بیان میں دلچسپی پیدا کی ہے۔ یہ مثنوی سلطان حسین کے نام پر مفعول ہے۔

سلمان والبسال: یہ مثنوی اوزون حسن آق قونیو کے بیٹے یعقوب بیگ کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ اس مثنوی کا قصہ ایک قدیم داستان سے لیا گیا ہے۔ شیخ ابوعلی سینا نے بھی اسے تصنیف کیا تھا۔

تحفۃ الاحرار: اس مثنوی میں معرفت اور دین کے مسائل مذکور ہیں اور نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کی تقلید میں لکھی گئی۔ سن ۸۸۶ھ ہے۔ یہ مثنوی خواجہ ناصر الدین عابد اللہ (ہمدانی) طریقہ نقشبندی کی مدح میں لکھی گئی۔ اس میں بارہ ابواب ہیں۔

سجۃ الابرار: یہ ثنوی سلطان حسین کے نام پر مفعول کی گئی ہے۔ یہ دینی اور عرفانی مسائل پر مشتمل ہے۔ طرز بیان میں مشہور صوفی شاعر شیخ فرید الدین عطار اور مولانا روم کی پیروی کی گئی ہے۔ ہر عرفانی موضوع کی وضاحت کے بعد ایک دو حکایات حسبِ حال بطور تمثیل بیان کی ہیں تاکہ تاثیر اور دلچسپی میں اضافہ ہو۔

یوسف زلیخا: یہ ثنوی نظامی کی ثنوی خسرو شیریں کے جواب میں لکھی گئی۔ اور سلطان حسین کے نام سے اس کا انتساب کیا گیا۔ یہ ثنوی ۸۸۸ھ میں نظم ہوئی۔ جامی کی تمام ثنویوں میں اس کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس ثنوی کا پہلا شعر یہ ہے۔  
الہی غنچہ امید بکشا  
کلے از روضہ جاوید نہائے  
لیلیٰ و محنوں: یہ ثنوی بیسیا کے نام سے ظاہر ہے نظامی کی ثنوی لیلیٰ محنوں کی تقلید میں نظم کی گئی۔ اس کا سنِ تالیف ۸۸۹ھ ہے۔ اس ثنوی میں قریباً پونے چار ہزار شعر ہیں۔

خرد نامہ سکندر سی: یہ ثنوی نظامی کی ثنوی سکندر نامہ کی پیروی میں ہے۔ اور اسے بھی سلطان حسین کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس میں شاعر نے حاجی اپنے فرزند کو نصیحت کی ہے۔  
جامی نہ تو یہ چاہتے تھے کہ عوام ان کے اشعار کو ضرور پسند کریں اور نہ ہی ان سے کسی تعریف کے خواہش مند تھے۔  
شعر کہ افتد قبول خاطر عام خاص داند کہ مست باشد رخا  
جامی نے صحیح عشق کے فلسفے کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بے عشق نشان ز نیک و بد نیست  
چیزے کہ ز عشق نیست نود نیست  
ہر چیز کہ عشق و درد ناک است  
آسائش عینہ ہائے پاک است  
جامی کے بیان تصوف تے اس کی روح آویز طر زادا و جدا آور  
خیالات اور نغمہ پاش زبان کو ایک خاص رنگینی اور خوش آئندگی دے  
رکھی ہے ۵

خوش محبت انجن نیکو اے  
ماہے کز دست رونق ایرا انجن بکیت  
خوام بہر ہر قدمش تحفہ دگر  
لیکن مقصدم کہ جاں در بدن بکیت  
گفت چنان ضعیف کہ بے نالہ و فغاں  
ظاہر نمی شود کہ دریں پیر من بکیت  
آنجا کہ لعل دلکش شیریں ابد فرورغ  
یا قوت و سنگ نظر کہ بکن بکیت  
مغربی نقادوں کی رائے ہے کہ گوشت کی ہر صفت میں کوئی نہ کوئی  
دوسرا شاعر جامی پر سبقت لے جائے لیکن تمام اصناف سخن کے پیش  
نظر اور ہمہ صفت موصوفی کو سامنے رکھ کر بلا خوف تردد کہا جاسکتا  
ہے کہ جامی فارسی علم و ادب کے آسمان کا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔  
بہت سے شعرا نے آج تک جامی کی شاعری کو اپنی کلام آخری کا واحد  
نمونہ بنا رکھا ہے۔ لیکن کوئی بھی اس کو نہیں پہنچ سکا۔ زندگی کی  
تلخ حقیقتیں جس قدر جامی پر آشکار تھیں اور جس قدر وقت نظری  
اُسے انسانی ذہنیات میں نصیب تھی شاید ہی کسی دوسرے شاعر  
کو حاصل ہوئی ہو۔ جامی کے اشعار میں درد ہے، سوز و گداز ہے۔ وہ  
درد کو دیکھتا ہے، اُسے خود درد محسوس ہونے لگتا ہے اور اسی  
درد کی چٹکیاں اس کے بہت سے اشعار ہیں ۵  
من نالم از جدائی تو دم بدم چوئے  
وہیں طرفہ ترکہ از تو نیم یک نفس جدا

جامی کی تصنیفات میں ۹۹ کتابیں شامل ہیں۔ یورپ والوں نے ان میں سے بعضوں کے ترجمے شائع کئے ہیں۔

بہارستان: بہارستان مولانا جامی کی مشہور تصنیف ہے۔ جامی نے اس میں ملی جلی نظم و نثر کے گل کھلائے ہیں۔ نثر کے مقابلے میں نظم کی مقدار زیادہ ہے یہاں تک کہ بادی النظر میں بہارستان نثر کا ایک دلاویز انتخاب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسے جامی کی نثر میں شمار کیا جاتا ہے۔ نثر میں جامی کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں مگر بہارستان کے برابر کسی کو شہرت، عزت اور مقبولیت شاید ہی حاصل ہوئی ہو۔

در حقیقت جامی کا مقصد تو یہ تھا کہ شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں یا اس کی پیروی میں قارئین کے لئے دلچسپ مواد جمع پہنچایا جائے۔ مگر جامی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شعر کے کلام کا جو سنہری انتخاب ادھر ادھر درج کیا ہے اس کے ساتھ کی سوانحیں یا سنجیدہ اور بے رنگ ہو کر رہ گئی ہیں۔ صاحب آتش کردہ لکھتا ہے ”گلستان پر بہارستان“ لکھی۔ عبارت فصیح اور مضامین خالی ہیں۔ لیکن اس عالم بے نثر کی نظم سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زور علم اور چیز ہے اور طبیعت خدا داد اور چیز ”جامی کی وسیع علمیت شیخ کی خدا داد استعداد کو نہیں پہنچ سکی۔ بہارستان میں گلستان کی سی کھلاوٹ، سلاست، روانی، شستگی اور بے محایا نگاری مفقود ہے۔ نثر میں مختلف ابواب کی جو تمہیدیں اٹھائی گئی ہیں ان کو صنائع بدائع کی بھرمار اور تصنع آرائی کی بوچھاڑ نے نفاست اور

صفائی کے نظر نواز زبور سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ متاخرین کو غیر ملکی اثرات نے متقدمین کی سادگی سے دور پھینک دیا ہے۔ تیمور کے وقت سے پہلے ایران میں نہایت لطیف صاف اور سادہ نثر لکھی جاتی تھی۔ چہار مقالہ، قابوس نامہ، سیاست نامہ، سفر نامہ خسرو، اپنی تمام تر سلاست اور سادگی کے باوجود شوکت اور رنگینی سے معمور ہیں۔ آہستہ آہستہ اہل ادب کی زبان میں تصنع کی آمیزش اور غیر ملکی اثرات کی جھلک نظر آنے لگی، ترک اور ہندوستانی ادیبوں نے تو فارسی زبان کی سادگی اور سلاست کو سرے سے ہی مٹا دیا۔ اس لئے کہ ایسے لوگ فارسی زبان کو اپنی مادری یا روزمرہ کی زبان کے طور پر نہیں اپناتے تھے بلکہ اسے ایک ادبی زبان کی حیثیت سے لے کر خوب لکھتے دار تحریریں پیدا کرتے تھے اور کمال فن کا مظاہرہ کرتے تھے موضوع کی جگہ اظہار موضوع کے طریقے پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اندر حالات صرف جامی ہی کو اس چیز کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کام شاستر سوسائٹی بنارس نے بہارستان کا لفظی ترجمہ ۱۸۸۷ء میں چھاپا۔

سوال: مغلیہ اور تیموری دور کے فارسی نثری ادب پر مفصل نوٹ لکھئے۔

جواب: اس میں کوئی کلام نہیں کہ مغلوں اور تیموریوں کے عہد حکومت میں اکثر فتنہ و فساد اور بدامنی کا بازار گرم رہا جس



سے علم و ادب کو بڑا دھکا لگا۔ باوجود اس کے علم و ادب کے آثار کچھ حد تک محفوظ رہے اور کچھ نئی تصنیفات بھی معرض وجود میں آئیں۔

ذیل ہیں فارسی نثری ادب کے قابل قدر نمونے مذکور ہیں:-  
مغل اور تیموری دور میں فن تاریخ پر متعدد کتب لکھی گئیں۔  
اور انہیں مغل اور تیموری حکمرانوں کے نام پر معنون کیا گیا۔  
تاریخ جہانگشا: یہ اس عہد کی نہایت اہم تاریخ ہے۔ اس کا لکھنے والا علاء الدین عطاء ملک جوینی ہے۔ یہ شخص مغل امرا اور خاص طور پر ہلاکو خاں اور اباقا خاں کا درباری ملازم تھا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں منقسم ہے۔ اس میں مغلوں کے خصائل عادات، ان کی فتوحات اور حالات مذکور ہیں۔ بالخصوص جنگیں خاں کے حالات ۶۵۵ھ تک تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں۔ ضمنی طور پر خوارزم شاہیوں اور اسماعیلیوں کی تاریخ بھی مندرج ہے۔ اس کتاب کو ایک مستند تاریخ کا درجہ حاصل ہے۔ اور بعد میں آنے والے مورخین نے اس سے خوب استفادہ کیا ہے۔

طبقات ناصری: اس کتاب میں ابتدا سے ۷۵۵ھ تک کے حالات مذکور ہیں۔ ہندوستان کے حکمران خاندانوں کے حالات خاص طور پر قابلِ داد ہیں۔ غزنوی دور کے حادثات، مغلیہ سلطنت کی ابتداء اور اسماعیلیوں کے قلع قمع کے واقعات خود مصنف نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اس لئے ان کی تاریخی اہمیت میں کوئی شک نہیں۔ اس کتاب کا لکھنے والا ابو عمر عثمان منہاج الدین

ہے جو جو زجان کا باشندہ تھا۔ اس نے کافی مدت ہندوستان میں گزاری اور نین بار ہندوستان کے بادشاہوں کے سفیر کی حیثیت سے متعین ہو کر ایران کا سفر کیا۔

تاریخ بمینی: اس کتاب کی اصل ابو نصر عتبی کی عربی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ ہے جس میں سلطان محمود غزنوی کی فتوحات مذکور ہیں۔ یوں تو العتبی نے ۳۷۰ھ میں وفات پائی لیکن تاریخ بمینی میں صرف ۱۸۰ھ تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کتاب میں محمود کے نمایاں واقعات اور اس کے دربار کی شہانہ خوبیوں کو چھنارے لے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے حالات جاننے کے لئے تاریخ بمینی ایک مستند اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب کا نام اس لئے تاریخ بمینی رکھا گیا کہ محمود غزنوی کے القاب میں ایک لقب یمین الدولہ تھا۔ العتبی سلطان محمود کے دربار کا ملازم تھا۔ ابو شرف ناصح گلپایگانی نے ساٹویں صدی ہجری کے آخر میں تاریخ بمینی کا ترجمہ سادہ اور رواں فارسی میں کیا۔

جامع التواریخ: جامع التواریخ فارسی زبان میں بہترین تاریخوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب ۳۷۰ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ اس کا مصنف رشید الدین فضل اللہ ابا قاسم ازان کا وزیر تھا۔ اس ایلخانی بادشاہ نے رشید الدین کی بڑی مدد کی۔ اور اسے حکم دیا کہ ہلاکوں کی اولاد کے کارناموں اور فتوحات کے بارے میں ایک مبسوط تاریخ لکھی جائے۔ اس کتاب میں آغاز آفرینش سے لے کر ایلخانی حکمران الحائٹو کے عہد تک کے

واقعات مندرج ہیں۔ ۱۸۰۰ء میں حاسدوں اور دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر سلطان ابوسعید کے حکم پر تیرہویں قتل ہو گیا۔  
 تاریخ و مصنف: یہ تاریخ رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ کا ضمیمہ ہے۔ اس کا مصنف شہاب الدین عبداللہ شیرازی ملقب "وصاف" ہے۔ اور اس میں ہلاکو خاں کی فتح بغداد سے لے کر ۱۲۸۰ء تک کے حالات مذکور ہیں۔ اس تصنیف کا بڑا نقص یہ ہے کہ اس کی زبان بڑی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ یہ ثقیل زبان اور دقیق طرز کا نمونہ ہے۔ لیکن اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

تاریخ گزیدہ: اس کتاب کا مصنف رشید الدین فضل اللہ کا قابل ترین شاگرد حمد اللہ مستوفی قزوینی ہے۔ یہ تاریخ ۳۳۰ھ میں مکمل ہوئی۔ تاریخ گزیدہ ایک فائنہ، چھ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ یہ کتاب ایک انسائیکلو پیڈیا کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اس لئے تفصیل سے عاری ہے۔  
 حمد اللہ نے ۳۳۵ھ میں ظفر نامہ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ شہنوی ظفر نامہ ایک منظوم تاریخ ہے جو شاہنامہ فردوسی کی تقلید اور اس کے ضمیمہ کی صورت میں لکھی گئی ہے اس میں حضرت محمد صلعم کی زندگی سے شروع کیا گیا ہے اور مصنف کے وقت تک یعنی ۳۳۱ھ تک کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

زبدۃ التواریخ: اس تاریخ کا مصنف حافظ ایروہ ہے۔ جو امیر تیمور اور شاہرخ (پسر تیمور) کا درباری مورخ تھا۔ اس نے اس

مفصل اور جامع تاریخ کو ۲۶-۲۷ء میں مکمل کیا۔ یہ تاریخ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور دنیا بھر کی تاریخ پر حاوی ہے۔ عبد الرزاق سمرقندی نے زبدۃ التواریخ کو سامنے رکھ کر مطلع السعدین لکھا۔ اس کی چودہ جلدیں ہیں جن میں تقریباً ۷۰ سال کے واقعات درج ہیں۔ یعنی خاندان ہلاکو کے آخری ناچار ابو سعید کی پیدائش ۳۲۲ھ سے لے کر امیر تیمور کے پرپوتے ابو سعید کی وفات (۸۶۸ھ) تک بلکہ اس سے بھی دو ایک سال زیادہ عرصہ تک۔ مصنف ان دونوں حکمرانوں کو دو مبارک ستارے (سعدین) فرض کرتا ہے۔ اس لئے کتاب کا نام مطلع السعدین رکھا۔

مجمّل فصیحی۔ یہ کتاب تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا ایک پیش قیمت مرقع ہے۔ اس میں ابتدائے دنیا سے نویں صدی ہجری کے وسط تک کے حالات و واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی خاص دلچسپی اور فرائد کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لکھنے میں فصیحی نے غیر معمولی مآخذوں سے امداد لی ہے۔

ظفر نامہ: اس کتاب میں تیمور کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے اس کی دو جلدیں ہیں۔ تیمور کی ولادت سے تیمور کی وفات تک کے حالات اس میں مذکور ہیں اس کتاب کا مصنف شرف الدین علی یزدی ہے۔ اسی نام کی ایک اور تاریخ نظامی شامی نے لکھی تھی۔ نظامی کا ظفر نامہ بھی تیمور کی زندگی کی تاریخ ہے۔ لیکن شرف الدین کے ظفر نامہ کے مقابلے میں اسے بہت کم شہرت حاصل ہوئی۔

شرف الدین کے ظفر نامہ کی عبارت پر تصنع اور پیچیدہ ہے

اور تراکیب پُر شوکت ہیں۔ لفاظی بھی پائی جاتی ہے۔ ایک تاریخ نگار کے لئے ایسی طرزِ ادا پسندیدہ نہیں ہوتی۔

روضۃ الصفا: اس کتاب کا مصنف محمد بن خوند شاہ المعروف میر خوند ہے۔ اس نے روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والمخلقا کے نام سے دنیا بھر کی ایک مفصل اور بسیط تاریخ لکھی۔ اس میں تخلیقِ عالم سے لے کر ۱۲۶۱ء تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں کتاب کے خاتمے پر آخری تیموری حکمران سلطان حسین کی تاریخِ خاص طور پر لکھی گئی ہے۔ میر علی شیر نوائی اسی سلطان کا مشہور وزیر تھا۔ ایرانِ جدید کے مایہ ناز ادیب رضا قلی خاں لالہ باشتی بدایت نے روضۃ الصفا کو اپنے وقت تک مکمل کر دیا ہے۔ میر خوند کے پوتے خوند میر نے روضۃ الصفا کا خلاصہ لکھا جس کا نام خلاصۃ الافیاء رکھا۔

لباب الالباب: اس کتاب کا مصنف محمد عوفی ہے اور ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ تالیف کی گئی۔ اس کتاب میں ایرانی شعر اور ادب کے حالات مذکور ہیں۔ اور فارسی شاعری کی ابتدا سے مصنف کے زمانے تک شاعروں اور ترننگاروں کا حال درج ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد میں شعر کہنے والے سلاطین اور امرا و وزرا کے علاوہ حکما اور علما کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ دوسری جلد عام شاعروں اور ادیبوں کے لئے مخصوص ہے۔ محمد عوفی نے ایک اور کتاب ”جوامع الحکایات“ بھی لکھی۔ اس میں ادبی حکایات، اشعار اور امثال مذکور ہیں عوفی ہندوستان میں بھی آیا اور دہلی کے سلطان ناصر الدین قیاچہ کے وزیر

حسین بن شرف الملک کے نام پر اپنی کتاب لباب الالباب کو مضمون کیا۔ تذکرہ دولت شاہ: دولت شاہ سمرقندی کا ”تذکرۃ الشعرا“ فارسی میں لباب الالباب کے بعد دوسرا اہم تذکرہ ہے۔ یہ تیموری عہد کے آخر میں ۸۹۲ھ میں لکھا گیا۔ اس میں ابتدائے شعر سے نویں صدی ہجری کے آخر تک کے شعرا کے حالات مذکور ہیں۔ کل ایک سو پانچ شاعروں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کا باپ مرزا شاہ رخ کے کے ندیموں اور مقربوں میں شامل تھا۔ دولت شاہ خود بھی سلطان حسین اور اس کے وزیر امیر علی شیر نوائی کا مقرب تھا۔ دولت شاہ نے اپنے ہم عصر شاعر عبدالرحمان جامی کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ تذکرہ امیر علی شیرانی کے نام پر مضمون کیا گیا۔ امیر علی شیر نوائی شعرا، ادبا اور علماء کا بڑا قدروان تھا۔

المعجم: یہ کتاب شاعری، عروض، قوافی اور تنقید و تبصرہ پر ایک بہت اہم تصنیف ہے۔ اس میں مذکور مضامین کی وضاحت مثالوں اور شعروں سے کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر ہم عصر شعرا کے حالات بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف محمد بن قیس رازی ہے۔ وہ رے کا رہنے والا تھا۔ یہ کتاب پہلے عربی زبان میں لکھی گئی تھی مصنف نے اس کا فارسی ترجمہ ۶۴۷ھ میں کیا۔

روضة الشهداء: یہ کتاب حسین واعظ کی تصنیف ہے۔ اس میں حضرت امام حسین اور آپ کے ساتھیوں کے مصائب اور ان کی شہادت کا بیان ہے۔ یہ ائمہ کے مفصل اور رقت انگیز حالات پر سب سے پُرانی کتاب ہے اور مدتوں عزائی مجلسوں میں پڑھی جاتی رہی۔



دور و حدہ خوانی، کی اصطلاح اسی کتاب کی نسبت سے وجود میں آئی۔  
 اخلاق ناصری۔ یہ کتاب نصیر الدین طوسی کی یادگار ہے۔ دراصل  
 یہ کتاب کہستان کے اسماعیلی گورنر ناصر الدین محتشم کے لئے لکھی گئی  
 تھی۔ اور اس کے نام پر معنوں کی گئی تھی۔ اور دیباچے میں اسماعیلیوں  
 کے گن گائے گئے۔ لیکن جب ہلاکو خاں نے سلطنت اسماعیلیہ کے  
 دار الخلافہ الموت کو تباہ کر دیا اور ناصر الدین طوسی کو اپنی خدمت میں  
 لے لیا تو اس محقق (طوسی) نے اخلاق ناصری کے دوسرے دیباچے  
 میں ہلاکو خاں کی تعریف کے پل باندھے۔

اگرچہ اخلاق ناصری کا انداز تحریر مشکل اور صنائع بدائع سے  
 معمور ہے پھر بھی کتاب کی مفید مطالب بحثوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔  
 کتاب میں اصول اخلاق اور حکمت عملی پر بحث کی گئی ہے۔ عمدہ  
 اوضاع و اطوار کے علاوہ نظام حکومت، نظام شخصی اور نظام اجتماعی  
 کے اصولوں کی صراحت کی گئی ہے۔ اخلاق و حکمت پر یہ سب سے  
 پہلی مستند کتاب ہے۔

اخلاق جلالی۔ اس کتاب کا مصنف جلال الدین دوانی ہے۔ یہ کتاب آق  
 قویلو سلطان بن حسن کی فرمائش پر نویں صدی ہجری کے آخری نصف  
 میں لکھی۔ اس کتاب میں اخلاق تدریجاً منزل اور سیاحت مدین پر  
 بحث کی گئی ہے اور اخلاق ناصری سے نقل و اقتباس کیا گیا ہے۔  
 افسوس کا مقام ہے کہ اصلی کتاب ”اخلاق ناصری“ کو اتنی شہرت  
 اور مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جتنی اخلاق جلالی کے غیر ملکی زبانوں  
 میں ترجمے ہوئے اور یورپ میں اس کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اخلاق محسنی - یہ کتاب بھی اپنی پیشہ و تصانیف ”اخلاق نہری“ اور ”اخلاق جلالی“ کی تقلید نہیں لکھی گئی۔ اس میں بھی اخلاق اور اوصاف پر بحث کی گئی ہے۔ چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے مصنف کا نام حسین واعظ کاشفی ہے۔ اس کتاب کو سلطان حسین کے نام پر معنون کیا گیا۔

انوار سہیلی : یہ کتاب ”کلیلہ و دمنہ“ کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس میں اخلاق اور حکمت عملی کے اصولوں کی وضاحت پرندوں اور جانوروں کی حکایات کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اس کا مصنف بھی ملا حسین واعظ کاشفی ہے۔ اس کتاب کو بھی یورپ اور ہندوستان میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

## صفوی اور قاچاری دور

سوال : صفوی دور میں فارسی علم و ادب کی حالت اور ترقی پر بحث کیجئے۔

جواب : امیر تیمور کی موت کے بعد تقریباً ایک سو سال تک ایران میں طوائف الملوکی کا عالم رہا۔ آخر شاہ اسماعیل نے ایک عظیم خاندان کی بنیاد رکھی جس کا نام صفوی خاندان ہے۔ شاہ اسماعیل ایک مشہور تری شیخ صفی الدین کی اولاد سے تھے۔ شیخ صفی الدین ساتویں امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھے۔ صفوی خاندان کا سب

سے بڑا بادشاہ شاہ عباس، اعظم تھا جو ۱۵۸۶ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۶۲۹ء میں وفات پائی۔

صفویہ مذہب کے شیعہ تھے۔ اس لئے دفعۃً صوفی شاعری کو زوال آگیا۔ بعض لوگ تقلیداً اس رنگ میں کہتے تھے۔ وہ صوفی نہ تھے۔ لیکن صوفی بننے میں مرزا آقا تھا۔ حکیم شفقائی نے ایک تنزیہی تصوف میں بڑے زور شور سے لکھی۔ تصوف کے معرکتہ الارامسائل جوہی سے بیان کئے۔ لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ وہی شفقائی ہیں جو ذوقی کے مقابلے میں بھانڈ بن جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک نقالی ہے۔ صوفیانہ شاعری میں صرف تخیل اور فلسفہ درکار نہیں بلکہ اس کی اصلی روح جذبات ہیں۔ وہ ان لوگوں میں کہاں؟ لیکن اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کر لینا چاہئے کہ جامی کی موت کے بعد فارسی شاعری کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ ہاتھی، ایتھنی، اہلی اور ہلاکی وغیرہ اہل قلم جامی کے بعد چالیس سال تک زندہ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ شاہ اسمعیل صفوی کی موت اور شاہ عباس اعظم کی تخت نشینی کے درمیان ایران میں کوئی نمایاں اور بلند مرتبہ صاحب فن پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صفوی بادشاہ قصیدہ گو شاعر یا مجموعی قسم کے اہل قلم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ مرزا محمد خاں کی بھی یہی رائے ہے کہ صفوی بادشاہ ہر ممکن طریقے سے شیعہ مذہب کے اصول و عقائد کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے۔ کمالات سے انہیں ایک گونہ پیر تھی ان کی توجہ تو ہر وقت شریعت کی طرف مبذول رہتی تھی۔ صوفیوں کو آزار پہچانے میں انہوں نے

کوئی کسر نہ اٹھا رکھی رہی و جہتھی کہ صفویہ عہد حکومت میں تصوف، شاعری، علم و ادب اور فنون کا فاختہ پڑھ دیا گیا۔ درویشوں اور اہل حال بزرگوں کی پناہ گاہوں اور خانقاہوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اس کے مقابلہ میں ملا محمد تقی مجلسی، ملا محمد باقر مجلسی، محقق ثانی، شیخ حرّامی اور شیخ بہائی کے سے خشک، تنگ نظر اور متعصب اہل شریعت و دینیات نے کافی عروج پایا۔ رضا قلی خاں لکھتا ہے کہ صفوی بادشاہ قزلباشوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو مذہبی شاعروں کے متوالے تھے۔ چنانچہ شاہ طہماسپ (۱۵۲۷ء تا ۱۵۷۶ء) نے مختتم کا شی (وفات ۱۵۸۸ء) کو حضرت امام حسین علیہ السلام کا مہر بہ ہفت بند لکھنے کے عوض میں ایک ایسا معقول معاوضہ دیا تھا کہ فارسی شاعری میں ایک انقلاب نمودار ہو گیا۔ اکثر شعرا نے مختتم کا شی کی پیروی میں مرثیہ گوئی کو ایک عام مقبول اور مستقل صنعت شاعری بنانے کے لئے کوشش شروع کر دی۔ اکثر تنزیل نواز شعرا کو مغل بادشاہوں کی ادب پروری ہندوستان میں کھینچ لائی۔

صفوی بادشاہوں کے زیر سایہ جو مشہور ترین اہل قلم ایران کی سر زمین پر نشوونما پاتے رہے یہ ہیں :-

قاسمی - آپ نے شاہ اسماعیل صفوی کی موت کے دس سال بعد ایک شاہنامہ مکمل کیا جس میں شاہ مذکور کی زندگی کے واقعات اور فتوحات کو نظم کیا۔ قاسمی کے اشعار میں قصیدہ خوانوں کی سی خوشامد کی گونہیں۔ شاہنامہ میں شاہ اسماعیل کے جانشین کے حالات بھی منظوم ہیں۔

وحشی یزدی۔ آپ نے ۵۸۳ھ میں وفات پائی۔ تاریخ عالم آرا  
عباسی میں آپ کی تصنیف فرہاد و شیریں اور غزلیات کی بہت تعریف  
کی گئی ہے۔ آپ کے کلام میں معاملہ بندی اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہے  
و اسوخت بھی انہیں کی ایجاد ہے۔ اور انہیں پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔  
وحشی نے شاہ طہا سب اور اس کے کئی ایک امر کی مدح میں قصیدے  
بھی لکھے۔ ان کے علاوہ دوثنویاں اس کی یادگار ہیں۔ خلد بریں اور  
ناظر و منظور

محشم کاشی: مفصل بیان آگے ہے۔

محمود قادری یزدی: وفات ۵۸۵ھ میں آپ نے البراسحاقی صاحب  
کنز الاشہدہ کے انداز میں دیوان آلبسہ لکھا ہے۔ اس میں سابعی ہوئے  
مذاق، مزاج اور طنز کی افراط ہے۔

شفائی طہرانی: آپ نے ۶۱۴ھ میں وفات پائی طبیعت میں  
جدت اور انداز بیان میں جوش ہے۔

بہاؤ الدین آملی: مفصل ذکر آگے ملاحظہ ہو۔

حکیم شفقائی: وفات ۶۲۶ھ میں شاہ عباس اعظم کے شاہی  
طیبیہ اور غاص ندیم تھے۔ رضا قلی خاں لکھنؤیہ کے آپ کی طبابت  
نے آپ کی شاعری کو اور آپ کی شاعری نے آپ کی طبابت کو مات کر رکھا تھا۔ چوہوں  
اور غزلیات کے علاوہ آپ نے چارثنویاں بھی لکھیں:-

(۱) ہر و محبت (۲) نمکدان حقیقت۔ حلیقہ سنائی کی پیروی  
میں (۳) قصہ عراقین۔ تحفۃ العراقین کی تقلید میں (۴) دیدہ بیدار  
شفقائی اکثر بابا افغانی کی طرحوں میں غزل کہتے تھے۔ لیکن فغانی

کی سی بات نہیں۔ آپ کے اچھے اچھے اشعار نظری نیشاپوری کے کلام کی سی جاشنی رکھتے ہیں۔

فقیہی ہر وی۔ وفات ۶۳۹ء آپ اور مرزا جلال الدین اسیر شاہ عباس اعظم کے درباری شاعروں میں سے تھے۔ جلال اسیر نے یابا فغانی کی سی خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی کو ترقی دی۔

محمد طاہر وحید قزوینی۔ وفات ۱۶۰۸ء۔ آپ کو ۶۴۵ء میں شاہ عباس دوم نے درباری تاریخ نگار اور ۶۸۹ء میں وزیر مقرر کیا۔ ڈاکٹر ایچے کا کہنا ہے کہ طاہر وحید مشہور شاعر صائب اصفہانی کا دوست تھا۔

صائب اصفہانی۔ یا تفصیل تذکرہ آگے ملاحظہ کیجئے۔

فیاض۔ آپ صائب کے معاصر تھے۔ آپ نے اماموں کی مدح میں قصیدے اور حضرت امام حسینؑ اور حضرت امام حسنؑ کے ماتم میں مرثیے لکھے ہیں۔ آپ نے شیعہ مذہب کے متعلق عربی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ فارسی زبان میں آپ نے ابن العربی کی شہرہ آفاق تصنیف فصوص الحکم کی تفسیر لکھی۔

مذکورہ الصمد شاعروں اور شیعہ مذہب کے اصول و عقائد کو ترتیب دیتے والے اہل قلم سے قطع نظر وقفہ خوانی کی داغ بیل بھی صفوی وقتوں ہی میں پڑ چکی تھی۔



## صفوی دور کے مشہور اور عظیم المرتبہ شعرا

مختشم کاشانی، مختشم کاشانی صفویہ دور کا مشہور ترین شاعر ہے وہ شاہ طہاسب کا درباری شاعر تھا۔ آپ نے شروع شروع میں بہت سی عشقیہ غزلیں لکھیں۔ اور شاہ کی شان میں قصیدے لکھے۔ آتش کدہ میں ان غزلوں اور قصیدوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن صفوی بادشاہ قصیدہ گوئی کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ کثر شیعہ تھے۔ اور دینی مسائل کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے۔ غزلیں بھی ان کی طبیعت کو اس نہ آتی تھیں، اس لئے مختشم کاشانی نے بھی ہوا کا رخ دیکھ کر نئی راہ اختیار کی اور اہل بیت کی مصیبتوں اور امام حسینؑ کی شہادت اور دلیری وغیرہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ آپ نے مرثیہ گوئی کو ایک مستقل فن کی صورت دی۔ آپ کے مرثیہ میں بے حد درد اور سوز ہے۔ بیان میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ جذبات حقیقی جوش اور خاص و لولہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو مرثیہ گوئی کی حیثیت سے بڑی شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔

فارسی ادب میں مختشم کاشانی کو مرثیہ گوئی کا موجد کہا جاتا ہے۔ اس نے اس صنف شعریہ کو کہاں عروج تک پہنچایا جو اب مختشم کے مرثیوں میں ہے وہ اس سے پہلے یا بعد میں آنے والے مرثیہ گو شعرا میں ناپید ہے۔ آپ نے ۵۸۶ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام از ۵۸۶ دے دارم کہ در تنگی درو جز غم نمی گنجید غم دارم ز دل تنگی کہ در عالم نمی گنجید

باز این چہ شورش است کہ در خلق عالم است  
باز این چہ سخنبر عظیم است کز زمین  
گو باطلوع می کند از مغرب آفتاب  
کز خورش قیامت دنیا بعد نیست

باز این چہ نود و چہ عزاد چہ ماتم است  
بے نقص صورت خاستہ در عرض اعظم است  
کاشرب در تمامی ذرات عالم است  
این سخنبر عام کہ نامش محرم است

## شیخ یعقوب صرفی

شیخ یعقوب صرفی کشمیر کے ایک بلند پایہ عالم اور شاعر ہوئے ہیں۔ آپ ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ اس قدر ذہین تھے کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ملا عینی سے پائی۔ آپ نے علم و ادب کے لئے دوسرے ملکوں کا سفر کیا اور اس زمانے کے بڑے بڑے عالموں اور شاعروں سے ملاقات کی مختلف مراکز علوم کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ حصول علم کی خاطر وہ سیالکوٹ، لاہور، کابل، مشهد، سمرقند وغیرہ بھی تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی قیام کیا۔ مذہبی علوم پر کامل عبور کے علاوہ آپ نے منطق اور فلسفہ میں بھی کافی دسترس حاصل کی۔ دینی معاملات مثلاً قرآن شریف کی تفسیر، حدیث اور تصوف وغیرہ پر آپ کی رائے کو سند مانا جاتا تھا۔

صرفی یہ شعر و شاعری کا صحیح اور اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اور بلند درجہ شاعر تھے۔ آپ نے غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ مثنویاں بھی کہی ہیں۔ آپ کی شاعری پر مذہب اور تصوف کا رنگ نمایاں

ہے۔ آپ کی پانچ نثنویاں خمسہ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے بہتر  
سال کی عمر پائی۔ آپ کا مزار سرہنگ کے محلہ زینہ کدلی میں ہے۔

شیخ یعقوب صرّتی رح کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

گیتی نمائے آئینہ صافات جام ما	دورِ جم است و عہد سکند بکام ما
آئینہ خدائے نما جام بادہ است	اے غافل از خدا چہ کنی عیب جام ما
مارا چہ عیب میکشی اے شیخ صبح خیز	روشن تر آمد ست ز صبح تو شام ما
نہ میل دنیا و نہ تمنائے آخرت	یعنی بیرون بود ز دو عالم مقام ما
تا گشتہ ایم ساتی میخانہ شہود	محروم ہنچ کس شد از فیض عام ما
الضاد وہ برائے خدا صرّی ملا	چوں خود تنہو ز بختہ نہ شد کار خام ما

عرفی شیرازی۔ سید محمد جلال الدین عرفی (۱۵۵۵ء تا ۹۶۳ھ)

میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ ایران میں ان محکموں اور عدالتوں کو جو  
مذہبی حیفے سے تعلق نہیں رکھتیں عرف کہتے ہیں۔ عرفی کا باپ بن العابدین  
بادی شیراز کے دارالحکومت میں شاہی دربار کا ایک منصف تھا یہی  
یات عرفی کے اس تخلص کا موجب ہوئی۔ عرفی کے باپ نے اس  
کے لئے علوم متداولہ کے علاوہ مصوری اور نقاشی کی تعلیم کا بھی  
خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ جوانی میں چچک نکل آنے سے عرفی کی صورت  
بگڑ گئی کفّی قدرت نے اُسے بد دماغی اور نازک مزاجی سے بہرہ وافر  
عطا کیا تھا۔ اس لئے جب اس نے شعر کہنا شروع کیا تو غیر آئی  
شیرازی، وحشی یزدی، مختشم کاشانی اور بابا فغانی ایسے کہنہ مشوق  
استادوں سے فخریہ چٹمکیں ہونے لگیں۔ بابا فغانی کا انداز غزل گوئی  
ملک پر چھایا ہوا تھا عرفی نے بھی فغانی کی غزلیات کو سامنے رکھ کر غزل گوئی

شروع کی۔ اگرچہ اس کے ہمجنس اس ذخیرہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے تاہم عرفی کا یہ کلام یہ ظاہر کرتا تھا کہ اُسے فارسی ادبیات میں ایک ممتاز رتبہ حاصل ہوگا۔

اس زمانے میں ایران میں شعر و شاعری کا بازار ویسے بھی سرد ہو چکا تھا۔ صفویوں کا دور دورہ تھا۔ شاہ طہماسپ اور عباس کے دربار میں اگرچہ علم و سہر رکھنے والوں کو کافی جگہ ملے تھے تاہم زیادہ تر چرچہ مذہب کے تھے۔ محنت کشانی کے مرثیوں نے ایک نئی روش ڈال دی تھی جس سے عشقیہ شاعروں کو زوال آ رہا تھا۔ ادھر اکبر کی قدر نشائی اور دریا دلی نے شاعروں کے لئے کشش کا سامان کر رکھا تھا۔ عرفی کا دل شیراز سے اچاٹ ہوا تو اس نے ہندوستان میں آنے کو ترجیح دی۔ وہ غالباً ۱۵۵۷ء میں سمندر کے راستہ احمد نگر آیا۔ اور وہاں سے فتح پور سیکری پہنچا۔ یہاں فقہی نے اس کی دستگیری کی اور اسی کے وسیلے سے وہ اکبر بادشاہ کے حضور میں پہنچا۔ لیکن اُسے شعرائے دربار کے زمرے میں داخل ہونے کا موقع نہ ملا۔ حکیم ابوالفتح گیلانی کی ملاقات نے عرفی کے شاعرانہ ہوس کو بہت زیادہ جمکایا اس کی وفات کے بعد عرفی عبدالرحیم خانخاناں کے دربار میں ملازمت میں شامل ہو گیا۔ ۱۵۸۹ء میں عرفی اکبر کے ساتھ کشمیر گیا۔ اسی زمانے میں لکھے گئے مشہور قصیدے کا یہ مطلع ہے۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید گمرغ کباب است کہ بابال ویرآید  
۱۵۹۱ء میں عرفی نے لاہور کے مقام پر وفات پائی۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے یہ رباعی لکھی۔

عرفی دم نزع است وہاں مستی تو آیا بچہ مایہ رخت بر لبستی تو  
نزد است کہ دوست نقد فردوس نکفت جوئے متاع است وہیں مستی تو

عرفی کو لاہور میں ہی دفن دیا گیا۔ چن سال بعد اس کی لاش کو  
یہاں سے نجف بھیج دیا گیا اور وہاں دوبارہ دفن کیا گیا۔ چنانچہ عرفی  
کی اپنی پیشین گوئی حروف بحرف درست ثابت ہوئی رہ

بہ کاوش مشرہ از گورتا نجف بروم اگر بہ ہند ہلاکم کنندور بہ تبتار  
عرفی نے صرف ۳۵ یا ۳۶ برس کی عمر پائی۔ اس میں کسی گوشک نہیں  
ہو سکتا کہ اگر وہ زیادہ دیر زندہ رہتا تو کتناے روزگار بنتا۔ لیکن اس  
کھوڑی سی عمر میں بھی اس نے شاعری میں جو کمال حاصل کیا اس کا  
اعتراف بڑے بڑے اساتذہ نے کیا ہے۔ ملا عید الغنی صاحب میخانہ  
لکھتے ہیں کہ عرفی اپنے وقت میں تازہ گوئی، طرفہ ادائی اور شیریں بیانی  
کے اعتبار سے بے مثل تھا۔ عید القادر بدایونی لکھتا ہے کہ اس کے  
وقت میں ہندوستان کے فارسی شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت  
عرفی اور ثنائی کی تھی۔ گلب نے لکھا ہے کہ جامی کے بعد ترکی شاعری پر  
سب سے زیادہ اثر عرفی اور فیضی نے ڈالا ہے۔ عرفی کی موت سے  
فارسی ادبیات کو وہی صدمہ پہنچا جو کہ انگریزی ادبیات کو بائرن  
کی موت سے پہنچا۔

مولانا شبلی نے عرفی کی شاعری پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے  
جس کا خلاصہ ہدیہ قارئین سے :-

زور کلام جس کی ابتدا نظامی نے کی تھی عرفی نے اس کو کمال  
کے درجے تک پہنچایا۔ عرفی نے سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور

استعارے پیدا کئے۔ جن سے جدت ادا اور طرنگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑتا ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی ترکیبوں سے مضمون میں جو زور و وسعت اور رنگینی آگئی محتاج بیان نہیں۔ ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں کہ محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تختل نے تصدیق جس بہ حیرت خانہ سستنا و قارانی اسی قسم کی ترکیبیں متوسطین اور متاخرین کی خاص ایجاد ہیں۔ عرفی اگر ان کی ایجاد کا بیکتا نہیں ہے تاہم خدا ضرور ہے۔ عرفی کے کلام کی خصوصیت میں سے ایک بڑی خصوصیت استعارات و تشبیہات کی جدت، طرنگی اور تنوع ہے۔

عرفی کا زور طبع اور فصاحت و بلاغت کا زور شور وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ تضاد میں مسلسل مضامین ادا کرتا ہے اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔

عرفی چونکہ بالطبع نہایت غیور اور خود دار تھا اس لئے مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے اکبر، شہزادہ سلیم، حکیم ابوالفتح گیلانی اور خانقاہاں ایسے سلاطین و امرا کی مدح کرتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے فضائل اور اوصاف بھی جی کھول کر بیان کرتا تھا اور مرے لے کر کہتا تھا۔

اہل ادب نے فخریہ کو انواع شاعری میں ایک خاص صنف قرار دیا ہے۔ فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس کے اچھے اچھے دوست بھی اس کے غرور کو ناپسند کرتے تھے۔ حاضر جو ابی اور ظرافت میں بھی وہ بے مثل تھا۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ اس نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی۔

رضاقلی خاں نے عرفی کے اسلوب بیان کو پسند نہیں کیا لیکن



اس کے باوجود دوست اور دشمن دونوں نے اس کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا اعتراف کیا ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اس کی قوتِ تحخیل نہایت زبردست تھی۔ لیکن بد قسمتی سے اس زمانہ کا مذاق ہی یہی تھا کہ یہ قوت صرف مبالغہ، جدت تشبیہ اور حسن التعلیل پر صرف کی جاتی۔ عربی کو اگر اس سے بجا طور پر کام لینے کا موقع مل جاتا تو شاعری کی سرحد کہیں کی کہیں پہنچ گئی ہوتی۔

فانغ زخیرگی نگرود و رے آفتاب  
ایم یڈ آزمودہ نظارہ کسے است  
ایجاد اشارات نہ باندازہ راز است  
ایں رشتہ نگشت تنہی کہ دراز است  
بہ طور مانہ گنجد منع دیدار  
وے ایں راز باموسیٰ بگوئید  
محازی عشق میں جو معاملات اور واردات پیش آتے ہیں ان کے بیان کرنے میں بھی عربی اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز ہے کیونکہ وہ صرف سطحی اور سرسری وارداتیں ادا نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر دقیق اور عمیق معاملات پر پڑتی ہے۔ اور انہیں کو وہ شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔

حسن راز شیوہ ہا گایے بود میلہ نیاز  
ورنہ موسیٰ بے طلب حدہ تماشا کردہ بود  
عربی بہ حال نزع رسیاری و یہ شدی  
شربت نیاد از دل امیدارد دوست  
رقت آن قت جاں از بزم لے ہوش پیا  
تا بہنم کہ چہا ہر سراپاں رقت است  
ہر شتاء کہ نگاہش می خرم در روز وصل  
مے شیم گوشہ و ز خود مکرر مے خرم  
عربی نے جس قدر غزل میں فلسفیانہ خیالات ادا کئے ہیں شاید ہی کسی شاعر نے ادا کئے ہوں گے۔

ساکن کعبہ کجا و دولت دیدار کجا؟  
ایں قدر ہست کہ در سایہ دیوارے ہست

عرفی نے اخلاق کے اکثر مسائل بیان کئے ہیں لیکن وہ صرف ان اخلاقی مسائل کو لیتا ہے جو عزت نفس اور علو حوصلہ سے علاقہ رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اگر یہ اوصاف غرور و نخوت کی حد تک بھی پہنچ جائیں تو اس کے نزدیک ان اوصاف سے بہتر ہیں جن کی سرحد پست ہمتی سے مل جاتی ہے۔ مثلاً تواضع، عجز، توکل اور قناعت وغیرہ سے۔

کفران نعمت کلمہ مستدان بے ادب  
گرفتہ آنکہ دہندہم بہشت بے طاعت  
در کیش من ز شکر گدایانہ بہتر است  
قبول کردن و رفتن شکر انصاف بہت  
خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا  
یکے منافقانہ نشیں و کمین خویش  
مدہ عنان تعلق بحسن ہر ذرہ!  
عرفی کی تصنیفات یہ ہیں:—

(۱) نفسیہ (رسالہ نثر و تصوف) (۲) ثنوی بجواب محزون الاسرار  
نظامی (۳) ثنوی بجواب خسرو شیریں نظامی (۴) کلیات و قصائد و  
غزلیات جو ۱۰۰۰ غزلوں میں جمع کی گئیں۔ عرفی کو ثنوی میں وہ رتبہ حاصل  
نہیں جو اس نے قصیدہ اور غزل میں پایا ہے  
ثنویش رنگ فصاحت نداشت کان نمک بود و ملاححت نداشت

## ملاطہر غنی کاشمیری

غنی کاشمیری فارسی کے بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ آپ کی زندگی کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کے آباو اجداد بخارا سے خراسان کے راستے سے کشمیر میں وارد ہوئے تھے جب

شاہ ہمدان کشمیر شریف لائے تھے۔ آپ سنہ ۱۰۴ھ میں سرنگری میں پیدا ہوئے۔  
غنی کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ آپ نے ملائحس فانی  
کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کی طبیعت میں فطری روانی اور لطیف مذاقی  
پائی جاتی تھی۔ آپ نے جوانی کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے ظاہر  
تخلص اختیار کیا۔ بعد میں غنی تخلص اپنا لیا۔

آپ کی طبیعت درویشی اور قناعت پسندی پر مائل تھی۔ دنیا کے  
دھندوں اور تھمیلوں سے نفرت تھی۔ شہرت اور خود نمائی بالکل نہیں  
چاہتے تھے۔ عام لوگوں سے الگ تھلگ رہتے۔ اس کے باوجود ان  
کی بڑی قدر و منزلت تھی اور جب اورنگ زیب شاہ ہندوستان نے  
انہیں دربار۔ شاہی میں آنے کی دعوت دی تو انہوں نے دیوانگی کا بہانہ  
پیش کیا اور دربار میں حاضر ہونے سے معذرت ظاہر کی۔

کہتے ہیں کہ غنی نے لگ بھگ ایک لاکھ شعر کہے۔ آپ کا کلام خوشام  
اور مدح گوئی سے سراسر پاک ہے۔ آپ اپنی جھونپڑی ہی کے اندر بیٹھے  
رہتے اور دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ آپ کی وفات ۱۱۷۷ھ میں ہوئی۔  
غنی کے کلام کا نمونہ پیش ہے :-

جنوئے کو کہ از قید خرد میروں کشم پارا      کغم زخمیر پائے خویش تن دامان صحارا  
برہم ہے پرستان محسوب خوش عزتے دارد      کہ چون آید مجلس شیشہ خانی میکند جارا  
اگر شہرت ہو س داری اسیر دام عزت شو      کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام غفارا  
برہم ہے پرستان سرکشی بر طاق نہ زاہد      کہ میر بند مستان بے محابا خون مینارا

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن

کہ روشن کرد زور دیدہ اش چشم زلیخارا

## سرمہ

سرمہ کے آیا و اجداد یہودی تھے۔ جب اس یہودی خاندان نے اسلام قبول کر لیا تو سرمہ کا نام سعید رکھا گیا۔ شروع میں اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ ایران سے وہ مال لے کر ہندوستان میں وارد ہوا۔ جب سندھ کے شہر ٹھٹھ میں پہنچا تو ایک ہندو لڑکے کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ دیوانہ وار سندھ کے ریگستان میں پھرتا رہا۔ آخر شاہجہاں آباد میں پہنچا۔

سرمہ ایک بلند درجہ عالم اور شاعر تھا۔ مغل شاہزادہ داراشکوہ سے ملاقات ہو گئی۔ داراشکوہ کو اس سے عقیدت ہو گئی۔ جب اورنگزیب بادشاہ بن گیا تو داراشکوہ اپنی جان بچانے کے لئے دہلی سے بھاگ گیا۔ لیکن سرمہ دہلی ہی میں رہ گیا۔ حاسدوں نے سرمہ پر کفر کا الزام لگایا۔ اورنگزیب نے علمائے دین کی ایک مجلس منعقد کی۔ سرمہ کو کافر قرار دیا گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جس جگہ اس کی گروں کاٹی گئی وہیں اس کی قبر بنادی گئی۔

نمونہ کلام:-

## رباعیات

(۱)

از یاد صبا خواست دلم بُوئے ترا چشم ز جہنم جست گل روئے ترا  
آخر نہ ازیں دو چار گشتی نہ از آں اندیشہ نشان داد رہ کوئے ترا

(۲)

ہر جا کہ غم یار بود آرام است      بے این بچھاں ہر کہ بود ناکام است  
غافل نہ نشوی ز یار و فریادہ ناب      گرد و دستِ جم مے طلبی با جام است

(۳)

بے سرو قدی کہ رونماید یار است      بے سیم بری کہ زر زرباید یار است  
آن یار گزین کہ ہر چہ خواہی بدید      یارے کہ بکار تو بیاید یار است

صائب اصفہانی۔ صائب ایک معزز خاندان کا فرد تھا۔ اس کا باپ مشہور تاجر تھا۔ اس کی ولادت تبریز میں ہوئی لیکن نشو و نما و تربیت و تعلیم اصفہان میں حاصل کی۔ اسی بنا پر اس کو تبریزی اور اصفہانی دونوں کہتے ہیں۔ شعر و شاعری سے اس کو فطرتی مناسبت تھی آغاز شعور میں جب اس کی شاعری کے چرچے ہونے لگے تو ایک شخص نے امتحان کے طور پر ایک مہل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگا دیجئے۔ مصرع یہ تھا:

”شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت“

صائب نے پیش مصرع کہہ کر مصرع کو با معنی کر دیا:

امشب از ساقی ز بس گرم ست محفل میتوان

شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت

باوجود شاعری کے صائب پر مذہبی خیالات بہت غالب تھے  
آغاز شباب میں حرمین کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد مشہد مبارک کی  
زیارت کی۔ اور اظہار عقیدت کے طور پر ایک قصیدہ لکھا۔

صائب نے شاعری کی باقاعدہ تعلیم حکیم رکناً مسیح کاشانی اور حکیم شفقانی سے حاصل کی۔ حکیم رکناً مشہور شاعر گذرا ہے۔ شاہ عباس صفوی اس کے گھر پر اس سے ملنے آتا تھا۔ شاہ عباس کو হাসدوں نے اس کی طرف سے رنجیدہ کر دیا تو حکیم رکناً نے دربار سے قطع تعلق کر لیا۔

ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی فیاضیوں کے غلغلہ سے تمام ایران گورج اٹھا۔ صائب کے دل میں بھی ہندوستان آنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ خود کہتا ہے: ہچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل است قفس سودائے تو در ہیچ سر نیست کہ نیست صائب چونکہ ایک معزز تاجر کا بیٹا تھا اس لئے تجارت کے ذریعہ سے دہلی میں آیا۔ شاہجہاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ہزاری منصب اور مستعد خاں کا خطاب عطا ہوا۔ مرزا صائب کے باپ کو صائب سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ اس نے ستر برس کی عمر میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور بیٹے کو واپس اپنے وطن ایران میں لے گیا۔ ایران میں سلاطین صفویہ نے مرزا صائب کی بڑی عزت کی۔ مرزا نے بھی ان کی مدح میں پُر زور قصائد لکھے۔ شاہ عباس ثانی نے اس کو ملک الشعر کا خطاب عطا کیا۔

مرزا نے اگرچہ اخیر زندگی تک ایران سے قدم باہر نہ رکھا تاہم ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔ مرزا نے ۱۰۸۸ھ میں بمقام اصفہان وفات پائی۔ ”صائب وفات یافت“ مادہ تاریخ ہے۔ صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہم حصروں کو ادب سے یاد کرتا تھا



لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتقد تھا۔ سب سے زیادہ فقط  
کا معترف تھا۔ یہ اس کی صحیح المذاقی کی بہت بڑی دلیل ہے حکیم  
رکنا اور شفا کی کا شاگرد تھا۔ اس لئے ان دونوں کا نام نہایت ادب  
سے لیتا ہے۔

ایں غزل حضرت رکنا سیت کفرمود  
”پائے بلخ پیش سلیمان چہ نماید“  
دراصفهان کہ بدرسخن رسد صاحب  
کنوں کہ نبض شناس سخن شفا کی نیست  
میرزا صاحب نے ہر قسم کے اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد  
متعدد ہیں۔ ایک چھوٹی سی رزمیہ فلتوی بھی ہے۔ اور غزل تو اس کا خاص  
فن ہے۔ لیکن قصائد اور فتویاں کم رتبہ ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اس  
دور سے پہلے ابتر ہو چکی تھیں۔ اور مرزا بھی اس کی کچھ تلافی نہ کر سکا۔  
مرزا نہایت پرگو اور بدبہم گو تھا۔ جس زمانے میں وہ برہان پور  
دکن میں تھا ایک قصیدہ سا کٹھ شعروں کا صرف دو پہر میں لکھا تھا  
ایک دفعہ اس کے ایک شاگرد نے ایک ہمل مصرع پیش کیا کہ اس  
پر مصرع لگائیے۔ مصرع یہ تھا۔

از شیشہ بے بے، مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے فوراً کہا:-

حق را ز دل خالی از اندیشہ طلب کن

مرزا کی زندگی ہی میں اس کے کلام کو یہ حسن قبول حاصل ہو چکا  
تھا کہ سلاطین اور امرا شاہ ایران سے اس کے کلام کی استدعا کرتے تھے  
اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلیں بھیجی جاتی تھیں۔  
مرزا نے فن سخن کے متعلق ایک بڑا کام یہ کیا کہ قدما اور متاخرین

کا کلام انتخاب کر کے ایک بیاض مرتب کی جو سخن دان کے لئے دلیل راہ کا کام دیتی ہے۔ مرزا کا اپنا انداز گو خاص ہے اور وہ شاعری کا معمولی درجہ ہے لیکن چونکہ اس کا مذاق نہایت صمیم تھا اس لئے بلند اور نادر اشعار انتخاب کئے ہیں۔ جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیئے ہیں وہی اس کے تمام دیوان کا عطر ہے۔

مرزا کے لطائف و ظرائف مشہور ہیں جس زمانے میں وہ کشمیر میں تھا ایک دن ظفر خاں کے دربار میں اشعار پڑھ رہا تھا اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدا بلند تھی۔ ایک نوخیز نے حسد سے کہا کہ یہ تمام مضامین قدما کے یہاں بندھ چکے ہیں۔ موجودہ شاعروں کا یہ کام رہ گیا ہے کہ صرف لفظوں کو انٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ صاحب نے برہنہ کیا:۔

اہل دانش جملہ مضمونہائے نگین بستہ اند ہست مضمون نہ بستہ از مراد از شما چونکہ شعر اتفاقاً حسب حال تھا ظفر خاں بے اختیار سہنس پڑا اور مرزا کو انعام دیا۔

مرزا کا خاص انداز تمثیل ہے تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا لیکن صاحب نے اس کثرت سے اس کو برتا ہے کہ اس کی خاص چیز ہو گئی۔ اس کے علاوہ اور شعرا عام مضامین میں تمثیل سے کام لیتے تھے صاحب نے اخلاقی مضامین کے لئے اسے خاص کر دیا۔ جا بجا خیال بندی اور مضمون آفرینی ہے یہ خاص متاخرین کا انداز ہے۔ اگرچہ صاحب کے ہاں وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے اسرار نہیں پائے جاتے جو عرفی اور نظری کے ہاں نہایت کثرت سے

پائے جاتے ہیں تاہم زبان کی فصاحت، ترکیب کی بنش، محاورات کا استعمال ہاتھ سے نہیں جانے پاتا بخلات اور متاخرین کے جن کے کلام کو بڑھ کر زبان کی خوبیوں کی طرف مطلق ذہن متوجہ نہیں ہوتا۔  
 نمونہ کلام: ۷۷

قمریاں پاسِ غلط کردہ خودیٰ ارند      ورنہ یک سر و دریں باغ بہ اندامِ تو نیست

چشم عاشق از تماشاے تو چوں سیر شود      ہر نگہ سلسلہ جنیانِ نگاہِ دگر است

مرا بروز قیامت غمے کہ مست این است      کہ رُفے مردمِ عالم دوبارہ باید دید

کہ گذشت است ازیں یادِ بیکرِ امروز      بنص رہے طپد و سینہ صحر اگر مست

صائب کا خاص فن تغزل ہے۔

نظیری نیشاپوری: محمد حسین نام، نظیری تخلص اور نیشاپور وطن تھا۔ شاعری کا ابتدا سے شوق تھا۔ اور ابتداء سے ہی شہرت ہو چکی تھی۔ خراسان میں جب اس کی شاعری مسکمل ہو چکی تو کاشاں میں آیا۔ یہاں حاتم، فہمی، مقصود خردہ، شجاع، رضائی شاعری میں استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کے مشاعروں میں نظیری بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ اس زمانے میں عبد الرحیم خانجاناں کی فیاضیوں کا شہرہ دور دور پھیل چکا تھا۔ نظیری نے بھی اس کے

دربار کا قصد کیا اور اگر وہ میں خاناناں سے ملا، خاناناں کی مدد سے اسے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ اکبر کی مدد میں اس نے متعدد قصیدے لکھے جو مقبول ہوئے لیکن دربار میں اسے کوئی خاص امتیاز نصیب نہ ہو سکا اس لئے اس نے اپنا مستقل تعلق خاناناں کے دربار سے قائم رکھا۔ احمد آباد (گجرات) میں سکونت اختیار کی چند برس کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ اور اس تقریباً میں ایک قصیدہ لکھ کر خانناں کی خدمت میں پیش کیا۔

خاناناں نے نظیری کے سفر حج کا سامان کر دیا۔ چنانچہ سورت سے جہان پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کو روانہ ہوا۔ راستہ میں بدوؤں نے لوٹ لیا۔ تاہم اس نے حج اور زیارت حاصل کیں۔ حج سے واپس آکر نظیری نے مراد (شہزادہ) کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اکبر نے شہزادہ مراد کو دکن کی ہم پر بھیجا تھا وہ ان اطراف میں فوجیں لئے ہوئے پڑا تھا۔ نظیری چلتا پھرتا اس طرف جا نکلا۔ اور شہزادہ مراد کے حضور میں نوروز کے جشن کے موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا۔

اکبر کی وفات (۱۵۵۶ء) کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے نظیری کا شہرہ سن کر اسے دربار میں طلب کیا۔ نظیری حاضر ہوا اور انوری کے ایک قصیدہ پر لکھ کر پیش کیا۔ بادشاہ نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت عطا کی جہانگیر کی فرمائش پر ایک عمارت کا کتابہ لکھنے پر نظیری کو تین ہزار سیکہ زمین انعام میں ملی۔ گلزار ابرار میں مذکور ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ برس پہلے ترک دنیا کر کے گوشہ عزت اختیار کیا۔ نظیری نے ۱۵۶۱ء میں وفات

پائی اور احمد آباد میں مکان کے قریب ایک مسجد میں مدفون ہوا۔ ایک دفعہ نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ لاکھ روپے کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر ہوگا؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ خانخاناں نے لاکھ روپے منگو کر سامنے رکھ دیئے۔ نظیری نے کہا خدا کا شکر ہے آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپے تو دیکھ لئے۔ خانخاناں نے روپے اس کے گھر بھجوا دیئے۔

نظیری نے امیرانہ زندگی بسر کی اور ارام میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بخلاف اور شعرا کے وہ مذہب میں سخت تھا۔ اور آزادی خیال پر تلملاتا تھا۔

اس زمانہ میں نظیر نام کا ایک شاعر تھا۔ نظیری نے اسے لکھا کہ تم اپنا تخلص بدل دو کیونکہ دونوں تخلصوں میں اشتباہ ہوتا ہے۔ نظیری نے اسے دس ہزار روپے دیئے اور نظیر نے اپنا تخلص ترک کر دیا۔

### کلام نظیری کی خصوصیات :

۱۔ ندرت تراکیب و جہات انداز: نظیری نے اپنے کلام میں سینکڑوں نئی ترکیبیں نئے اور اچھوتے انداز میں استعمال کی ہیں۔ جس سے زبان میں وسعت اور زور پیدا ہونے کے علاوہ تاثیر کا سامان بھی فراہم ہوا۔

۲۔ اکثر وجدانی باتوں کو ایسے طریقے سے ادا کرتا ہے کہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ اور اس سے خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔ خیالات اور جذبات کی صحیح صحیح تصویر لفظوں میں کھینچ کے رکھ دیتا ہے اور

جس چیز کو بیان کرتا ہے وہ سامع کی آنکھوں میں گھومنے لگتی ہے۔

۳۔ نظیری اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے اس سے ایک خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے۔

۴۔ نظیری اکثر عشقی اور عاشقی کی سچی اور صیح وارداتیں بیان کرتا ہے۔ اس لئے دل پران کا خاص اثر ہوتا ہے۔

خواہی کہ ترویش شود عشقی نظیری گاہ از نظر خویش براں گاہ نگہ دار  
بغل از نامہ احباب پُر کرد و نمے خواند کہ سے تر شد و مکتوب من ہم از میاں پیا  
۵۔ نظیری کے کلام میں فلسفہ کم ہے۔ لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا ہوا ہے۔

بر چہرہ حقیقت اگر ماند پرده جہم گناہ دیدہ صورت پرست ماست  
خضر صد منزن شمیم آمد و نشنا ختم بازے بایذ ز سر گیرم رہ پیودہ را  
۶۔ اس زمانے کے تمام شعرا کا اصلی جوہر ز ادا کی جدت ہے۔

نظیری اس میدان میں اکثر حریفوں سے آگے ہے۔  
از کف نمی دہد دل آساں رنودہ را دیدیم زور بازوئے نا آزمودہ را  
بازم بہ کلبہ کیست نہ شمع و نہ آفتاب بام و درم ز زردہ و پروانہ پر شد است  
عارفان گرفتہ چشمے بدو عالم ندہند ہر گجایار نقاب از رخ زیبا برداشت  
۷۔ نظیری غزلوں میں کسی حالت کو مسلسل لکھتا جاتا ہے اور غزل کی غزل اسی ایک حالت کے بیان میں تمام ہو جاتی ہے۔

دارم دریں دیار متاع شیوہ دلبری بخود خوش و میانہ خوش و ہوشیار خوش  
دستار افکند خم کا کل پر انگند کاین است وضع صحبت و زین ساکن خوش  
شاد و شگفتہ مطرب و ساغر طلب کند یک ٹوہر حجاب و در آید بکار خوش



- ۸۔ نظیری نے روزمرہ اور محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔  
 ع۔ طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر شدم  
 ع۔ سخت است حال مشکل اگر تا سحر کشم  
 ع۔ شب آخر گشتہ افسانہ از افسانہ می خیزد

فغانی شیرازی۔ تمام اہل فن اور ادیب تذکرہ کا اتفاق ہے کہ متوسطین کی شاعری میں انقلاب پیدا ہو کر جو نیا دور قائم ہوا وہ متاخرین اور نازک خیالوں کا دور کہلاتا ہے۔ اس کا بانی فغانی ہے لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ ایسے شخص کے حالات بھی ارباب تذکرہ دو چار سطر سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے۔ بہر حال ایک ایک نکتہ کا سراغ لگا کر جو سرمایہ یا نقد آیا ہے وہ نذر احباب ہے (شبلی) فغانی کا وطن شیراز ہے۔ سام مرزا نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ پہلے چاقو بنایا کرتے تھے۔ شاعری کا آغاز تھا کہ ہرات میں آئے۔ اس زمانے میں شاعری کا جو انداز مقبول عام تھا وہ سلطان حسین میرزا کے شعر کا انداز تھا۔ چونکہ فغانی کا رنگ ان سے الگ تھا اس لئے کسی نے ان کی قدر نہ کی بلکہ ان کے کلام کو اس قدر لغو سمجھتے تھے کہ جب کسی کا کوئی مہمل شعر پڑھا جاتا تھا تو کہتے تھے فغانیہ ہے۔ جامی اس وقت تک زندہ تھے۔ فغانی ان سے ملے لیکن ان سے بھی فغانی کو داد نہ ملی۔ بالآخر تبریز میں آئے۔ یہاں سلطان یعقوب فرما کر واکھا۔ اس نے ان کی نہایت قدر دانی کی۔ چنانچہ انہوں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے جو دیوان میں موجود ہیں۔ سلطان

نے ان کو بابا کا خطاب دیا۔ سلطان یعقوب کے انتقال کے بعد بیورو میں آکر قیام کیا۔

نہایت لالہ بالی مزاج اور نرند تھے۔ شراب حد سے زیادہ پیتے تھے۔ اکثر میخانوں میں گذرتی تھی۔ اسی بنا پر بیورو کے حاکم نے ان کا روزینہ شراب اور گوشت مقرر کر دیا تھا۔ آخر عمر میں توبہ کی اور مشہد میں معتمد ہو گئے۔ ۹۲۵ھ میں وفات پائی۔

شروع میں جب اپنے بھائی کی دوکان میں چھری بنایا کرتے تھے تو اس مناسبت سے سکا کی تخلص رکھا تھا۔ پھر فغانی رکھا۔

ان کا دیوان ایک لڑائی کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ بھائی کو خط لکھا کہ جہاں کہیں سے جو کچھ مل سکے جمع کرو۔ چنانچہ جگہ جگہ سے تلاش کر کے وہ مجموعہ مرتب ہوا جو آج موجود ہے لیکن اصل مرتب شدہ دیوان جاتا رہا۔

تبصرہ :- ان کو تمام اہل سخن مجددِ فن مانتے ہیں۔ والدہ داغستانی لکھتے ہیں: بابا فغانی ایک ایسا جدت پسند شاعر ہے جس سے پہلے کسی نے اس کی طرز میں شعر نہیں کہے۔ اس نے شاعری کا درجہ اس قدر بلند کیا جہاں طائر خیال کی رسائی بھی نہیں۔ زمانے کے اکثر اساتذہ مثلاً مولانا وحشی یزدی، مولانا نظیری نیشاپوری، مولانا ضمیری اصفہانی، خواجہ حسین شنائی، مولانا عرفی شیرازی، حکیم شفقائی اصفہانی، حکیم مسیحی کناری کاشی اور مولانا محنتش کاشانی وغیرہ اس (فغانی) کے پیرو اور شاگرد اور اس کی طرزِ ادا کے خوشہ چین ہیں۔

متاخرین کی جو خصوصیتیں ہیں وہ متوسط حد تک فغانی کے

کلام میں موجود ہیں۔

نمونہ کلام :۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں کہ نام نیست

خوبی ہیں کرشمہ و ناز و خرام نیست

ایں سخن یا ساقی ما کو از اں کردہ است

اے کہ میگوئی چرا جامے بخانے مے خری

صد شکر کہ عظیم ہنر بے ہنراں است  
یہ شیوہ ہائے بلند از میانِ مین پیدا  
ایں بخودی گناہ دلِ و دست ماست

بد گفتن من شد ہنر حاسدِ منکر  
خواب آں مکر ناز کم کہ چوں مے تو  
ساقی مدام بادہ باندازہ می دید

### طالب آملی :-

سلسلہ تیموریہ میں ہیں تو ہر فرمانروا سخن فہم اور ادب شناس گذرا ہے لیکن جہاںگیر اس فن میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ فطرتاً محبت کیش تھا۔ عشق اس کا خمیر تھا۔ چونکہ فضی کا شاگرد رشید تھا اس لئے شعرو شاعری کا نکتہ دان اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ شہزادگی کے زمانہ سے شعر اس کے دربار میں ملازم رہتے تھے۔ لیکن ملک الشعرا کی کا تاج اس نے طالب آملی کے سر پر رکھا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ شاعر کس پایہ کا ہو گا۔ اس وقت طالب کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس عمر میں یہ اعزاز خاص اسی شاعر کا کارنامہ اقبال ہے۔

طالب آملی کا رہنے والا تھا جو مازندران کا ایک شہر ہے۔ بچپن میں درسی علوم و فنون کی تعلیم پائی پندرہ سولہ برس کی عمر تک اس نے

ہندو، منطق، فلسفہ، تصوف اور خوش نویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ اس زمانہ میں مازندران کا حاکم جس کو ایران کی اصطلاح میں وزیر کہتے تھے میر ابو القاسم تھا۔ اس کی طرح میں متعدد قصائد لکھے معلوم نہیں کہ کن اسباب سے یہاں طبیعت سیر ہوئی اور کاشان میں چلا آیا۔ یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور شادی بھی کر لی۔ تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے کہ اس کی شاعری کا نشو و نما یہیں ہوا۔ لیکن چند روز کے بعد یہاں سے بھی ہمدانہ خاں ہو کر مرو میں آیا۔ یہ عباس صفوی کا زمانہ تھا اور ملکش خاں صوبے کا گورنر تھا۔ طالب نے ملکش خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور مدحیہ قصائد لکھے۔ دو برس تک یہاں قیام رہا۔ ملکش خاں نے قردانی میں کمی نہ کی ہوگی لیکن طالب ہندوستان کی فیاضیوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک شہنوی لکھ کر ملکش خاں سے وطن جانے کی اجازت حاصل کی۔ وطن کا بہانہ تو اس لئے تھا کہ ہندوستان کا نام لیتا تو اجازت کیونکر ملتی ملکش خاں سے رخصت ہو کر طالب نے سیدھا ہندوستان کا راستہ لیا۔ میخانہ کے مصنف نے جو فرد طالب کا ہم عصر اور ہم صحبت تھا، لکھا ہے کہ طالب مرو سے نکل کر سیدھا قندھار پہنچا۔ لیکن تعجب انگیز غلطی ہے۔ قندھار جانے کا حال طالب نے خود ایک قصیدہ میں لکھا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں برسوں رہ کر قندھار گیا تھا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اول جب وہ ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اور اس وجہ سے وہ تمام مشہور

مقامات میں بہ تلاشِ معاش پھرتا رہا۔ دلی، لاہور، ملتان، سرسبز کا ذکر اس نے خاص طور پر کیا ہے۔ لاہور میں زیادہ دل لگا۔ چنانچہ لاہور کی مدح میں اس نے ایک خاص قصیدہ لکھا۔ ان شہروں میں وہ رندانہ وضع سے رہا اور خرمنِ حسن کی خوشہ چینی کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے حسینیوں نے بھی اپنے پہلو میں اس کو جگہ دی۔

قندھار سے واپس آنے کے بعد طالب آگرہ میں آیا۔ خواجہ قاسم دیانت خاں نے جو امرائے جہانگیر میں حضور رسن تھا اس کی قدر دانی کی۔ اور سفارش کر کے اُسے گجرات کے حاکم عبداللہ خاں کے پاس بھیجا۔ عبداللہ خاں نے طالب کی بڑی قدر کی اور انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔

شاہ پور ظہرائی کے نام کے شاعر سے طالب نے راہ و رسم پیدا کی اور لاہور میں اس سے جا ملا۔ اس شاعر کی مدد سے طالب نور جہاں بیگم کے والدِ اعتمد الدولہ کے دربار میں پہنچا۔ اعتمد الدولہ کی عنایت و مدد سے طالب کو جہانگیر کے دربار میں رسائی حاصل ہو گئی۔ اور وہاں تقریب نصیب ہوا۔ اور بادشاہ نے اُسے زمرہ شعرا میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرائی کا خطاب عطا ہوا۔

طالب نہایت دوست پرور و عاشعار اور خوش اخلاق تھا۔ رمانہ کی ضرورتوں نے اگرچہ اُس سے دردِ دل کی خاک چھنوائی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرتاً غیر تھا۔ اس نے ہر موقع پر اپنی آن قائم رکھی۔

قصیدہ :- اس امر میں طالب تمام شعرا سے ممتاز ہے کہ وہ فطرتاً شاعر تھا یعنی جب نہایت کم سن تھا اس وقت سے شعر کہتا تھا۔ ایک قصیدہ جو کلیات میں موجود ہے اس وقت کا ہے جب تقریباً اس کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ وہ نہایت جلد شعر کہتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے قلم ہاتھ میں لیا اور بے تکلف لکھنا کیا۔ دو تین گھنٹے میں پچاس ساٹھ شعروں کا قصیدہ تیار ہو گیا۔ شاعری میں طالب کا امتیازی وصف صرف دو چیزیں ہیں۔ ندرت تشبیہ و لطف استعارہ۔ استعارات کی نزاکت اس کے دور سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے اور زیادہ لطافت اور ندرت پیدا کر دی۔ اس کا کلام کہیں سے اٹھا کر دیکھو ہر جگہ نئے نئے استعارات نظر آئیں گے۔ ان میں سے اکثر لطیف اور نازک ہیں اور بعض بعض معنی سازی اور چھوٹے طلسم میں نمونہ کلام :-

لب از گفتن چنان بستم کہ گوی	دہن بر چہرہ ز خمے بود و بہ شد
عشق در اول و آخر ہمہ جدا و سماع	این سر را بے است کم بختہ ہم خاموش است
دولب خواہم یکے در سے پرستی	یکے در عذر خواہی ہائے مستی
بے نیاز نہ زار باب کرم میگذرم	چو سیم شیم کہ بر سرمہ فروشاں گذرد
یا صد کہ ضمہ آں بت بدست می رود	خودی کند خرام و خود از دست می رود

ابو طالب کلیم:

ابو طالب کلیم ہمدان میں پیدا ہوا۔ لیکن کاشان میں بچپن قیام رہا۔



آغاز جوانی میں شیراز جا کر علوم و درسیہ کی تحصیل کی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا۔ شاہ نواز خاں صفوی (جو اہل جہانگیر میں شامل تھا) کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ لیکن ۱۰۳۸ھ میں وطن کی یاد نے ستایا۔ اس زمانے کا ہندوستان وہ چیز تھی کہ کلیم گو وطن جارہا تھا لیکن حسرتوں کا انبار لٹے جاتا تھا۔ اس حالت میں وطن میں کیا جی لگتا۔ دو برس بعد پھر ہندوستان کو لوٹ آیا۔ اور میر جہلہ کا دامن پکڑا۔ چنانچہ ۱۰۳۷ھ میں باریاب ہوا۔ و نیم ہزاری کا منصب ملا۔ شاہجہاں کے زمانے میں بیچہزاری تک پہنچا۔ کلیم کی شاعری کا اگرچہ سکہ جمتا جاتا تھا اس کے سرپرست بھی دربار شاہی میں خاصا عزاز رکھتے تھے لیکن جہانگیر تک اس کی رسائی نہ ہو سکی وجہ غالباً یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعر ا طالب آملی تھا اور اس کے سامنے کلیم کا فروغ پانا ناممکن تھا۔ کلیم کی ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نورجہاں اس کی شاعری کی معتقد نہ تھی۔ اور اکثر اس کے اشعار پر حرف گیری کیا کرتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کلیم نے دربار میں پہنچنے سے پہلے جابجا خاک چھانی۔ شاہجہان نامہ میں لکھا ہے کہ وہ دکن میں مارا مارا پھرا۔ اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلیم کا ایک قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں بھی ہے۔ ایک آدھ قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیجا پور کے ارادہ سے چلا تھا کہ راہ میں جاسوسی کے شبہ میں پکڑا گیا اور قلعہ شاہدرہ میں قید رکھا گیا۔

بہر حال رفتہ رفتہ شاہجہاں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور ملک الشعر کا خطاب ملا۔ ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہاں نے

کر وڑ روپے کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا اور اگرہ میں جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی تو کلیم نے قصیدہ لکھا۔ شاہجہاں نے اس کے صلے میں اسے روپوں کے برابر تلوا یا چنانچہ پانچہزار پانچ صد روپے وزن میں آئے اور اس کو عطا کئے۔

کلیم بخلاف اور شعرا کے نہایت صاف دل، سیر چشم اور فیاض طبع تھا۔ معاصر اور حریف شعرا کی عزت کرتا تھا اور اگر مجبوری سے ملتا تھا وہ نہایت حاضر جواب اور مضمون یاب بھی تھا۔

کلیم نے شاعری کی تمام قسموں میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد کثرت سے ہیں۔ تنویاں بھی خوب ہیں۔ غزلوں کا دیوان الگ ہے۔ قطعاً۔ اور رباعیات پر بھی توجہ دی ہے۔ قصیدہ گوئی میں کلیم نے حاجی محمد علی قدسی کا انداز اختیار کیا ہے یعنی عرفی اور نظیری کی پیچیدار اور مشکل ہنر شیں صاف کر دیں۔ مبالغہ اور حسن تعلیل کو وسعت دی لیکن اس کے ساتھ ہی قصیدہ کی منانیت، زور اور بلنداری کم ہو گئی اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا۔

جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں کلیم کے یہاں اس کی اس قدر بہتات ہے کہ ہر قصیدہ گویا مضامین کا ایک انبار ہے۔ قصائد کی تمہید اکثر واقعات سے شروع کرتا ہے مثلاً موسم کی گرمی اور سردی سفر کی سختی، پہاڑوں کی دشوار گزاری وغیرہ۔ لیکن مضامین کی باریکیوں سے ایک طلسم پیدا کر دیتا ہے۔ کلیم کے کلام میں اپنے معاصرین کے مقابلے میں ترکیبوں کا سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برستگی، روانی اور شستگی زیادہ ہے۔

کَلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے۔ غزل میں اس کے پیشرووں نے خاص خاص باتیں پیدا کی تھیں مثلاً عربی نے فلسفہ، نظریاتی نے تغزل، طالب آملی نے شوخی، استعارات، وحشی نے معاملہ بندی، کَلیم کے یہاں گو تغزل کے سوا اور سب کچھ ہے لیکن اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے۔ مثالیہ جو صاحب کا خاص انداز ہے اس کی ابتدا بھی کَلیم نے ہی کی۔

اکثر لوگوں کے نزدیک شاعری صرف تخیل کی قوت کا نام ہے کَلیم بہترین شاعری ہے۔ اس کا ہر شعر تخیل کا ایک منظر ہے۔ شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات قوت تخیل کی وجہ سے ایک اور سی صورت میں نظر آتے ہیں۔ کَلیم کبھی بھی روزمرہ اور محاورہ سے غافل نہیں ہوتا۔ مضمون آفرینی اور خیال بندی کی رو میں بہہ کر وہ لطف زبان سے کبھی لاپرواہ نہیں ہوتا۔ روزمرہ کے علاوہ اکثر وہ ٹھیکٹ محاورے برتتا ہے جو ایران کے اہل زبان کا حصہ ہیں اور جن کو عام آدمی فرسنگ کے بغیر سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً

”گریاں ز بزم رقت و سرخوشیتن گرفت“

(سرخوشیتن گرفت :- اپنی راہ لی)

ع: دشمن خود را چہر اکس ایں قدر پہلودید

(پہلودادن :- پہلو بچانا)

ع: عجب پیرے کہ می مالد جوان را

(مالیدن :- پچھاڑنا)

ع: امید بوسہ ات چہ نمک، داشت اے کَلیم

(چہ نمک داشت : یعنی اس میں کیا لطف تھا!)

## ملک الشعرا فیضی :-

فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے جن کو اہل زبان (ایرانیوں) نے شاعر مانا۔ وہ ہیں خسرو اور فیضی۔ افسوس ہے کہ شاعری کی شہرت نے فیضی کے دیگر تمام کمالات پر پردہ ڈال دیا۔ وہ خود کہتا ہے اور سچ کہتا ہے :-

امروز نہ شاعر م حکیم      دانندہ حادثات و قدیم  
فیضی عربی النسل ہے۔ اسلاف یمن میں رہتے تھے شیخ موسیٰ جو  
فیضی کی پانچویں پشت میں ہیں وطن سے ترک تعلق کر کے سیاحت  
کو اٹھے۔ اور چلتے پھرتے سندھ کے علاقے میں آئے۔ ریل نام  
کے ایک قصبہ میں قیام کیا۔ اور شادی کر لی۔ دسویں صدی ہجری  
میں شیخ خضر فیضی کے دادا وطن چھوڑ کر ناگور میں آئے۔ یہاں ایک  
عربی خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے فیضی  
اسی شیخ مبارک کا بیٹا تھا۔

شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ میں آئے۔ جہنا  
کے کنارے میر رفیع الدین حسین کے ہم سایہ میں قیام اختیار کیا اور  
یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی۔ خدا نے کثرت سے اولاد  
دی جن میں سب سے پہلا فیضی تھا جو ۹۵۲ھ میں پیدا ہوا۔ فیضی  
نے ابتدائی تعلیم باپ سے حاصل کی۔

شیخ مبارک اور اس کے بیٹے فیضی اور ابو الفضل شیبی اور آزاد خیال تھے۔ اس لئے شہنشاہ اکبر کے درباری ملا اور امر ان کے خلاف تھے متعصب مولویوں کے ڈر سے تینوں اپنی جان بچانے کے لئے ایک رات چپکے سے گھر سے نکل پڑے۔ کوئی منزل مقصود نہ تھی۔ آخر فیضی کے ایک آشنا کے گھر میں پہنچے۔ لیکن وہ بھی ان کی آمد سے گھبرا گیا۔ چنانچہ وہاں سے آگے چل دیئے۔ اُدھر دشمنوں کے بھڑکانے سے شاہی حکم صادر ہوا کہ شیخ مبارک کا سارا خاندان دربار میں حاضر ہو۔ شاہی چوہدر شیخ کے گھر پر آئے تو شیخ کے چھوٹے بیٹے ابو النحر کو پایا اور اسے پکڑ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اکبر کو بچے پر رحم آگیا اور اسے چھوڑ دیا۔ شیخ مبارک، فیضی اور ابو الفضل بھیس بدل کر بھٹکتے پھرے۔ کبھی کسی آشنا اور کبھی کسی واقف کے یہاں قیام کرتے۔

آخر جا بجا خاک چھاننے کے بعد آگرہ میں آئے۔ اور ایک ہمدرد دوست کے گھر میں پناہ لی۔ چند لوگ اور بھی شیخ کے طرفدار ہو گئے دربار شاہی میں تقریب ہوئی۔ بادشاہ تو پہلے ہی حیران تھا وہ حقیقت سے آگاہ تھا اور ان ہیگنا ہوں گے مصائب پر افسوس کھاتا تھا۔ اکبر نے احترام کیا۔ فیضی بادشاہ کی نوازش خاص سے بہرہ یاب ہوا۔ حاسدوں کے سینوں پر سانپ لڑتے لگے لیکن لاچار تھے۔ اب اکبر کے دربار میں فیضی اور ابو الفضل کا طوطی بولنے لگا۔ اور بادشاہ پر ان کا اتنا اثر تھا کہ تمام ملاؤں کا تعصب دب گیا اور بادشاہ کے کے مزاج میں بھی آزاد خیالی پیدا ہو گئی۔ بادشاہ میں مذہبی تعصب

نام کو بھی نہ رہا۔

شہزادوں کی تعلیم و تربیت فیضی کے سپرد ہوئی۔ اگرہے کالج اور کاپی کی صدارت بھی فیضی کو دی گئی۔ ۹۹۶ھ میں فیضی کو ملک الشعراء کا خطاب عطا ہوا۔ اکبر کے ہمراہ فیضی نے کشمیر کا سفر بھی کیا۔ اور ایک قصیدہ کشمیر پر لکھا۔ اس کے بعد فیضی کو مختلف عہدوں اور جموں پر مامور کیا گیا جو اس نے خوبی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیں۔ سفارت کے فرائض بھی ادا کئے۔

اکبر کے حکم پر فیضی نے نظامی کے خمسہ کے جواب میں نل دین سے آغاز کیا۔

فیضی کا اصلی مذاق علم و فن کی خدمت تھی۔ کتابوں کا نہایت شائق تھا۔ ایک گراں بہا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا جس میں چار ہزار کتابیں تھیں۔ ہر قسم کے علوم و فنون پر اس کے پاس کتابیں تھیں مثلاً طب، نجوم، موسیقی، حکمت و تصوف، ہیئت، ہندسہ، تفسیر و حاشیہ وغیرہ۔

فیضی نہایت فیاض اور سخی تھا۔ اہل کمال کے لئے اس کا گھر مہمان سرائے عام تھا۔ فقرا اور اہل دل کا نہایت گرویدہ تھا۔ اکثر بزرگوں کے مزار پر حاضر ہوتا تھا۔ اپنے مخالفوں اور حاسروں سے بھی اس کا سلوک نیک اور ہمدردانہ تھا۔ اُسے اپنے بھائیوں سے بے حد محبت تھی جس کا اظہار وہ اپنے خطوط میں کرتا تھا۔ اس کے فضاہ و مراعاتی سے اس کے اخلاق و خصائل کا اچھی طرح علم ہوتا ہے۔



تصنیفات - فیضی نے ایک سو ایک کتابیں تصنیف کیں - خمسہ نظامی کے جواب میں یہ تنویاں اس کی تصنیف کردہ ہیں -  
(۱) نل ومن (۲) مرکز ادوار (۳) سلیمان و بلقیس (۴) ہفت کشور  
(۵) اکبر نامہ -

موارد الکلم : ۹۸۵ء میں لکھی گئی - تفسیر غیر منقوط ہے -  
سواطع الالہام : یعنی تفسیر غیر منقوط ۱۰۰۰ء میں تمام ہوئی اس پر جو تقریظیں اور تاریخیں لکھی گئیں خوب ہیں -  
الانشائے فیضی - اس میں فیضی کے مکاتیب و خطوط شامل ہیں جن میں انشا پر داری کا حق ادا کیا ہے - طرز اور زبان سادہ ہے -  
بعض اوقات ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں -  
دیوان غزلیات - کچھ نوہزار شعر ہیں - دیوان کا نام طباشیر صبر رکھا -  
قصائد - مختصر سا مجموعہ ہے - حمد، نعت، مدح، فخر، تصوف، اخلاق وغیرہ مضامین پر الگ الگ قصیدے لکھے ہیں - ان میں بیٹے کا مرثیہ بھی شامل ہے جو نہایت پُر درو ہے - خاتمہ پر قطعات بھی ہیں -

فہما بھارت - یہ اکبر کے حکم پر لکھی گئی - اس میں فیضی نے ہزوا کام کیا ہے -

اتھرون وید - اس کا ترجمہ بھی فیضی کی طرف منسوب ہے -  
لیللاوتی - یہ کتاب حساب میں ہے - فیضی نے اس کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا -

فیضی کی شاعری - فیضی فطرتاً شاعر تھا - اور بچپن سے ہی شعر

کہتا تھا۔ لیکن اس کی طبیعت مشکل پسند تھی۔ اور عربیت کا زور تھا۔ طبیعت صنائع کی طرف بھی مائل تھی۔ ابتدا میں جو قصیدے لکھے ان میں نامائز عربی الفاظ کثرت سے ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گذرا اور اہل زبان سے اختلاط پڑھا زبان سادہ اور صاف ہوتی گئی۔

فیضی نے قصیدہ، غزل، مثنوی، سب کچھ کہا ہے لیکن قصیدے بے مزہ ہیں۔ البتہ مثنوی اور غزل لاجواب ہے۔

فیضی کے کلام کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر خوش بیان ہے۔ فیضی کے یہاں مخربہ عشقیہ فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین ہیں۔ اور خوش بیان ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت ہے۔ فیضی کے اکثر فلسفیانہ مضامین کے ساتھ ادعا اور غور کی جھلک ہوتی ہے۔

ہاتف اصفہانی۔ سید محمد ہاتف اصفہانی افشاری اور زندی دور کا بہت بلند درجہ شاعر تھا۔ اس کے بزرگ آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔ ہاتف کی بیشتر زندگی اصفہان میں بسر ہوئی۔ عربی زبان میں بھی ہاتف کو بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ اور کہتے ہیں کہ اس نے عربی زبان میں شعر بھی کہے تھے۔

غزل گوئی میں ہاتف سعدی اور حافظ کی روش کا پیرو ہے۔ اس فن میں اس نے کمال حاصل کیا۔ شاعر نے قطعے، قصیدے اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ لیکن اس کی شہرت کاغداد اس کے غیر فانی

ترجیع بند پر ہے۔ اس کے کلام کا خاص جوہر بندش کی چستی اور  
دقتِ معنی ہے۔ الفاظ کی ترکیب بڑی حسین ہوتی ہے۔

ترجیع بند میں معرفت و تصوف کی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔  
وحدتِ ذات کا موضوع خوب بیان کیا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ  
یہ عالم جس ذات کا مظہر ہے وہ ایک ہے۔ اس ذاتِ واحد نے کثرت  
سے صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ کثرت میں وحدت کا جلوہ صرف  
عارف ہی دیکھ سکتا ہے۔ ظاہری آنکھ اس سے نا آشنا ہے چشم  
باطن یا بصیرت سے ہی حقیقت کا دیدار ہوتا ہے۔

یار بے پردہ از درو دیوار	در تجلی است یا اولی الایصار
شمع جوئی و آفتاب بلند	روز لیس روشن و تو در شب تار
گر ز ظلمات خود رہی بینی	ہمہ عالم مشارق الانوار
ز آب بیرنگ صد ہزاراں نگ	لالہ و گل نگر دراں گلزار
شود آساں ز عشق کارے چند	کہ بود نزد عقل لیس دشوار
صدر بہت لن ترانی ار گوید	باز مے دار دیدہ بر دیدار

حجر اصفہانی: سید حسین طباطبائی نام اور حجر تخلص تھا۔ آپ  
اصفہان کے نزدیک ایک موضع زوآرہ میں پیدا ہوئے تاریخ ولادت  
کا کچھ پتہ نہیں۔ البتہ تذکرہ نگاروں کے قول کی غرض سے آپ بارہویں  
صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں ہی علومِ متداولہ  
حاصل کر لئے۔ بڑے ذہین اور ذکی تھے۔ جوان ہوتے ہی اپنی  
استعداد اور ملکہ شاعری کا اظہار کیا اور زمانے کے عظیم المرتبہ

شاعر نشاط کی صدارت میں قائم کی گئی انجمن شعر میں شامل ہو گئے۔  
نشاط کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ اپنی قابلیت  
اور مقبولیت کے بل بوتے پر جلد بادشاہ وقت فتح علی شاہ قاجار  
کے دربار میں تقریب حاصل کیا۔ اور مجتہد الشعر کا لقب عطا ہوا۔  
شاہی دربار سے خوب انعام و اکرام پائے۔

تجمر کا خاص میدان قصیدہ گوئی ہے۔ آپ نے فتح علی شاہ اور  
اس کے بیٹے کی مدح میں پُر زور قصیدے لکھے۔ اس کے علاوہ  
امر کی مدح سرائی بھی کی۔ آپ نے اکثر قصیدوں میں قدیم اساتذہ  
النوری اور خاقانی وغیرہ کی طرز کی تقلید کی ہے۔ مدح کے علاوہ تجمر کے  
قصائد میں عرفان و حقیقت کے مضامین بھی بکثرت موجود ہیں، عید  
کی تہنیت میں جو قصیدہ ہے اس میں زندگی اور معرفت کے خیالات  
بیان کئے ہیں۔

تجمر کے قصائد میں جوش بیان کے علاوہ جذبات نگاری اور منظر  
کشی کے مرقع بھی بکثرت ملتے ہیں۔ مضامین کی گونا گونی قابل قدر ہے۔  
قدما کی روش جو عرصے سے متروک تھی اس کو از سر نو زندہ کرنے میں  
تجمر کا بھی قابل داد حصہ ہے۔ مضمون کی متانت اور بختگی اور مزینیت  
کے لحاظ سے تجمر کا کلام خراسانی طرز کا نمونہ ہے۔

تجمر کے قطعے اور غزلیات بھی ہیں۔ اور ہزل اور ہجویہ اشعار بھی۔ آپ  
کی غزلوں میں وہ رنگ اور خوبیاں ہیں جو بڑے غزل گو شعرا کی ہیں۔ آپ  
نے خاقانی کی مثنوی تحفۃ العراقرین کی تقلید میں ایک مثنوی لکھی ہے۔  
آپ نے ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔

نشاط اصفہانی: مرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی فتح علی شاہ قاجار کا وزیر خارجہ تھا۔ نہایت خوش نویس اور عربی، فارسی اور ترکی زبان کا ماہر انشا پرداز تھا۔ نشاط کی شاعری درباری ملک الشعرا صبا کے کلام کے مقابلے میں بہت بلند، خوش آہنگ اور لطیف ہے۔ گویا اگر صبا کو فارسی شاعری کا ذوق کہیں تو نشاط غالب تھا۔ فتح علی شاہ نے اسے معتمد الدولہ کے خطاب سے نوازا تھا۔

اس زمانے میں برطانیہ فرانس اور روس ایک شدیدی سیاسی کشمکش میں گرفتار تھے کہ ایران میں کیونکر اقتدار پیدا کیا جائے۔ اس سلسلے میں نشاط کی خط و کتابت انشا پردازی کا ایک بہترین مرقع پیش کرتی ہے۔

نشاط کا خاص انداز تغزل تھا۔ اس کے بہترین شاعر کار کا نام گنجینہ ہے اس نے فتح علی شاہ اور صبا کی کلیات کا مقفی عبارتیں تعارف نامہ بھی لکھا ہے۔

نشاط درباری امرا کے زمرے میں شمار ہوتا تھا۔ انہیں حکمت، ریاضی اور ادبی علوم میں نہایت اچھی دسترس حاصل تھی۔ نشاط کی شاعرانہ اور ادبی سرگرمیوں اور کوششوں سے اصفہان علم و ادب کامرکز بن گیا تھا آپ نے اور آپ کے مقلدوں نے مل کر قدما کی روش کو شعر و شاعری میں از سر نو زندہ کیا۔

نشاط نے غزل کے علاوہ قصیدے، ثنوی اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ قصائد میں انہوں نے مقدمین کا رنگ اختیار کیا۔ آپ نے امیر معزی، نوری ایسے اساتذہ کے قصائد کے جواب میں قصیدے

لکھے۔ غزل گوئی میں بھی قدیم استادوں کے کلام کو پیش نظر رکھا اور حافظ، سعدی جیسے استادوں کی تقلید کی۔

نثر میں نشاط کے مراسلات، منشآت، مقالات، تمہیدات و تقاریر اور مناجات و شکایات وغیرہ ہیں۔ ان میں آپ نے ادیبانہ انداز اپنایا۔ اور فن النشایر دازی کی داد دی۔ آپ کی نثر اس زمانے کی مراسلہ نگاری اور درباری خط و کتابت کا نمونہ ہے۔ آپ نے ۱۲۲۷ھ میں وفات پائی۔

فتح علی خاں صبا: صبا متاخرین میں اول درجہ کے قصیدہ گو شاعر ہیں۔ آپ نے قصیدوں کے علاوہ غزل، رباعی اور شثنوی بھی کہی ہے۔ آپ کے ترجیع بند بھی خوب ہیں۔ فتح علی شاہ قاجار (شاہ ایران) کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کے بعد ملک الشعراء بن گئے۔

بقول رضا قلی خاں صبا سات سو سال بھر میں بہترین شاعر ہوا ہے۔ لیکن اس میں مبالغہ ہے۔ رضا قلی خاں یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض نقاد صبا کے شہنشاہ نامہ کو فردوسی کے شاہنامہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ خداوند نامہ، عبرت نامہ، گلشن صبا اس کی یادگار میں سے ہیں۔ اس کے دیوان میں دس اور پندرہ ہزار کے درمیان اشعار ہیں۔ صبا کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا مرزا حسین خاں عندلیب فتح علی شاہ کے دربار کا ملک الشعراء بنا۔ اس کا انداز محض قصیدہ گوئی تک محدود رہا۔ صبا کے قصیدے فتح علی شاہ، اس کے بیٹوں اور امراء دربار کی مدح میں ہیں، صبا نے ۱۸۲۲ء میں وفات پائی۔

صبا کی مشہور ترین شثنوی شاہنشاہ نامہ فردوسی کے شاہنامہ



کی پیروی میں اور اسی وزن میں لکھی گئی۔ اور اُسے سبباً نے اپنے ممدوح فتح علی شاہ کے نام پر مضمون کیا۔

صبا بھی ان شاعروں کے زمرے میں شامل ہے جنہوں نے قدما کی روش کو زندہ کیا۔ اس کے قصیدوں کے ملاحظہ سے صامت ظاہر ہے کہ اس نے فرخی اور منوچہری کے سے اساتذہ فن کی پیروی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کسی حد تک ان کے انداز میں کہتے ہیں کامیاب ہوا ہے۔

صبا ہمارے نگاروں کا خاص طور پر مشتاق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت سے پُر لطف اور دلکش نوزئیے بھی لکھے ہیں۔

**وصال شیرازی :** مرزا شفیق وصال شیراز کا رہنے والا تھا۔

قاچاری دور کا مشہور شاعر ہوا ہے۔ چھوٹی عمر میں ہی خوش نویسی کا فن سیکھ لیا تھا اور اس میں اُسے کمال حاصل ہو چکا تھا۔ علم سنوئی میں بھی قابلِ قدر دستگاہ رکھتا تھا۔ شاعری میں فطری ملکہ اس کی طبیعت میں ودیعت تھا۔ اس نے قصیدے بھی کہے اور غزلیات و مثنوی بھی۔ شاعری میں اس نے صبا کی طرح قدما کی روش اختیار کی۔ غزل میں سعدی اور حافظ کی روش پر پلا۔

اس کی مشہور مثنوی ”ہزم وصال“ ہے جو استاد قدوسی کی طرز میں ہے۔ وصال نے وحشی کی مثنوی ”فرہاد و شیریں“ کو بایہ تکمیل تک پہنچایا اور اس کام کو بوجہ احسن انجام دیا۔ وصال نے معاطات الذہب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ وصال نے ۱۸۶۶ء میں وفات پائی۔

غزل گوئی وصال کا خاص میدان تھا۔ اس میں اس نے جدت خیال اور دقتِ مضمون کا حق ادا کیا۔ ترکیب کی چستی اور محاورہ کی برہنگی قابلِ داد ہے زبانِ تعقید سے پاک ہے۔ سعدی اور حافظ کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔

وصال کا خاندانِ علم و ادب میں نامور ہے۔ اس کے بیٹے بھی بلند درجہ کے ادا اور شعرا تھے۔ وقار کے ترجیع بند اور مستط مشہور ہیں میرزا محمود ماہر طبیب ہونے کے علاوہ شعر و شاعری میں بھی ذوقِ سلیم رکھتا تھا۔ کئی ایک زوردار قصیدے بھی لکھے ہیں۔ اپنے باپ کی طرح خوش نویس بھی تھا اور نستعلیق میں کمال رکھتا تھا۔ وقار خط نسخ میں استادانہ دستِ نگاہ رکھتا تھا۔

نمونہ کلام:

بغیر دیر مغاں دل ندید جائے را کہ فرق مے نہند از شہی گدائی را  
سلوک وادی خوشنوا عشق کیسا نسبت چہ راہ گمشدہ را چہ رہنمائی را

پنختہ در کعبہ و تہانہ محو از من چہ رس بدور آں سوختہ چہ ز دریں خامے چند

قائم مقام اصفہانی۔

مرزا ابوالقاسم قائم مقام <sup>۱۱۹۳ھ</sup> میں پیدا ہوئے۔ آپ کو حکمت اور علم و ادب میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی عبارت فصاحت و بلاغت کا مرقع ہے۔ آپ کا کلام اور نثر دونوں مبالغہ، تصنع و تکلف اور پیچیدہ عبارت آرائی

سے پاک ہیں۔ آپ سادگی اور سلاست کے پرستار ہیں۔ آپ کی تحریریں انشا پر داری کا عمدہ نمونہ ہیں۔

قائم مقام نے قصیدے بھی کہے ہیں اور رباعیات اور قطعات بھی۔ آپ کی نثر شاعری پر فوقیت حاصل ہے۔ حقیقت نگاری اور شستہ اسلوب بیان آپ کے خطوط کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

شاعر کے کلام سے حب وطن کا جذبہ ٹپکتا ہے۔ ایک قطعہ ہو آپ نے روس کے حملے اور ایران کی شکست پر لکھا نہایت پُر تاثیر اور درد انگیز ہے۔ اس قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

روزگار راست آنکہ گریخت دہر گہ خوار دارد  
چرخ بازیگر ازین بازیچہ ہا بسیار دارد  
لشکرے را گہ باز گر گم دم خوار خواهد  
کشورے را گہ بدست مردم دمار دارد  
گہ تبریز از لیل بر گسیب خوار دارد  
گہ تفلیس از خراسان لشکرے جوار دارد  
رنج و شکوہ کے انداز میں ایک پُر زور قصیدہ لکھا جس کے چند شعر

یہ ہیں۔

لے بخت بد اے مصاحبِ جانم  
لے وصل تو گشتہ اصلِ حرامم  
لے بخت و گشتہ شام یک روزم  
لے بات و نرفته شاد یک آنم  
اے خرمینِ عمر از تو بر آدم  
وے خانہ صبر از تو ویرانم  
ہم کو کب سعد از تو منحوسم  
ہم مایہ نفع از تو خسرانم  
قائم مقام محمد شاہ کے حکم سے ۱۲۵۷ھ (مطابق ۱۸۴۱ء) میں  
طہران کے مقام پر قتل ہوا۔

مولانا شیخ علی حوزی۔ آبروئے متقین و فخر متاخرین مولانا شیخ

محمد علی بن ابی طالب ؑ میں بمقام اصفہان پیدا ہوئے آپ کی زندگی کا ابتدائی حصہ سیر و سیاحت اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوا۔ آخر ایک سیاسی سازش سے مجبور ہو کر ۳۳ھ میں ہندوستان کی طرف بھاگنا پڑا۔ حزبیں بہت بڑھ گئیں۔ اس کی تصنیفات میں سے تذکرۃ المعاصرین اور تذکرۃ الاحوال مشہور ہیں۔ پہلی کتاب میں ہمعصر فضلا اور مشرک اکاذکر ہے۔ دوسری میں اپنے سوانح حیات بیان کئے ہیں۔ ایرانی حکمرانوں نے ہندوستان پر جو حملے کئے تھے ان کے حالات بھی حزبیں نے رسالوں کی صورت میں قلم بند کئے ہیں۔ حزبیں نے سات شنوایاں اور چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔

شیخ علی حزبیں نے ۲۲-۲۳ھ میں ایک ادبی مجموعہ یا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا۔ اس کا نام تھا "مدۃ العمر" جب افغانوں نے اصفہان کو لوٹا تو مدۃ العمر ضائع ہو گیا۔ اسی اثنا میں وہ کئی ایک فلسفیانہ تفاسیر کے علاوہ فرس نامہ اور دو دیوان مرتب کر چکا تھا۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف تذکرۃ الاحوال میں ہندوستان کے متعلق واقعات درج کرنا پسند نہیں کیا۔ ۵۲ھ میں شیخ علی حزبیں نے اپنے ہمعصر شعرا کے حالات تذکرۃ المعاصرین میں بیان کئے۔ واقعہ گوئی اور حقیقت نگاری کے لحاظ سے حزبیں کی تصنیفات اس کے پیشرو اہل قلم کی ادبی کاوشوں سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ اور اس اختلاف کا سبب وہی مغربی اثر ہے۔

تذکرۃ الاحوال خوبی عبارت اور حسن مطالب کی وجہ سے بہت مقبول ہے ہزار شعرا کا ایک ساقی نامہ بھی خوشگوار انداز میں لکھا ہے۔ حزبیں کا کلام

یا محاورہ، متین، صاف اور بے اشکال ہے۔ اس کی بنیاد نصیحت، حکمت اور تصوف پر ہے۔ حمد میں اور اکثر بزرگوں کی تعریف میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ حافظ کی غزلوں کے جواب میں حزیں کی غزلیں خوب ہیں۔ اپنے بعض قابل اعتراض ارشادات کی وجہ سے حزیں اپنے معصروں کی نکتہ چینی کا نشانہ رہا ہے۔

حزیں ۱۶۶۶ء میں بنارس کے مقام پر فوت ہوا۔ بنارس کے ساتھ اسے عجیب دل بستگی تھی۔

از بنارس نروم معبر عام است اینجا ہر بہمن کچہ بچھم ج رام است اینجا  
نمونہ کلام:

گر بخ بمانائی اے خوش لقا! چہ باشد مار از ماستانی اے دلربا! چہ باشد  
از دیار ناموافق دوری ضرورت آمد گر ساعتی نشینی از خود جدا! چہ باشد

زان پیشتر کہ گردشِ دوراں کند خراب ساقی! ہر ایک دوسرے ساغر خراب کن

### لطیف علی بیگ آذر

آپ اصغہاں میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ تک افشاریہ خاندان کے حکمرانوں (۱۷۳۶ء تا ۱۷۹۶ء) کی خدمت میں رہے۔ آخر عمر میں آپ درویش ہو کر فقر اور مطالعہ میں محو ہو گئے۔ ۱۷۶۰ء سے ۱۷۷۷ء تک کے دوران مشہور کتاب ”آتش کردہ“ لکھی۔ اس میں ایک ہوا سی سے زیادہ شعرا کے سوانح حیات ہیں۔ آپ کا دیوان عام قسم کے تقریباً تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ رومانیتیک انداز میں ”یوسف و زلیخا“

کے نام سے ایک تنوی بھی نظم کی۔ اس کا انداز بیان بہت بلند اور چچا  
تلا ہے۔ آڈرنے ۱۵۵۰ء میں وفات پائی۔  
آپ کی شہرت کا مدار آپ کی مشہور تصنیف ”آتش کدہ“ پر ہے۔  
آتش کدہ میں ان شعرا کے حالات اور کلام پر نقد و تبصرہ ہے۔ یہ تصنیف  
سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ تاریخ نویسی، سوانح نگاری، تنقید اور سوانح نگاری  
کے نقطہ نظر سے آتش کدہ کو تذکرۃ الاحوال اور تذکرۃ المعاصرین ہر دو  
پر فوقیت حاصل ہے۔ شاعروں کی ترتیب ان کے مولد و منشائے مطابق  
پیش نظر رکھی گئی ہے۔ کتاب کے خاتمے پر آڈرنے اپنی سوانح حیات  
درج کی ہے۔ اگرچہ آتش کدہ میں دقیق ترین مغربی تنقید و تحقیق غائب  
ہے تاہم سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے اعتبار سے ایک نئے فن  
کا آغاز نظر آنے لگتا ہے۔

آڈرنے افشاریہ اور زندیہ خاندانوں کے عہد کے علما اور فضلا میں سے  
ہے۔ اس نے اپنے دور میں متاخرین کی روش سے ہٹ کر قدما کی طرز  
کی جانب رجوع کیا اور سبک ہندی سے اعراض کیا۔

## قائمی:

قائمی کا نام مرزا حبیب اللہ تھا۔ وہ ۱۸۰۷ء میں بمقام شیراز  
پیدا ہوا۔ اس کا باپ بھی شاعر تھا اور گلشن تخلص کرتا تھا۔ قائمی  
کی تاریخ ولادت کا پتہ اس کے اپنے ایک بیان سے چلتا ہے جو اس  
نے اپنی تصنیف ”کتاب پریشان“ کے آخر میں دیا ہے۔ شروع شروع  
میں وہ حبیب تخلص کرتا تھا۔ اس نے شعر و شاعری کا شغل علوم و دینیہ



کی تحصیل کے بعد اختیار کیا تھا۔ پہلے پہل وہ شجاع السلطنہ کی مداحی کرتا تھا۔ پھر جب زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ تو قاچار خاندان کے شاہی دربار میں رسائی نصیب ہوئی۔ محمد شاہ اور ناصر الدین قاچار (۱۸۲۸ء تا ۱۸۹۶ء) نے اس کی نہایت قدر دانی کی۔

قائمی کی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ غالباً اسے غیر معمولی حادثات اور واقعات کا بہت کم سامنا ہوا۔ اس کی موت ۱۸۵۳-۵۴ء میں طہران کے مقام پر ہوئی۔

قائمی کو تیرھویں صدی ہجری کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے اور یہ بات ہے بھی سچ۔ قائمی سے پہلے فارسی شاعری میں جس نئے دور کا آغاز ہوا اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مشتاقِ صفہائی لطف علی آذر اور سید احمد ہائف وغیرہ نکتہ دانوں نے قدما کا تتبع شروع کیا۔ قائمی نے اس دور کو بہت ترقی دی۔ یہاں تک کہ اس کی قادر الکلامی قدما کے دور کو ایک حد تک واپس لے آئی۔

قائمی کے کلام میں خوشنوائی اور روانی بدرجہ اتم ہے۔ اُسے فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک بہت بڑا عیب تھا تو یہ خوبیوں مدھم بڑھاتی ہیں۔ وہ عیب تھا بے اصولی۔ خوشامد سرائی ابن الوقتی اور سپت گوئی۔ اس نے اپنے بہت سے قصیدوں میں محمد شاہ قاچار کے وزیر اعظم حاجی مرزا آقا سی کی خوبیوں اور عدل پروری کی تعریف کی ہے۔ لیکن جب اسی مرزا آقا سی کی بجائے مرزا تقی خاں امیر کبیر اس عہدے پر فائز ہوتا ہے تو قائمی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے

بجائے ظالمیے شقی نشستہ عادی تھی کہ مومنان متقی کسند افتخار رہا  
 قآنی کی کلیات میں قصیدے، مستط اور ترکیب بند کو خاص امتیاز  
 حاصل ہے۔ اس نے گلستان سعدی کے انداز میں کتاب پریشان لکھی  
 اس میں ایک سو تیرہ حکایتیں اور تیس سے زیادہ نصیحتیں ہیں جو بادشاہ لیا  
 اور شہزادوں کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں۔ کتاب پریشان میں قآنی کے  
 سوانح حیات کے متعلق بھی کچھ مواد موجود ہے۔ قآنی کا کلام کئی بار چھپ  
 چکا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے مخصوص انداز میں قآنی کی شاعری پر جو  
 بحث فرمائی ہے اس کا بخوڑیہ ہے:-

قآنی کے تمام قصیدے قدما یعنی فرخی، منوچہری، سنائی اور خاقانی  
 کے جواب میں ہیں۔ الفاظ کی بہتات، مترادف الفاظ کا اجتماع، صنعت  
 ترصیع اور لف و نشر جو قدما کے خصائص ہیں۔ ان باتوں میں وہ قدما کا  
 ہمسرہ ہے۔ ان باتوں کے ساتھ جو قدرت کلام، صفائی اور روانی اس  
 کے کلام میں ہے قدما میں بھی نہیں۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں:-  
 ۱۔ تشبیہات اکثر نیچرل ہوتی ہے۔

۲۔ واقعہ نگاری میں کوئی شاعر آج تک اس کے رتبہ پہنچ نہیں ہوا۔

۳۔ قدما کے جو الفاظ سینکڑوں برس سے متروک ہو گئے تھے اور

جن میں اکثر غلط بھی تھے قآنی ان کو بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ اس  
 کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اسے شاعری کا دائرہ وسیع کرنا تھا یا یہ کہ قدما  
 کی مکمل تقلید مقصود تھی۔

۴۔ شعر کے متروک زحافات کو بھی وہ استعمال میں لایا جس کی

وجہ سے اس کا طرز تمام ایران پر چھا گیا لیکن یہ وہ روش ہے کہ قاضی کے  
رتبہ کی شاعری ہونو لطف دیتی ہے ورنہ بالکل بدمزہ اور خالی الفاظ کا  
ڈھیر رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاضی کے بعد پھر کوئی نامور ایران میں  
پیدا نہیں ہوا۔ سر آغا فراتے ہیں :-

انیسویں صدی میں ایران میں جو شعر ابیدہ ہوئے ان میں قاضی  
کا شمار عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ جس جوش، حسن بیان اور  
تنوع کے ساتھ قاضی نے فطرت کے مناظر کی تصویر کھینچی ہے اور  
فطرت کی روح کی ترجمانی کی ہے شاید ہی کسی فارسی شاعر نے کی ہو۔  
قاضی کا کلام موسیقی اور مسرت کے نعروں سے مملو ہے۔ اس  
کے شعر شہر میں ترنم اور شہاد کی روح دوڑتی ہے۔ قاضی کا عقیدہ ہے  
کہ زندگی ایک بے بیش بہا تحفہ ہے۔ اس کی عظمت اور شان میں کسی کو  
کلام نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ غنیمت ہے۔ اور اسے  
راحت و سرور میں صرف کرنا چاہئے۔

”دے یا غم ببردن جہاں کیر نمی ارد“

نموش کلام :-

باز برآمد بکوہ را بیت ابر بہار      سمیل فرو رخت سنگ ز زبر کوہ سار  
یا ز جوش آمدہ مرغان از سر کنار      فاختہ و بوا الملیح صلصل و سیک ہزار  
طوطی و طاؤس و بطاسیرہ و سرخاب سار

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف بو بہار      ویا گستہ خور عین ز زلف خویش تار یا  
ز سنگ اگر ندیدہ چسپاں جہد شہر اربا      بر گرہائے لالہ میں میان لالہ زار یا

کہ چون شرارہ سے بہمد ز سنگ کو ہسار رہا

کار طرب و روزے و فصل بہار  
جہاں نغم و دل فارغ و شاہ یکبارہ است  
باد سحر از آتش گل جگر سوز است  
خالک چین از آب روان کینہ وار است  
تا یہ نگر می کو کبہ سوری و سر و است  
تا یہ نشنوی ز زمزمہ صلصل سار است

### شہزادہ خاں ملک الشعراء

محمود خاں کا خاندان بلند پایہ شاعروں کا خاندان تھا۔ آپ کا داد فتح علی خاں صبا بادشاہ فتح علی شاہ کے دربار کا ملک الشعراء اور پیا کا والد محمد حسین خاں عنایتی بھی اسی بادشاہ کا درباری شاعر اور ملک الشعراء تھا گو یا ملک الشعراء کی کا لقب آپ کے خاندان کے لئے مخصوص تھا۔ محمود خاں کا شان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان زندیوں کے عہد میں عراق میں آگیا تھا۔ محمد حسین خاں عنایتی ناصر الدین شاہ کے زمانے میں بھی ملک الشعراء کے لقب سے سرفراز تھا۔

محمود خاں قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ علوم ادبی میں تبحر، تفسیر حکمت اور نقاشی میں بھی غامبی دستگاہ رکھتے تھے۔ تصدیق گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اور اس فن میں آپ نے قدم کی روش کی تقلید کی۔ عنصری، مستوی، فخری، صابری، معزی وغیرہ کی طرز سے بہت قریب رہے۔ ناصر الدین شاہ کے دربار میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اور اپنے والد عنایتی کی طرح آپ کو بھی ملک الشعراء کا عہدہ حاصل تھا۔ آپ نے ۱۳۱۱ھ میں ناصر الدین شاہ قاجار کے قتل

سے دو سال پہلے وفات پائی۔

محمود خاں کو فطرت سے خاص لگاؤ تھا۔ اور ان کی یہ ولایت کی ان کے کلام سے جا بجا پکنتی ہے۔

بادِ حبیبِ باد و بر بوستانِ گذشت  
بگرفت زلفِ ستیل از دُبا و تابا  
دو شبنمِ بادِ ہائے نرا سوئے تولاں  
بر درِ گلِ زدنِ سحر کہ گلا ہوا  
چوں سدرِ ہزار جامِ بلورین و اثر کون  
ہر آبدانِ زریزہ بارانِ جبا ہوا  
خوبانِ سپیدہ دمِ بسوئے بوستانِ شاد  
از بہرِ دیدنِ اُرخِ گلِ باستانِ ہوا  
حقے خوشِ است عاشقِ دلانِ رکنوں  
در خانہ داشتنِ نوناں باطنِ ہوا  
جز روزِ خرمی نبود در حسابِ عمر  
ما بر گرفتہ ایم ز گیتی حسابِ ہوا

محمود خاں نے اپنے بیشتر قصائد میں ناصر الدین شاہ اور اراکینِ دربار کی مدح سرائی کی ہے۔ مدح کے علاوہ کئی تاریخی واقعات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

مثلاً محمد شاہ کی وفات، ناصر الدین شاہ کی تخت نشینی، جشن اور بزم کے رسوم وغیرہ۔ ذیل کے شعروں سے محمد شاہ کی وفات پر ملک کی حالت کا نقشہ ظاہر ہے۔

چوں تختِ ملک تھی ماند از محمد شاہ  
کہ نوشتہ باد و دانشِ لیلیم دیگر  
بشہر تبریز اندر خبرِ سیدِ شاہ  
کہ حالِ دگر شد ز کینہِ اختر  
ہے گشتِ درونِ چشمِ خسرو آب  
ہم ازاں فراقِ پیر ہم ز سوزشِ کشور  
زمینِ سازِ سفر چوں سوگِ شہِ پیر  
بلشت در سرِ خسرو ہزار گونہ فکر  
نخواست پیشِ پے مصلحتِ خدیو بزرگ  
ہر آنکہ بود بدو کہ ز کھتر و جہت

## رضا قلی خاں ہدایت

رضا قلی خاں <sup>۱۲۸۵ھ</sup> میں بمقام طبرستان پیدا ہوا۔ محمد شاہ اور ناصر الدین شاہ کے دو بار میں رہ کر بہت سے علوم و فنون حاصل کئے۔ آپ بے شک شاعروں کے زمرے میں شامل ہیں لیکن شاعری آپ کا اصلی میدان نہیں ہے۔ آپ کی شہرت کا مدار آپ کی قابل قدر تصنیف مجمع الفصحاۃ یعنی آپ تذکرہ نگار کی حیثیت سے بلند درجہ رکھتے ہیں مجمع الفصحاۃ دو جلدوں میں تقسیم ہے۔ اس میں بادشاہوں اور شہزادوں کے درباری شاعروں کے ساتھ ساتھ دوسرے مشہور اور معروف ایرانی شاعروں کے حالات و حکیپ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کی خوبی اور شہرت کا سبب یہ ہے کہ رضا قلی خاں نے جن شعرا کا ذکر کیا ہے نمونہ کے طور پر ان کے بہترین اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ رضا قلی خاں نے یہ کتاب لکھ کر فارسی علم و ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اور بعض ایسے اشعار اور ایسے شاہکار ہم تک پہنچائے ہیں جن کا اس کے بغیر ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

رضا قلی خاں نے ہدایت تخلص کرتے ہوئے تیس ہزار سے زیادہ اشعار یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ آپ نے اپنی غزلوں اور قصیدوں کے کچھ نمونے خود مجمع الفصحاۃ میں پیش کئے ہیں آپ کا کلام اوسط درجے کے شاعروں کا سا ہے۔ مجمع الفصحاۃ کے علاوہ آپ کی تصنیفات ہیں:۔  
 (۱) مکملہ روضۃ الصفا (۲) لغت الجمن آرا (۳) ریاض العارفین۔  
 اس تذکرے میں ایران کے صوفی شاعروں کا ذکر ہے۔ شاعروں کے



کلام سے انتخابات دیئے گئے ہیں۔ مصنف نے اپنی شنویوں کا انتخاب بھی اس میں شامل کیا ہے۔

### رشید یاسمی

آپ کا نام غلام رضا خاں اور تخلص رشید ہے۔ آپ کی ولادت ۱۳۱۷ھ میں ہوئی۔ اپنے وطن کرمان شاہ (ایران) میں ابتدائی تعلیم پائی تحصیل علم و ادب کے لئے آپ تہران تشریف لے گئے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ وزارت تعلیم اور وزارت مالہ میں خدمات انجام دیں۔ دانشکدہ ادبیات میں تاریخ اسلام کے لکچرار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ آپ نے اخبارات اور رسائل و جرائد میں اپنے قابل قدر مضامین بھی اشاعت کئے تھے۔ آپ کو ہندوستان کا سفر کرنے کا بھی موقع نصیب ہوا۔

آپ کا طرز ادا قدیم ہے لیکن مضامین جدید رنگ کے ہیں۔ آپ نے ہر قسم کی شاعری کی ہے۔ قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں۔ مقطعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ آخر عمر میں سکتہ کے مرض کا شکار ہو گئے اور یکم (۵۵) سال کی عمر میں انتقال کیا۔

رشید صاحب کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

- (۱) ایران و ہند (نظم) (۲) خاطرات ہند (نظم) (۳) شرح حال سلمان ساوجی (نثر) (۴) منتخبات فردوسی (نظم) (۵) اندرز نامہ سی (نظم)
  - (۶) تاریخ مختصر ایران (نثر) (۷) ترجمہ ادبیات ایران (نثر)
- نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

و حشت آید زین خرامِ خلوت آباد کو؟ نالہ یاد سینه دارم طاقنتِ قریاد کو؟  
 گل ندارد دغندہ بلب بلب خوش خواں کجا ست؟  
 دل نگیرد راہ بُستان، جلوہ شمشاد کو؟  
 نغمی از گشت زار ان شادی از دلہا برفت؟  
 فیضِ باران پر تو خورشید و لطفِ باد کو؟  
 بادہ صافی شد درینا بادہ پیمائی نہا ند؟  
 نیست بے شیریں جہاں شوریدہ دل فریاد کو؟

## صفوی اور قاچاری دور کا نثری ادب

لغات :-

صفوی دور خاص طور پر فارسی فرہنگوں اور لغات کی تالیف و تدوین کے لئے مشہور ہے۔

۱۔ بریان قاطع۔ اس کتاب کا مصنف محمد حسین بن خلف تبریزی ہے۔ اس کا تخلص بریان تھا۔ اس لغت کی تالیف میں مصنف نے فرہنگ سروری اور فرہنگ جہانگیری سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب شکستہ میں مکمل ہوئی۔ اور ہندوستان میں گوشتارہ کے حکمران سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام پر معنون کی گئی۔

یہ ایک مفصل اور جامع لغت ہے۔ اس میں عربی، یونانی اور دوسری زبانوں کے الفاظ بھی دیئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے نامور اردو شاعر غالب نے جو فارسی کے بھی عالم تھے اس کتاب پر نکتہ چینی

کرتے ہوئے ایک کتاب "قاطع برہان" کے نام سے لکھی۔

۲۔ غیاث اللغات۔ یہ کتاب محمد غیاث الدین کی تصنیف ہے۔ یہ ۱۰۲۰ھ میں لکھی گئی۔ اس میں فارسی، عربی اور ترکی کے وہ تمام الفاظ و ترکیب مندرج ہیں جو فارسی نظم و نثر کے مطالعہ میں پیش آتے ہیں۔

۳۔ فرہنگ جہانگیر۔ اس کتاب کا مصنف جلال الدین حسین انجو بادشاہ اکبر اور جہانگیر کے درباروں سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اُسے دونوں بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ لغت شہنشاہ اکبر کے حکم پر شروع ہوئی اور ۱۵۸۵ء میں مکمل ہونے پر شہنشاہ جہانگیر کے نام سے منسوب کی گئی۔ اس لغت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر لفظ کی وضاحت کرتے وقت اساتذہ کے شعر بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔

۴۔ فرہنگ رشیدی۔ اس لغت کا مصنف عبدالرشید ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اُسے شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں تقریب حاصل تھا۔ اس کتاب میں دیگر بیشتر لغات کے مقابلے میں زیادہ احتیاط اور وقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ۱۰۶۴ھ میں لکھی گئی۔

۵۔ مجمع الفرس۔ اس فارسی لغت کو فرہنگ سروری بھی کہتے ہیں۔ اس کا مصنف محمد قاسم کاشانی المعروف "سروری" ہے۔ یہ کتاب شاہ عباس اول کے دور حکومت میں ۱۰۸۰ھ میں تصنیف ہوئی۔

۴۔ انجمن آرا۔ فرہنگ انجمن آرا رضا قلی خاں ہدایت  
کی آخری تصنیف ہے یہ خالصتہً فارسی الفاظ کی لغت ہے اور بالعموم  
فارسی الفاظ کی تشریح کے ساتھ ساتھ فارسی مثالیں اور شعر  
دیئے گئے ہیں۔ ضمیمہ کے طور پر اس میں فارسی ضرب الامثال بھی درج  
کی گئی ہیں۔ اس کتاب کو لکھنے وقت مصنف نے فرہنگ انگری  
کو سامنے رکھا۔

### مذہب اور فلسفہ

۱۔ جامع عباسی۔ یہ کتاب شیخ محمد بن حسین عاملی المعروف  
”شیخ بہائی“ کی لکھی ہوئی ہے۔ شیخ بہائی شاہ عباس کے دربار کا  
نامور اور معزز و مقرب عالم تھا۔ اس کتاب میں شیعی احکام فقہ کا بیان ہے۔  
۲۔ گوہر مراد۔ اس کتاب کا مصنف عبدالرزاق بن علی بن  
حسین لاهیجی ہے۔ یہ کتاب شاہ عباس کے عہد میں تصنیف ہوئی اور  
حکمت و علیم کلام اس کا بحث ہے۔ لاهیجی صفوی دور کا مشہور عالم  
و حکیم تھا۔

۳۔ اسرار الحکم۔ اس کتاب کا مصنف حاجی ملا ہادی سبز واری  
ہے یہ کتاب ناصر الدین شاہ کے حکم پر لکھی گئی۔ اس میں حکمت و عقاید  
دین پر بحث ہے۔ حاجی ملا ہادی کا شمار قاچاری دور کے درجہ اول  
کے حکماء و علما میں ہوتا ہے۔ آپ شعر بھی کہتے تھے اور اسرارِ خلص  
کہتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔

۴۔ ایواب الجنان؛ مصنفہ رفیع الدین محمد واعظ قرظینی۔

عقاید دین اور اخلاق پر ہے۔

۵۔ معراج السعادت: احمد بن محمد ہمدانی کی تصنیف ہے۔  
اور یہ آپ کے والد محمدی کی عربی کتاب "جامع السعادت" کا فارسی  
ترجمہ ہے۔

۶۔ تلحین الحیات، مشکوٰۃ الانوار، معراج المؤمنین، حق لائقین،  
حیات القلوب، وغیرہ یہ تمام کتابیں محمد باقر مجلسی کی تصنیف کردہ ہیں۔  
اور دین و حکمت و اخلاق کے مسائل سے متعلق ہیں۔

## تذکرات و سوانح :-

۱۔ مجالس النفاہ: یہ کتاب امیر شیر علی نوائی کی ترکی زبان میں  
لکھی ہوئی ایک کتاب کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس میں شیر علی نوائی کے زمانے  
کے شاعروں اور ادیبوں کے سوانح حیات مذکور ہیں۔ شاہ عباس  
کے عہد میں شیر علی نے اس کتاب کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۲۔ تحفہ سامی: اس کتاب کا مصنف شاہ اسماعیل کابیٹا  
سام مرزا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے ہمعصر شعر کا حال بیان کیا  
ہے۔ یہ ۹۵۷ھ میں مکمل ہوئی۔

۳۔ مجالس المؤمنین: یہ کتاب قاضی نور اللہ شمشیری کی  
تصنیف ہے۔ جو ایران سے ہندوستان میں آئے اور شہنشاہ اکبر  
کی طرف سے شہر لاہور کے قاضی مقرر کئے گئے۔ لاہور میں ہی یہ کتاب  
۹۹۳ھ میں شروع ہوئی اور ۱۰۱۸ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں  
شعرا، صوفیا، فقیہوں، بادشاہوں اور شیعہ علما و حکماء کے حالات

بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ ہفت اقلیم: اس کتاب کا مصنف ابن احمد رازی ہے۔

اس کتاب کو مکمل کرنے میں اُسے پچھ سال لگے۔ اور سن ۷۸۵ھ میں مکمل ہوئی۔ کتاب میں اقلیم کے لحاظ سے شہر کی نسبت بندی کی گئی ہے۔

۵۔ آتش کدہ: یہ کتاب لطف علی بیگ تبریزی کی تصنیف ہے۔

فارسی تذکرات میں اس کا بہت بلند مقام ہے۔ یہ تذکرہ ۷۴۳ھ

میں مکمل ہوا جب مصنف کی عمر چالیس برس کی تھی۔ آذر کی تمام تر شہرت

کا مدار اسی کتاب پر ہے۔ ”آتش کدہ“ میں ان شعرا کے حالات اور کلام

پر تبصرہ ہے جو مصنف سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ تاریخ نویسی، سوانح

نگاری، تنقید اور فن کاری کے نقطہ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے

اور تذکرۃ الاحوال اور تذکرۃ المعاصرین ہر دو پر فوقیت رکھتی ہے۔

شاعروں کی ترتیب ان کے مولد و منشا کے مطابق پیش نظر رکھی

گئی ہے۔ کتاب کے خاتمے پر آذر نے اپنی سوانح عمری درج کی ہے۔ اگرچہ

آتش کدہ میں دقیق ترین مغربی تنقید و تحقیق غائب ہے تاہم سوانح نگاری

اور تاریخ نویسی میں ایک نئے فن کا آغاز نظر آنے لگتا ہے۔

۶۔ نامہ دانش وراں۔ یہ کتاب ناصر الدین شاہ کے دور

حکومت میں متعدد علمائے مل کر مرتب کی۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل

ہے۔ یہ ایک مفصل اور جامع تذکرہ ہے جس میں ایرانی علما و ادبا

کے سوانح زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مصنفین ہیں:

شمس العلماء عبد الرتب اور میرزا ابوالفضل ساوجی کے نام قابل

ذکر ہیں۔ اس کے آخری اور ساتویں جلد کو ایک اور ادیب غیاث



ادیب کی امداد سے پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا۔

۷۔ ریاض العارفین: پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۸۔ مجمع الفصحا: پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۹۔ نجوم السما: یہ تذکرہ محمد صادق بن حمادی کی تصنیف ہے جو

ناصر الدین شاہ کے عہد میں ہوا ہے۔ اس میں صفوی اور قاچاری دور کے فقیہوں کے حالات لکھے ہیں۔ یہ فقیرہ شیعہ تھے۔

مذکورہ بالا تذکرات کے علاوہ مندرجہ ذیل تصنیفات بھی صفوی اور قاچاری دور کی یادگار ہیں:-

۱۰۔ ہزم آرا (مصنف سید علی): تذکرہ میخانہ (لطف الشرازی)

خرانہ عامرہ (آزاد حسینی): خلافت الافکار (ابوطالب تبریزی)۔

ریاض الشعرا (علی قلی خان): قصص العلماء (محمد بن سلیمان)

## تواریخ:

۱۔ زبدۃ التواریخ: اس کتاب میں صفویوں کے آخری دور

کے حالات مذکور ہیں نیز افغانوں کے حملوں کا بھی بیان ہے۔ اس کتاب کا مصنف محمد حسن بن عبدالکریم ہے۔ اس نے اپنی اس تاریخ میں چشم دید واقعات بیان کئے ہیں۔

۲۔ حبیب السیر: اس کتاب کا مصنف خواند میر ہراتی ہے

جو بابر بادشاہ کی دعوت پر ہندوستان میں آیا اور ہندوستان

میں اس کتاب کی نظر ثانی کی۔ یہ ایک نہایت مبسوط اور مفصل

تاریخ ہے جس میں ابتدائے عالم سے لے کر شاہ اسماعیل کے دور

حکومت کے حالات (سنہ ۹۳۳ھ) تک بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں شعرا و علما و ادبا کے احوال بھی مذکور ہیں۔

۳۔ صفوة الصفا: یہ ابن بزاز کی تصنیف ہے۔ اس میں صفویوں کے بزرگوں کا مخصوص شیخ صفی الدین کے حالات مندرج ہیں۔ یہ کتاب از سر نو شاہ طہماسپ کے عہد میں لکھی گئی۔

۴۔ احسن التواریخ۔ اس کتاب کا مصنف حسن بیگ راملو ہے جو ایک بلند درجہ عالم و فاضل تھا۔ یہ کتاب دسویں صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی اور شاہ طہماسپ کے عہد کے حالات و واقعات مذکور ہیں۔

۵۔ مجمل التواریخ۔ یہ تصنیف ابوالحسن بن محمد امین گلستانہ کی ہے۔ اس میں نادر شاہ کے بعد آنے والے پینتیس سالوں کے حالات یعنی افشاریہ اور زندیہ خاندانوں کے واقعات مذکور ہیں۔ ۶۔ تاریخ عالم آرائے عباسی۔ اس تاریخ کا مصنف اسکندر منشی ہے اس میں شاہ عباس اول اور اس کے اسلاف کی حکمرانی کے حالات مذکور ہیں۔ یہ شاہ صفی (بن شاہ عباس) کی تخت نشینی (سنہ ۱۰۳۸ھ) تک کے واقعہ پر ختم ہوتی ہے۔

۷۔ تاریخ نادری۔ یہ تاریخ میرزا محمدی خاں بن محمد نصیر استرآبادی کی تصنیف ہے۔ اس میں نادر شاہ کے آغاز سلطنت سے اس کی وفات (سنہ ۱۱۶۵ھ) تک واقعات مذکور ہیں۔ اس کتاب کی تاریخ اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ مصنف خود نادر شاہ کے سفروں اور حملوں میں اس کے ساتھ ہمراہ تھا۔ اور جو واقعات اس نے بیان کئے ہیں وہ اس کے چشم دید ہیں۔

۸۔ تاریخ زندریہ۔ اس کتاب میں کریم خاں زند کے وارثوں اور جانشینوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا مصنف علی رضا بن عبد الکریم ہے۔

۹۔ تتمہ روضۃ الصفا۔ غیاث الدین میرخواند (نیر خواند میر) نے تاریخ روضۃ الصفا کی ساتویں جلد کو مکمل کیا اور اس میں سلطان حسین یا قراکلی وفات کے بعد تک کے حالات بیان کئے اور سلطان کی اولاد اور اس دور کے مشاہیر کا بھی ذکر کیا۔ بعد میں قاچاری عہد کے دوران رضا قلی خاں ہدایت نے اس پر مزید تین جلدوں کا اضافہ کیا اور ناصر الدین شاہ قاچار کے دور تک کے حالات و واقعات بیان کئے۔ گویا تتمہ و مکملہ سمیت روضۃ الصفا کی کل دس جلدیں ہیں۔

۱۰۔ ناسخ التواریخ۔ یہ نہایت اہم اور مبسوط تاریخ ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں لکھی گئی۔ اس کا مصنف میرزا تقی سپہر ہے جو ناصر الدین شاہ کے دربار میں مستوفی تھا۔ یہ ایک بڑا عالم اور مورخ تھا۔ اس نے اس کتاب کی گیارہ جلدیں مکمل کیں۔ بعد میں علی خاں سپہر نے چند مزید جلدیں لکھ کر اس میں اضافہ کیا۔ ان جلدوں میں علی خاں نے ائمہ کے حالات کے علاوہ ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد کے مزید تفصیلی حالات بیان کئے۔

۱۱۔ تاریخ منظم تاصری۔ اس کا مصنف محمد حسن صنیع الدولہ ہے جو ناصر الدین شاہ کا وزیر تھا۔ اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر مصنف کے عہد تک کے حالات مذکور ہیں۔ یہ تاریخ تین جلدوں

پر مشتمل ہے۔

سوال۔ تعزیر سے کیا مراد ہے؟ ایران میں نماشاے تعزیر یا تعزیر گردانی پر روشنی ڈالئے۔

جواب: صفوی وقتوں کے شاعروں نے جگر گوشہ رسول کی شہادت کے متعلق نہایت درد انگیز مرثیے لکھے ہیں۔ لیکن اس وقت تک اس واقعہ جانکاہ کو ڈرامائی انداز میں یعنی تمثیل یا ناٹک کے طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ سید تقی زادہ کی رائے ہے کہ روضہ خوانی کا آغاز تو صفویہ سے ہوا لیکن تعزیر گردانی یا شبیہ کار وراج ایک مدت بعد روپذیر ہوا۔ صفویہ خاندان کے زمانہ میں تو صرف عشرہ محرم کے دس دن تک ایران میں محاسن عزرا ہوا کرتی تھیں۔ مرزا حسین دانش کا خیال ہے کہ تعزیر گردانی انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں شروع ہوئی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس رسم میں مغربی فن تمثیل کی تقلید کا جا بجا پرتو نظر آتا ہے۔

واقعہ کربلا کی درد انگیزی کا یہ عالم ہے کہ بڑے سے بڑے آزاد مشرب اور لاپرواہ شاعر بھی اس کی تاثیر سے محروم نہ رہ سکے۔ یغمانے ایک قسم کا مرثیہ ایجاد کیا جسے وہ نوحہ سینہ زنی کا نام دیتا ہے۔ یہ کیا عجیب بات ہے کہ یغما اور قالی کے سے آزاد خیال اور آوارہ مزاج شعرا نے بھی اپنے کلام میں شہیدان اسلام کے لئے اتہائی درد مندی اور الم کا اظہار کیا ہے۔

عہد قاچار یہ میں حضرت علی، حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے مرثیے منظوم ڈراموں کی صورت میں پیش کئے جاتے

لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایران میں المیہ یا تمثیل مضیبت (TRAGEDY) کا واحد قائم مقام تعزیه ہی ہے۔ اور کہ ایرانی لوگوں کے جذبات سیاست کے مقابلے میں مذہب کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اس لئے محرم کی پہلی دس راتوں میں ہر سال تماشائے تعزیه نہایت خلوص کے ساتھ دکھایا جاتا ہے حقیقی درد کی پاکیزہ سادگی تعزیه کو کامیاب بنانے میں بہت مدد دیتی ہے۔

تماشائے تعزیه میں نہ تو تمثیل کا مصطبہ (STAGE) ہوتا ہے اور نہ ہی پردے یا پردوں کے منظر بلکہ ایک کھلے میدان میں ایک بلند چبوترہ (سکو) بنایا جاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک چوڑا سا راستہ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ مقلدین یا ممثلین (ACTORS) کو نقل و حرکت میں آسانی رہے۔ جب مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے حاضرین سب جمع ہو جاتے ہیں تو ایک توب سر کرتے ہیں جس سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب تماشائے شروع ہو گا۔ سب سے پہلے سقوں کی ایک جماعت آتی ہے۔ یہ لوگ پانی سے بھری مشکیں اٹھائے اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ اور ”بیاد لب تشنہ کربلا“ کے جاس سوز نعرے لگاتے ہیں۔ حاضرین دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ہیں اور چھاتی پیٹنے لگتے ہیں ”ہائے حسینؑ“ ”وائے حسینؑ“ کے فلک رس نعروں سے شور قیامت برپا ہو جاتا ہے۔ پھر تعزیه کے افراد آتے ہیں۔ ان میں جناب رسالت مآب صلعم، انبیائے عظام بلکہ اہل بیت نبوی، معاویہ، یزید اور شمر وغیرہ کے ممثل ہوتے ہیں پیغمبران اور مستورات کے مثل نقاب پوش ہوتے ہیں۔ لڑکوں اور مستورات

کے سوانح عموماً امر اور متمول لوگوں کے بے ریش معصوم بچے بھرتے ہیں اور تماشا میں تبر کا حصہ لیتے ہیں۔ جو لوگ شمر ملعون اور یزید پلید وغیرہ کا پارٹ ادا کرتے ہیں ان پر حاضرین اس درجہ عملاً لعنت اور نفرت کرتے ہیں کہ انہیں جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے اس کام کے لئے قیدیوں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ تمام ممثل سکوپر ایک ہی جگہ مناسب حال اسلحہ اور لباس میں ہوتے ہیں۔ اگر تماشے کے دوران لباس بدلنے کی ضرورت پیش آجائے تو مدیر مصطفیٰ (STAGE DIRECTOR) جسے استاد کہتے ہیں اس کام میں مدد دیتا ہے۔ ہر ایک ممثل کے پاس اس کا حصہ نظم میں لکھا ہوتا ہے اور اگر کہیں وہ بھولتا ہے تو حاضرین کے سامنے فوراً اس کا غد کو دیکھ کر حافظہ تازہ کر لیتا ہے۔ استاد کے ہاتھوں میں پورا نسخہ (PROMPT BOOK) موجود ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ممثل کو نقشہ (PROMPT) دیتا رہتا ہے۔

سوال۔ قاجاری عہد حکومت میں بابی۔ یہانی تحریک پر مفصل نوٹ لکھئے۔

جواب: بابی مذہب کا بانی سید محمد علی تھا۔ اس نے اپنی تصنیف بیان میں اپنے ظہور کی تاریخ ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء مقرر کی ہے۔ یعنی بارھویں امام ہمدی کی غیبت کے پورے ایک ہزار سال بعد سید محمد علی اپنے آپ کو امام ہمدی کا باب یعنی دروازہ کہتا تھا۔ امام ہمدی کے چار دروازے (ابواب) تھے جن کی مدد سے وہ اپنی غیبت صغریٰ میں اپنے



پیروکاروں اور شیعہ کاکل کے ساتھ راہ و رسم جاری رکھ سکتا تھا  
 گویا باب شیعہ لوگوں اور امام ہمدی کے درمیان ایک واسطہ۔  
 (وسیلہ) تھا۔ اس کے دعووں کی ابتدا ”بالافتن“ سے ہوئی۔ یہ  
 باب ۸۱۹ء میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ بالغ ہوا تو سید کاظم  
 رشتی کی جو اس زمانہ کے مشہور علما میں سے تھے شاکر دی اختیار  
 کی۔ ۸۲۲ء میں باب نے اپنے مذہبی و سیاسی اصول و ضوابط  
 پبلک کے سامنے پیش کئے۔ اور اسی سن میں اس نے دعوے  
 مسیح موعود ہمدی بھی کیا۔ ۸۲۳ء میں اس نے حج بیت اللہ کا  
 شرف حاصل کیا۔ اور واپسی پر حکیم سلطانی گرفتار ہوا۔ حالت  
 اسیری میں باب نے دربار شاہی میں اپنا توبہ نامہ پیش کیا اور رہا  
 ہوا۔ مگر جب دوبارہ اس نے وہی دعوے کیا تو علمائے مجتہدین  
 کے اصرار سے شاہ ایران نے ۸۲۵ء میں اس کو قتل کر دیا۔  
 باب کو گناہ کا یہ صرع (مرگی) کا دورہ پڑتا تھا۔ ضعیف الاعتقاد  
 مسلمانوں کے لئے اس کے یہ دوسرے وحی والہام کے مترادف  
 ہوتے تھے بلکہ یہ لوگ تو باب کو ”مخدا آخرین“ کہنے لگے تھے۔

شہزادہ ناصر الدین قاجار جب فارس کے تخت شاہی پر  
 جلوہ فگن ہوا تو اس نے اس فرقہ کے متعلق تحقیق و تفتیش کی  
 خاطر ایک بڑی تحقیقاتی مجلس مقرر کی اور جب ارکان مجلس نے  
 اس گروہ کی تکذیب و تکفیر کا فتویٰ دیدیا تو بالی مذہب کے معتقدین  
 اور پیروؤں کو سخت سزائیں دی گئیں۔

دنیاوی دولت و ثروت نے باب کے آئین و ضوابط کی

تبلیغ و اشاعت میں بڑی حد تک کام دیا۔ ایک نہایت شریف النسل  
 نوجوان خاتون جو بلا کی حسین اور قابل تھی اور قرۃ العین کے نام سے  
 مشہور تھی بانی مذہب کی زبردست حامی و مبلغ تھی۔ یہ خاتون بالآخر  
 نہایت عبرت ناک اور ہیبت ناک طریقے سے قتل کی گئی۔ قرۃ العین  
 کا قتل ایک ایسی برقی قوت کا مظہر ثابت ہوا کہ پل کے پل میں تمام  
 ایران اس جدید مذہب کے رنگ میں رنگا گیا۔ باب عمدہ ایرانی  
 خط و خال کا ایک حسین و دلکش مروت تھا۔ وہ عورتوں کی آزادی کا حامی  
 تھا۔ اس کی آواز اور لہجہ نہایت اثر انگیز تھے۔ یہ باتیں بھی اس کے  
 مذہب کی اشاعت میں مدد و معاون ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر  
 کارلک اور ڈاکٹر پالک کے سے یورپین سیاحوں کو بھی باب سے  
 عقیدت تھی۔

باب نے اپنے لاتعداد وفادار اور معتقد مریدوں میں سے اٹھارہ  
 اشخاص کو دنیا کے ”حروف حیات“ کا خطاب دیا۔ اس نے یہ  
 ثابت کرنا چاہا کہ آئندہ ہونے والے خلفا اس کی قائم کردہ بنیاد  
 پر عمارت تعمیر کریں گے۔ نیز یہ کہ خدائے عز و جل اس کے ہیولی  
 میں دنیا میں جلوہ گر ہوا اور آئندہ اس کے خلفا کی صورت  
 میں نمایاں ہوتا رہے گا۔ چنانچہ وہ خود کو ”واحد اول“ کہا کرتا تھا۔  
 باب ایک مذہبی و روحانی راہنما ہی نہ تھا بلکہ وہ سیاسی  
 راہبر بھی تھا۔ باب اور اس کے سرگرم و پرجوش مبلغین کی ہستیاں  
 حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ تھیں۔ ایران کے اکثر فرمانرواؤں  
 پسند اور متشدد تھے۔ اس لئے ملک کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال

طیفہ جو اس ابدی نحوست سے عرصہ ہوا بیدار ہو کر بیزار بیٹھا تھا اور محض موقع کا منتظر تھا قدرتا یاب کی تعلیم پر جو سر اسر تجدّد اصلاح و انقلاب پر مبنی تھی عامل ہو گیا۔ علما اور مذہبی پیشواؤں کے ناجائز اختیارات کو ختم کر دینے کی خواہش بھی عوام کو بانی مذہب کی طرف راغب کرنے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بابیوں نے ایک عظیم سیاسی انقلاب کے آثار پیدا کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بابی سرخون کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد بانی مذہب کے مبلغ اعظم کجی دارابی نے بابی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی از سر نو بنیاد ڈالی۔ مگر وہ بھی انتہائی بے دردی کے ساتھ مار ڈالا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے تمام پیرو بھی ہماری طرح ذبح کر دیئے گئے۔

۱۸۵۲ء میں بعض بابیوں نے شاہ ایران کے قتل کی سازش کی۔ مگر بد قسمتی سے یہ راز طشت از بام ہو گیا۔ ہلاک کے متعدد مقامات پر زبردست خفیہ انجمنوں کا سراغ لگا۔ یہ تمام انجمنیں مع ان کے تمام سرکردگان و کارکنان کے صفحہ ہستی سے بیرحمی کے ساتھ مٹا دی گئیں۔

باب کے سب سے پہلے متبعین میں سے کا شان کا ایک سوداگر حاجی مرزا جاتی تھا۔ وہ باب کے علاوہ صبح ازل، ہا اللہ حاجی سلیمان خان، ملا محمد علی زنجانی، سید کجی دارابی، ملا شیخ علی، قرۃ العین اور دیگر سربراہان بابیوں سے مراسم رکھتا تھا۔ وہ ۱۸۵۲ء میں مار ڈالا گیا۔ اس نے اپنی ضخیم کتاب ”نکتۃ الکاف“ میں بابی اصولوں اور تاریخ کی وضاحت کی ہے۔ ان اصولوں کی اشاعت بہت

حد تک مرزا جانی کے ذریعہ سے ہوئی۔ تکتہ الکات کی زبان سادہ، سلیس اور شستہ ہے۔ باب کے بعد اس کا روحانی خلیفہ مرزا یحییٰ یغنی صبح ازل بابی لٹریچر تقسیم کرنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف و منہمک رہا۔ ۱۸۵۲ء کے قتل عام کے فوراً بعد صبح ازل فرار ہو گیا۔ چند ماہ بعد اس کا سوتیلا بھائی مرزا حسین علی بہاء اللہ بھی بھاگ کر اس سے جا ملا۔ بابیوں نے شاہ ایران کے قتل کی جو سازش کی تھی اس کی استعانت کے سلسلہ میں بہاء اللہ بھی گرفتار ہو کر چار ماہ کے لئے محبوس کر دیا گیا۔

بہاء اللہ میں صبح ازل کے برعکس تمام وہ صلاحیتیں موجود تھیں جو شورشوں اور فتنہ سامانیوں کے درمیان قوم پر حکومت کرنے میں مددگار ہو سکتی تھیں۔ اسی لئے بہاء اللہ بالآخر صبح ازل کی مکمل بربادی اور اس کے روحانی اثر و اقتدار کے زوال کا باعث بنا اس لئے غالباً موسم گرما ۱۸۶۶ء میں کھلم کھلا جمہور کے روبرو خود کو "منظیر اللہ" (جیسے خدا ظاہر کرے گا) ظاہر کیا۔ اور اپنی روحانی عظمت کا اعلان کیا۔ اس کا اثر تمام بابی جماعت پر بہاء اللہ کے حق میں خوشگوار بڑا تمام معتقدین صبح ازل سے منحرف ہو گئے اور یکے بعد دیگرے بہاء اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس زمانہ میں فرقہ بہائیت حسن بن صیاح کے فداہیوں سے کم خطر ناک نہ تھا۔ تقریباً تمام "حروفِ حیات" موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ بہائی برابر ترقی کرتے گئے۔ آج ان کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ بہائیوں کے عقائد، خیالات اور اصول پرانے بابی یا جدید ازنی عقائد سے بالکل مختلف بلکہ بعض اوقات متضاد

ہیں۔ بہائیوں نے مرزا جانی کی تاریخ میں تصرف کر کے اس کو تاریخ جدید کے نام سے شائع کیا۔ اور اس میں سے بہائی پالیسی کے خلاف امور نکال دیئے گئے۔ مگر بہائیوں کو مرزا جانی کی تاریخ تکمیل طور پر تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

بہاء اللہ کے بیٹے عباس آفریدی نے ۱۸۸۶ء میں بابائی مذہب پر ایک تاریخ لکھی جس کا نام ”مقالہ شخصی سیاح“ ہے۔ اس تاریخ کے ذریعہ سے بہائی عقائد کی نشر و اشاعت کی گئی اور پرانے بابی عقاید سے اغاض کیا گیا۔ ”تاریخ جدید“ اور ”مقالہ شخصی سیاح“ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ثانی الذکر میں بہاء اللہ کو بابی مذہب کا اصلی پیشوا بتایا گیا ہے اور باب کا درجہ بہت گرا دیا گیا ہے۔ باب کو قائم اور حمدی کی حیثیت سے گرا کر محض ایک پیشرو ظاہر کیا گیا ہے۔

سوال۔ بہاء اللہ اور اس کے بہائی مذہب پر نوٹ لکھئے۔

جواب۔ بہاء اللہ ۱۸۴۷ء میں طهران میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ وزیر سلطنت اور عمادین میں سے تھا۔ وہ بلا کا حاضر جواب اور چربے بان تھا۔ باب اور بہاء اللہ کی ذاتی ملاقات نہ ہوئی تھی، بہاء اللہ غالباً نہ طور سے باب کا معتقد تھا۔ البتہ ان دونوں میں ہمیشہ خط و کتابت رہی۔ باب نے تبریز میں اپنی موت سے کچھ روز پہلے اپنی تحریرات اور مسودے اپنی انگوٹھی اور قلمدان بہاء اللہ کے سپرد کر دیئے تھے۔ چونکہ بہاء اللہ علی الاعلان اسلام ترک کر کے بڑی شد و مد سے بابی مذہب کی تبلیغ کرتا تھا اس لئے عام پبلک اور حکام اس سے سخت برگشتہ ہو گئے تھے جب بہاء اللہ نے بغداد میں ایک عظیم الشان بابی کانفرنس منعقد کی تو

ایرانی قونصل جنرل نے ترکی گورنمنٹ سے شکایت کی۔ چنانچہ ترکی گورنمنٹ بہاء اللہ کو ایڈریا نوبل بھیج دیا۔ جہاں وہ آٹھ سال تک رہا۔ پھر جب عثمانی گورنمنٹ نے وہاں بھی اس کا اثر بہت زیادہ پھیلتا ہوا دیکھا تو عرقہ کو منتقل کر دیا جہاں وہ ۱۸۹۲ء میں فوت ہو گیا۔

بہاء اللہ نے اپنے آپ کو باب سے زیادہ روحانی طاقتوں کا مالک ظاہر کیا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ بائی عقائد سے تمام شیعہ قیود خارج کر کے ایک نیا اصول مذہب مرتب کیا جس کو اس نے عیسوی، موسوی اور آتش پرست اصولوں سے ملحق کر دیا۔ بہائیوں کی کافی تعداد آج کل ایران، مصر، ترکی، ہندوستان اور امریکہ میں موجود ہے۔ اس فرقہ کے اصول مذہب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بابیوں نے ہر فرقہ اور مذہب سے اچھے اچھے اصول اخذ کر کے ایک معجون مرکب تیار کر لیا تھا۔ ۱۹ کا عدد بابیوں کے نزدیک نہایت متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ بہاء اللہ نے یہ دعویٰ کیا کہ ”میرے پاس باب کی پیشین گوئی کے مطابق خدا کے پاس سے آخری مرتبہ وحی آئیگی“ بابیوں کے پاس ہنوز گیارہ پارے تھے اور بہاء اللہ پر فرضہ وحی آنے سے بائی قرآن انیس پاروں پر ختم ہو جانا اور ساتھ ہی دنیا کا خاتمہ ہو جانا۔ (بابی عورت نر خاوند تک کر سکتی ہے اور شراب نوشی چنداں محبوب شمار نہیں کی جاتی)

اگرچہ بائی بہائی تحریک بنیادی طور پر مذہبی تاریخی اور سیاسی اہمیت رکھتی ہے۔ تاہم اس کا لٹریچر بھی کچھ اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ فارسی زبان میں باب کی تصنیفات بیان اور دلائل سببہ کافی شہرت



کی حامل ہیں۔ ایقان اور الواح بہار اللہ کی تصنیفات ہیں۔ سادہ نگاری کو ہر وقت، ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ عربی الفاظ بہت کم استعمال کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس مذہب کے متعلق اہم ترین کتابیں کتاب اقدس وغیرہ عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بہار اللہ کا اسلوب ادا باب کے مقابلے میں بہتر ہے۔ گوہینو کی رائے میں باب کا انداز تحریر لطافت رنگینی، چاشنی اور سلاست سے خالی ہے۔

آقا محمد تقی ہمدانی نے ”احقاق الحق“ میں اور حاجی حسین قلی نے ”منہاج الطالبین“ میں بآبی بہائی اصول و عقائد کی تکذیب و تردید کی ہے۔

سوال :- سیاحت نامہ، پر مفصل نوٹ قلم بند کیجئے۔

جواب :- اس کتاب کا پورا نام سیاحت نامہ ابراہیم بیگ ہے۔ اسے لکھنے والا حاجی زین العابدین تھا۔ حاجی زین العابدین کے بزرگ مراغہ سے آکر کردستان میں آباد ہوئے تھے۔ حاجی صاحب کا پیشہ سوداگری تھا۔ اپنے کاروباری دوروں کے اثناء میں انہیں بہت سے مقامات کی سیر و سیاحت کا موقع نصیب ہوا۔ وہ کاکیشیا، گرمیا، اور استنبول میں بہت دنوں ٹھہرے۔ شاید انہوں نے اپنے ہی سفر کا ذکر سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کے دلچسپ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ سیاحت نامہ کی زبان نہایت صاف، شستہ، سادہ سلیس، ہنچی ہوئی اور جدید طرز کی ہے۔ بیان میں قصص نام کو بھی نہیں۔ مصنف کی دقیقہ شناسی اور نکتہ نوازی کی جھلک ہر صفحے پر نظر آتی ہے۔ اسے ایران کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کے نظام سے نفرت ہے۔ وہ

اس نفرت کا اظہار نہایت لطیف اور خوشگوار طرز یہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ قدم قدم پر جاپان کی حیرت انگیز اصلاح و ترقی کو سراہتا ہے۔ جاپان کی معاشرت اور سیاسیات نے پچھلے چالیس پچاس سال کے عرصہ میں ہی جو سنہری انقلاب دیکھا ہے۔ حاجی زین العابدین اس کی تعریف کرتے ہوئے ایرانی جذبات میں بھی وہی جاپان کی ہی برقی قوت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

ایران جدید کا تقریباً مجموعی علم و ادب کسی نہ کسی پہلو سیاسی اغراض و مقاصد لئے ہوتا ہے۔ لیکن انتہائی حیرت کا مقام ہے کہ مستقل کتابوں کی بجائے رسالوں وغیرہ ہی میں بیشتر مضمین اشاعت پاتے ہیں۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ اور حاجی بابا اصفہانی کو اس زمرے سے نہایت خوش آئین استثنا حاصل ہے۔

حاجی زین العابدین نے ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔ اس سال مٹر فلٹ اور محمد کاظم شیرازی نے سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کو تصحیح کے بعد کلکتہ سے شائع کیا۔

## شاعر اعظم علامہ محمد اقبال

آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور (پاکستان) سے فلسفے کا امتحان ایم اے پاس کیا۔ پہلے اور سنٹنل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ جانا ہوا۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور کیمبرج سے

فلسفہ کی ڈگری پائی۔ اس کے ساتھ ہی بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔  
۱۹۲۳ء میں آپ کو برطانوی حکومت کی طرف سے سر SIR کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ اردو میں آپ کی مشہور تصنیفات یہ ہیں:۔ بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم۔ فارسی میں آپ کی تصنیفات ہیں:۔ زبور عجم، جاوید نامہ، پیام مشرق۔

ولایت سے واپس آکر آپ نے فارسی زبان میں دوثنویاں تصنیف کیں۔ ”اسرار خودی“ اور ”رموز بیخودی“، لکھیں۔ آپ کی آخری تصنیف ”ارمغان حجاز“ آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ آپ کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ہوا۔

دنیا نے آپ کو اردو اور فارسی شاعری کا بے مثال امام مانا ہے۔ آپ نے قناعت اور عجز کے بجائے کشمکش اور خودی کی تعلیم دی، تیز ترک گام زن منزل مادونست

اقبال کے دل میں شروع سے مادر وطن کے لئے درد تھا۔ آپ کا کلام غلامی کے خلاف جہاد ہے۔

از غلامی دل بمیزد در بدن      از غلامی روح گرد و بار تن  
از غلامی بزم بخت فرد فرود      ایں و آن با آں و این اندر نبرد  
از غلامی مرد حق زنار بند      از غلامی گوہر شش ناز و جنت  
غلامہ مرحوم عورت کو ذہنی ارتقا، پاک جذبات، محبت اور عشق کا جسم پیکر خیال کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک مغرب زدہ عورت عورت نہیں ہے۔

لے زناں لے ماراں لے خواہراں      زلستین تا کے مثال دہراں

دلبری اندر جہاں مظلومی است      دلبری محکومی و محرومی است

## مرزا ابراہیم خاں پور داؤد

آپ رشت کے مقام پر ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے طہران چلے گئے۔ طب قدیم کا علم حاصل کیا۔ شام میں فرانسیسی زبان سیکھی۔ فرانس میں جا کر فرانسیسی ادب کا وسیع مطالعہ کیا اور قانون پڑھا۔ ۱۹۱۰ء میں آپ نے پیرس میں ایرانیوں کی علمی و ادبی انجمن قائم کرنے میں بڑی کوشش کی۔ ایران واپس آکر آپ نے روزنامہ ”رستخیز“ جاری کیا۔ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان آکر عرصہ تک بمبئی میں قیام کیا اور اوستا کی تفسیر لکھی۔ آپ کا اشعار کا دیوان ”پورانہ تخت نامہ“ کے نام سے ملتا ہے۔ دوسری تصانیف یہ ہیں:-

تفاسیر رشتہا، ایران شاہ وغیرہ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

یکے گیتی، یکے بیزداں پرستند	یکے پیدا، یکے پنہاں پرستند
یکے بودا و آں دیگر برہمن	دگر زان موسلی چوپاں پرستند
یکے ذات مسیح ناصری را	لسان حضرت سبحان پرستند
اگر پرسی ز کیش پور داؤد	جو ان پارسی ایران پرستند

سوال: ملک الشعرا بہار کی زندگی مختصراً بیان کیجئے اور اس کی علمی و ادبی خدمات پر نوٹ لکھئے:-

جواب: ایران جدید کی شاعری کا محور حب الوطنی، سیاسی بیداری، طنز، مزاح، جدتِ تعلیم و تربیت، اخلاق، حقیقت نگاری

اور ملکی و ملی جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔ مذہبی عشقیہ اور مدحیہ شاعری کو دور ہی سے سلام کہا جاتا ہے۔ آقا محمد اسحاق نے جدید ایران کے شاعروں کو چار زمروں میں تقسیم کیا ہے:-

۱۔ جن کے یہاں

۱۔ مضامین بھی پُرانے ہیں اور اسلوبِ ادا بھی پُرانا ہوتا ہے۔

۲۔ مضامین تو نئے ہیں لیکن اسلوبِ ادا پُرانا ہے۔

۳۔ مضامین بھی نئے اور اسلوبِ ادا بھی نیا ہے۔

۴۔ نئے انداز کے لطیف گیت ہیں۔

ملک الشعرا بہارِ دوسرے اور چوتھے زمرے میں آتے ہیں، آپ ۱۸۸۶ء میں مشہد کے مقام پر پیدا ہوئے۔ علومِ درسیہ میں خاطر خواہ دسترس پائی۔ ایک مدت تک مشہد میں امام رضا کے مقبرے پر پُر خلوص مجاور رہے۔ اسی مقدس شہر سے آپ نے جدید ایرانی کانسٹی ٹیوشن کے آخری حصے میں یعنی ۱۹۱۱ء سے ایک پرچہ ”نوبہار“ کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ فنی اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے صرف ادب اور تربیت کو نوبہار کی فکر کے پرچے کہا جاسکتا ہے۔ نوبہار کی دلیرانہ پالیسی، سیاسی بحث و تھمیس، انقلاب انگیز نظموں اور کھری کھری باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے سرکاری حکم سے بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی پرچہ تازہ بہتار کے نام سے دوبارہ چھپنا شروع ہو گیا۔

بہار کا پورا نام مرزا محمد تقی ہے۔ آپ کے والد مرزا محمد کاظم صبوری بھی ملک الشعرا تھے۔ بہار نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۹ء تک

خراسان کے سیاسی انقلابات میں شرکت کی۔ بلند پایہ سیاسی مقالات اور انقلابی نظمیں لکھیں۔ تہ بہار کے علاوہ آپ ایک مجلہ ادبی دانشگاہ کے بھی مدیر رہے۔

بہار کے مکمل دیوان میں کوئی بیس ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اس میں قصائد، نظمیں، غزلیں، ثنائیاں، گیت، رباعیاں اور قطعے سب کچھ موجود ہے۔ شعر و شاعری کے علاوہ آپ نے بیش قیمت سیاسی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ایک چھوٹا سا ناول نیزنگ سیاہ دکنیزان سفید کے نام سے لکھا ہے۔ تاریخ سیستان کی تصحیح و تنقیح بھی کی۔ بہار کے کلام میں حب الوطنی کے پاک جذبات اور تلقین بیداری کے پرجوش اظہارات کا عنصر غالب ہے۔

بہار نے کچھ کی جو لطافت آمیز اور جدت سے لبریز ہو چکی ہے

اس سے ہمارے تمام عزیز دوست محفوظ ہو چکے ہیں۔ یہاں آپ کی مشہور نظم ”دماوند“ سے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

گر آتش جاں نہفتہ داری سوزد جاننت بجاننت سوگند

بلغن زپئے این اساس ترور بگسل زہم این نثراد و بیوند

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

مخلوق جہاں بگرگ مانند دست با قادر عاجز ند و بر عاجز نیست

سست اند بگیرد ارچو باشی سخت سخت اند بکار زارچو باشی سست

سوال: اشرف گیلانی کی شاعری اور زندگی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔



جواب: سید اشرف علی گیلانی ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے، آپ کو ایران کی سیاسی بیداری اور تعلیم جدید کے حامیوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ۱۹۰۶ء کے انقلاب عظیم نے ایران میں جو ادبی ستارے پیدا کئے ہیں ان میں وہ خدا، عارف غزویٰ اور بہار مشہدی کے پہلو بہ پہلو اشرف گیلانی کا نام بھی آتا ہے۔ سید اشرف نے رشت کے مقام پر ”نسیم شمال“ کے نام سے ایک بلند پایہ پرچہ جاری کیا جس میں علمی، ادبی، تاریخی، اصلاحی اور سیاسی مضامین نظم و نثر میں شائع ہوتے تھے دسمبر ۱۹۱۱ء میں اشرف شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اس کے چھاپہ خانہ کو روسیوں نے تباہ کر دیا۔

اشرف گیلانی کی شہرت کا زیادہ تر انحصار ان نظموں پر ہے جو اُس نے دقتانوسی ملاؤں کی تنگ نظری، بے علمی اور کٹر پن کے خلاف جہاد کے طور پر بہت عمدہ دلکش رنگ میں لکھی ہیں۔

## پروین اعتصامی

پروین ایران کی ایک بلند مرتبہ شاعرہ ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۱۰ء میں بمقام تہران ہوئی۔ آپ کے والد مرزا یوسف خاں ایران کے مشہور حریہ ہمار کے مدیر تھے۔ پروین کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے تہران کے امریکی اسکول نسواں میں داخل کرایا گیا۔ انہوں نے اس درسگاہ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ باوجود مغربی تعلیم کے آپ نے مشرقی تسواتی اوصاف کو ترک نہ کیا۔ آپ اپنا بیشتر وقت مطالعہ

میں صرف کرتی تھیں اور سماجی یا سیاسی زندگی سے الگ تھلک رہتی تھیں۔  
ایران کے حکمران رضا شاہ پہلوی نے آپ کو اپنی ملکہ کی اتالیق  
(ٹیوٹر) مقرر کرنا چاہا مگر آپ نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔ آپ نے  
بچپن سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کا پہلا دیوان پانچ ہزار  
اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ دیوان ۱۳۵۲ء میں تہران میں شائع ہوا۔

آپ ایران کے عظیم شعرا میں شمار ہوتی ہیں۔ غزل بہت کم کہی ہے  
عورتوں کی بیداری کے لئے بڑا کام کیا ہے لیکن خیالات اعتدال کی  
حد سے آگے نہیں گزرتے۔ آپ شاعروں کے اس زمرے میں شامل  
ہیں جو نئے نئے مضامین پرانی طرز میں ادا کرتے ہیں۔ آپ اکثر اخلاقی  
نظمیں کہتی ہیں۔  
نمونہ کلام :-

لے دل بقادوام و بقائے چنان داشت  
ایام عمر فرصتِ برقی جہاں داشت  
رہنِ خمیر آنکہ ازین خوانِ گوناگوں  
قسمتِ ہماہ و از بجز استخوان داشت

شنیدہ اید کہ آسائشِ بزرگانِ صیت  
برائے خاطر بے چارگانِ نیا سودن  
بکاخِ دہر کہ آلائش است بنیادش  
مقیم گشتن و دامنِ خود نیا سودن

سوال: فارسی غزل کی ابتدا اور ترقی پر ایک جامع نوٹ لکھیے  
جواب: عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اس لئے جہاں انسان  
سے عشق ہے وہاں شاعری عشق و محبت کے اظہار.....

سے خالی نہیں ہو سکتی ہے۔ کوئی قوم شاعری کے بغیر وجود نہیں رکھتی۔ ایران شعر و شاعری میں کسی ملک سے پیچھے نہیں۔ بلکہ ایران میں جس قدر عشقیہ شاعری کوئی ترقی ہوئی اور کسی صنفِ سخن کو نہیں ہوئی یعنی غزل کوئی سب سے زیادہ مقبول عام ہے کیونکہ عشق کا جذبہ غزل کی جان ہے۔

ابتداء میں غزل جو شِطیع سے نہیں بلکہ اقسام شاعری کے پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی۔ قصیدہ کے شروع میں عشقیہ اشعار بطور تشبیب کہنے کا رواج تھا۔ اس حصہ کو الگ کر لیا تو غزل بن گئی گویا قصیدہ کے درخت سے ایک قلم لے کر الگ پیئر لگا دیا گیا۔

فارسی شاعری کا بابا و آدمِ رود کی ہے جس کے زمانے میں غزل وجود میں آچکی تھی۔ غزل کی تحریک عشق و محبت کے جذبے سے ہوتی ہے اس کی ترقی تصوف کے ساتھ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے حکیم سنائی نے غزل کو مقبول بنایا اور اسے کافی ترقی دی۔ ان کے بعد اوحدی مراغی نے غزل کو جذبات سے معمور کیا۔ زبان میں نزاکت، صفائی، روانی اور سلاست پیدا کی۔ اوحدی کے بعد عطار، مولانا روم، عراقی وغیرہ نے غزل کو مزید ترقی دی۔ چونکہ یہ لوگ عشق حقیقی (خدا سے لڑ لگانا) کے جاندار تھے اس لئے ان کے کلام میں عشقِ حجازی (انسان یعنی عورت سے عشق) کی بجائے حقیقت کا پہلو غالب ہے۔ اس بنا پر ان کی غزلیں مقبول عام نہ ہوئیں۔

تا تاری حملوں سے ایران میں امن و امان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس سے دردِ غم اور سوز و رنج کے جذبات انسانوں اور ساتھ ہی شاعروں پر غالب ہوئے۔ رنج و الم کے جذبات کا اظہار غزل سے ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے

اس دور ابتری میں غزل گوئی نے ترقی کی۔ اس عہد کے شاعر شیخ سعدی قادر الکلام تھے۔ انہوں نے اس صنف کو اپنا کر غزل کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس سے سارے ایران میں آگ سی لگ گئی۔ ان کے بعد سلمان اور خواجہ نے اس شراب کو اور تیز کر دیا یعنی غزل کی خوب ترقی ہوئی۔ ان کے دور کے آخر میں خواجہ حافظ شیرازی اُٹھے اور سب غزل گو شاعروں پر سبقت لے گئے۔ انہوں نے یہ نغمہ اس جوش و خروش سے چھیڑا کہ زمین سے آسمان تک گونج اُٹھا۔ غزل حد کمال تک پہنچ گئی۔ غزل میں نہ صرف عشق بلکہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار ہونے لگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عرفی، نظیری، صائب، کلیم وغیرہ نے غزل میں تمدنی، اخلاقی، معاشرتی، پسند و نصیحت ہر قسم کے مضامین ادا کئے۔ خواجہ حافظ کے بعد غزلیہ شاعری کی ترقی ڈیڑھ سو برس تک رُک گئی۔ خواجہ صاحب کے راستے پر چلنا تو دشوار تھا اس لئے نئی راہیں نکالی گئیں۔ اس دور جدید کے بانی بابا فغانی ہیں۔ آپ کے انداز کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات کی حدت، اختصار کلام اور خیال کی الجھن ہے۔ فغانی کے طرز کے پیرو عرفی، نظیری وغیرہ ہندوستان چلے آئے تھے جہاں مقامی مذاق اور خاص رجحان نے غزل میں زیادہ رنگینی اور لطافت پیدا کر دی۔ خاص ایران کے شعرا میں محتشم کاشانی اور شفقانی نہایت مقبول اور نامور ہوئے۔

شرف جہاں جو صرف غزل کہتے تھے غزل میں معاملہ بندی کو اس حد تک لے آئے کہ اسے ایک فن کی صورت دیدی۔ آپ کا دیوان ایک ہزار شعروں پر مشتمل ہے جو سرتاپا اسی انداز میں ہے یعنی معاملہ بندی کا

جوہر غزلوں میں نمایاں اور غالب ہے یہ طرز اس قدر مقبول ہوا کہ قفانی کے طرز کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ قفانی کی خیال بندی، مضمون، آفرینی اور وقت پسندی اعتدال کی حد سے بڑھ گئی اور عالم سخن پر ناظر علی، بیدل وغیرہ کا اقتدار ہو گیا۔ نئے رجحان اور نئے طرز کی راہیں کھل گئیں۔ تغیر زمانہ کے ساتھ غزل پر بھی ہمدرد رنگ چھانے لگا۔

## تلمیحات ALLUSIONS

فارسی ادب میں جا بجا اہم تاریخی واقعات و حوادث کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ عشق و محبت کے قدیم افسانوں کے کرداروں کا ذکر بھی اکثر آتا ہے۔ ان حوالوں یا تلمیحوں کے علم کے بغیر ادب کو سمجھنا دشوار ہے۔ اس لئے ادب کے مطالعہ کے لئے تلمیحات کا ذکر کر دینا واجب ہے۔ اردو ادب اور فارسی ادب دونوں باہم وابستہ ہے۔ دونوں میں یکساں تلمیحات اکثر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تلمیحات کی تصریح کے لئے شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مشہور اور اہم تلمیحات ملاحظہ فرمائیں:-

### ۱۔ آب بقا :-

کہانیاں ہیں حکایتِ خسرو آب بقا۔ بقا کا ذکر کہاں اس جہانی فانی میں کہتے ہیں کہ سکندر اعظم سے حضرت خضر علیہ السلام کی کہیں ملاقات ہو گئی۔ سکندر نے انہیں آب بقا یعنی آب حیات دیا اور لے لیا۔ حضرت خضر سکندر کو آب حیات کی طرف لے چلے جب آب حیات کے چشمے کے قریب پہنچے تو کہتے ہیں کہ راستے میں بارہ بارہ کوس تک اندھیرا سی اندھیرا تھا۔ اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے ع

”کہ آج چشمہ جیواں درون تاریکی ست“  
 بارہ کوس کی تاریکی کو چیر کر جب سکندر چشمہ کے کنارے پہنچا تو حضرت  
 خضر کہیں ادھر ادھر ہو گئے۔ سکندر نے دیکھا کہ بڑھے کوئے جن کا  
 رنگ سفید پڑچکا تھا جب وہ اس چشمہ میں ڈبکی لگاتے ہیں تو سیاہ  
 رنگ کے ہو کر نکلتے ہیں۔ یہ دیکھ کر سکندر بھی ڈبکی لگانے ہی کو تھا  
 کہ یاس سے ایک بہت بڑھا آدمی ظاہر ہوا اور سکندر کو منع کرنے  
 لگا کہ اس چشمہ میں مت کود ورنہ مجھ جیسی حالت ہو جائے گی۔ نہ کھانے  
 کا مزہ رہے گا نہ پیتے کا اور پھر موت مانگے سے بھی نہ آئے گی۔ سکندر  
 اس بڑھے کا خستہ حال دیکھ کر آب حیات سے یونہی لوٹ آیا اور  
 پانی نہ پیا۔

## ۲۔ الیاس :

نہ پکڑیں دامن الیاس گردابِ بلا میں ہم  
 کہ بدتر دُوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا  
 جس طرح حضرت خضر تشکی پر بھولے بھٹکے مسافروں کو راہ دکھاتے  
 ہیں اسی طرح حضرت الیاس علیہ السلام سمندروں میں راستہ دکھانے  
 اور بھٹکنے والوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ شعر میں کسی کا سہارا لینے کی  
 مذمت کی گئی ہے خواہ وہ سہارا حضرت الیاس ہی کیوں نہ دیں اسی  
 مطلب کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

حقاً کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است

رفتنِ بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

۳۔ آتشِ نمرود یا نارِ خلیل :



بے خطر کو دیر آتش نمرود میں عشق عقل ہے جو تماشا کے لب بام ابھی  
 پرانے زمانے میں ملک عراق میں ایک بڑا زبردست اور ظالم بادشاہ  
 نمرود حکومت کرتا تھا۔ وہ اتنا مغرور تھا کہ خدائی کا دعویٰ کرتا اور لوگوں سے  
 اپنے آپ کو سجدہ کروانا تھا۔ حضرت ابراہیم پیغمبر کا لقب خلیل اللہ خدا کا  
 دوست تھا۔ آپ نے اپنی قوم کے بتوں کو توڑ ڈالا اور خدا پرستی کی تلقین  
 کی۔ اس پر بادشاہ نمرود نے غضب ناک ہو کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ  
 کو آگ میں جلادینے کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال  
 دیا گیا لیکن خدا کے کرم سے وہ آگ گلزار بن گئی اور خلیل اللہ کو کوئی  
 آہنج نہ آئی اور وہ اس امتحان میں پورے اترے۔ اس واقعہ سے متعلق  
 ایک بحر شعر ملاحظہ ہو۔

خلق کریم و نفس نفیس و ابر مفیض و فائز رحمت  
 آب بقا و خاک شفا و نار خلیل و باد مسیحا

۴۔ آدم کا خلد سے نکالنا یا بسوڑا آدم:

نکلنا خلد سے آدم کا مٹنے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

شیطان ابلیس کو درگاہ الہی سے نکال دیا گیا کیونکہ اس نے  
 آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس لئے وہ انسان کا دشمن ہو گیا۔  
 آدم کو خدا نے بہشت میں رکھا اور اس کی دلچسپی کے لئے وہاں خواہ  
 پیدا کیا۔ خدا نے آدم کو شجر ممنوعہ کا پھل کھانے سے منع کر رکھا تھا۔  
 شیطان نے خواہ کو بہکایا اور خواہ کے ہاتھوں آدم کو ممنوعہ پھل کھلا دیا۔  
 اس پر خدا آدم سے ناراض ہو گیا اور اس نے آدم اور حوا دونوں کو

بہشت سے نکال دیا۔ اور زمین پر بھیج دیا۔ اس واقعہ کو "سقوط آدم" (FALL OF ADAM) کہتے ہیں۔

### ۵۔ بار امانت : ۱۔

آسمان بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند  
قرآن مجید میں آیا ہے کہ خدا نے آسمانوں، زمینوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے سپرد اپنی خلافت کا بار امانت کرنا چاہا لیکن ان سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور انکار کر دیا۔ پس انسان نے اس بار امانت کو اٹھالیا۔ اس کے بعد انسان کے متعلق فرمایا گیا "إِنَّهٗ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا" یعنی تحقیق وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا جاہل ہے۔ اسی کے متعلق خاقانی ہند حضرت ذوقی فرماتے ہیں :  
جو بار آسمان و زمین سے ڈاٹھ سکا تو نے غضب کیا دلِ شیدا اٹھالیا

### ۶۔ براق معراج : ۱۔

صبح دم فکر جو تھا میر فلک کا مشتاق عرش پر چڑھ گیا اک آن مانن براق  
براق اس جو پایہ سے مراد ہے جس پر معراج کی رات کو حضرت پرفیض اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری کی تھی۔ کہتے ہیں کہ سواری بڑی تیز دوڑتی تھی اور پہلوں میں کروڑوں میل کی مسافت طے کرتی ہوئی ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پہنچتی تھی۔ اس سواری کی شبیہ اس قسم کی بتائی جاتی ہے کہ سر انسان کا پاؤں گھوڑے کے سب گھر چیتے کی سی اور چھاتی شیر کی سی تھی۔

### ۷۔ بتان آذر : ۱۔

بتان آذر کو اس عہد کے تو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے

اٹھا تبر اور خلیل بن کر ٹوٹا نیرود کو بچھا کے  
 آذر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تھا جو اپنے وقت کے  
 بہت بڑے بہت تراش تھے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کے  
 بیت خانے کے تمام بت توڑ ڈالے جس کی سزا کے طور پر آپ کو بادشاہ  
 وقت نمرود نے آگ میں ڈلوادیا لیکن یہ آگ آپ پر کوئی اثر نہ کر سکی۔

#### ۸۔ بازار مصر:۔

ایک انٹی صورت پر بکنا ہے یوسف سا جیل  
 مصر کے بازار میں یہ حسن کی قیمت پڑی  
 کہتے ہیں کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے  
 مصری سوداگروں کے ہاتھ بیچ دیا تو وہ آپ کو لے کر مصر کے بازار میں  
 پہنچے۔ اس موقع کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ آپ کو خریدنے کے لئے  
 ایک بڑے عیسا سیرت کی انٹی بطور قیمت اٹھا کر لے آئی۔

#### ۹۔ پیرہن کا غزی:۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا  
 کا غزی ہے پیرہن ہر سیکر تصویر کا  
 قدیم ایران میں جب کسی پر ظلم ہوتا تھا تو وہ انصاف کے لئے  
 عدالت میں جاتے وقت سفید کاغذ کا ایک بڑا سا پونچھ پینا کرتا تھا جس  
 پر سرخ لہو کے چھینٹے دیئے جاتے تھے تاکہ دور سے ہی معلوم ہو جائے کہ  
 وہ فریادی ہے

#### ۱۰۔ تحمیل صراحی:۔

رو بہ تجمل، حق بہ تحمیل، کف بہ تکلف، لب بہ تکلم

روکش دسٹ، ہمسر صالح، ہمرہ موٹی، ہمدام علیؑ۔  
 حضرت صالحؑ کا تحمل مشہور ہے۔ آپ قِیمِ عادی سے تھے۔ آپ کی  
 قوم نے آپ سے یہ معجزہ طلب کیا کہ پہاڑ سے اونٹنی پیدا ہو اور وہ پیدا  
 ہوتے ہی تالاب سے پانی پیئے اور پھر جیتی رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔  
 کئی لوگ آپ پر ایمان لے آئے۔ آپ نے لوگوں کو منع کیا کہ اس اونٹنی  
 کو کوئی گزند نہ پہنچائے۔ کیونکہ یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ آپ کی قوم میں چار  
 آدمی سخت شریر تھے۔ انہوں نے شراب پی لی اور اس اونٹنی کو مار ڈالا۔  
 حضرت صالحؑ کو جب یہ خبر ملی تو آپ تحمل کر کے چپ ہو رہے اور اس  
 معاملے کو خدا کے سپرد کر کے آپ شہر سے نکل گئے۔ کہتے ہیں کہ اس شہر  
 پر ایسا غضب نازل ہوا کہ سارا شہر برباد ہو گیا اور تمام اہل شہر ہلاک  
 ہو گئے۔ یہ بھی کافر تھے کیونکہ مومن حضرت کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔

### ۱۱۔ تخت بلقیس

تخت بلقیس کی نہیں حاجت ہم سلیمانؑ نہیں گداہیں تیرے  
 حضرت سلیمانؑ نے ایک دن تمام پرندوں، جنوں، دیوؤں اور  
 پریوں کو حاضر دربار ہونے کا حکم دیا۔ سب آگے، لیکن ہڈ ہڈ نہ آیا تھوڑی  
 دیر کے بعد جب ہڈ ہڈ آیا تو حضرت نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہا۔ اس  
 نے جواب دیا کہ وہ شہر صبا میں تھا جہاں بلقیس نام کی ایک ملکہ حکومت  
 کرتی ہے اور اس کا تخت دنیا میں بے مثل ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے  
 اپنے اُمرا و اعیان سے پوچھا کہ کون جلد سے جلد ملکہ بلقیس کو اس  
 کے تخت کے ساتھ میرے دربار میں لاسکتا ہے؟ ایک جن کہنے لگا۔  
 ”حضور! آپ ذرا اندر سے ہو کر اٹے پاؤں واپس آئیں تو آپ ملکہ

بلقیس کو تخت سمیت اپنے سامنے پائیں گے۔ اس پر حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا نے کہا: ”آپ پلک جھپکیں تو سامنے ملکہ بلقیس کو تخت سمیت دیکھئے گا۔“ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس سے شادی کر لی اور مملکت صبا کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

### ۱۲۔ جوئے شیر:

کاوکا و سخت جانہائے تنہائی نہ پوچھ  
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا  
شیریں ملکہ ایران کے عاشق فریاد کو ٹالنے کے لئے شہنشاہ ایران خسرو پرویز نے اس کے سامنے شیریں کو حاصل کرنے کے لئے کوہ بیستون سے دودھ کی نہر کاٹ کر لانے کی شرط پیش کی جوئے شیر لانا اب محاورہ ہے بمعنی مشکل کام کرنا

### ۱۳۔ جامِ جم:

آئینہ اسکندر جامِ جم است بنگر  
تاہر تو عرفہ دار و احوالِ ملکِ ارا  
شہنشاہ جمشید کے پاس ایک جام تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک نگاہ ڈالنے سے تمام دنیا کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔

### ۱۴۔ چاہِ بیزن:

ہونگے کوئی جو جہاں کو کہتے ہیں فردوس ہے  
یہ سیہ خانہ ہمیں تو چاہِ بیزن ہو گیا  
بیزن رستم کا دوست تھا۔ دونوں توران گئے۔ رستم نے روداہ

سے شادی کی اور بیژن نے افراسیاب کی لڑکی منیترہ سے لیکن افراسیاب نے ناراض ہو کر بیژن کو کنوئیں کی مانند ایک قید خانے میں بند کر دیا۔ اسی کو فردوسی نے چاہ بیژن لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ منیترہ اپنے خاوند بیژن کے لئے ٹکڑے مانگ مانگ کر اس کنوئیں میں ڈال آتی تاکہ اس کا عاشق زندہ رہے۔ ایک جگہ فردوسی نے لکھا ہے کہ

منیترہ منم دختِ افراسیاب      برہنہ نہ دیدہ تنش آفتاب  
برائے یکے بیژنِ شوره بخت      قتادم ز نواج و قتادم ز تخت  
۱۵۔ چاہ کنعان : ۱۵

یہ جہاں اپنے لئے ہے چاہ کنعاں سے سوا  
دے کے دھوکا اس میں ہم کو سارے بھائی چل دیے  
چاہ کنعان اس کوئیں کو کہتے ہیں جس میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے آپ کو گرا دیا تھا اور اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے اگر کہہ دیا تھا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا لے گیا ہے۔ اسی چاہ کنعاں کو چاہ ۱۵ یوسفؑ بھی کہتے ہیں۔

۱۶۔ حاتمِ دوراں : ۱۶

حاتمِ دوراں شذرِ نغان، رستمِ دستاں، شیرِ نیساں  
تو بہ سخاوت، تو بہ عنایت، تو دمِ جرات، تو سرِ ہیجاں  
حاتمِ طائی یمن کا شہزادہ تھا جو سخاوت میں مشہور عالم تھا۔ کہتے ہیں یہ ایک گھوڑے کو بہت عزیز رکھتا تھا لیکن ایک دن جب اس کے یہاں کوئی ہمان آیا ہوا تھا، رات کا وقت تھا اور ہمان کو کھلانے کے لئے اس کے پاس کوئی اونٹ وغیرہ نہ تھا تو حاتم نے اپنے ہمان



کی تواضع کے لئے وہی عزیز گھوڑا ذبح کر ڈالا۔

۱۷۔ حسن یوسف :۔

حسن یوسف دم عیسیٰ یوسفیاداری

آنچہ خوباں ہمہ وارند تو تنہا داری

کہتے ہیں کہ حضرت یوسف بہت ہی خوبصورت تھے۔ عزیز مصر (شاہ مصر) کی بیوی زلیخا آپ پر فدا ہو گئی اور جب سوداگروں نے انہیں مصر کے بازار میں بیچنے کی پیشکش کی تو زلیخا آپ کو خرید کر لے آئی۔ اس پر اس کی عورتوں نے زلیخا کو طعنے دئے کہ تو کس پر مرتی ہے۔ اس میں کیا خوبی ہے؟ زلیخا نے سب عورتوں کو دعوت پر بلایا اور ان کے ہاتھوں میں ایک ایک چھری اور کاٹنے کو ایک ایک لیموں دیا۔ اس کے بعد زلیخا حضرت یوسف کو ان سب کے درمیان لے آئی۔ وہ سب کی سب عورتیں حضرت یوسف کے حسن کو دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئیں کہ اپنی سمدھ بدھ کھو بیٹھیں اور لیموں کو کاٹنے کی بجائے اپنا اپنا ہاتھ کاٹنے لگیں۔ اس پر زلیخا نے انہیں بتایا کہ تم کیا کر رہی ہو؟ سب ہوش میں آئیں تو بڑی شرمسار ہوئیں اور یوسف کے حسن کی قائل ہو گئیں۔

۱۸۔ خون سیاوش :۔

منا نام افرسیاب اس جہاں سے

یہ خون سیاوش ہے کیا رنگ لایا

سیاوش ایرانی شہزادہ تھا جس کی شادی توران کے بادشاہ افراسیاب کی بیٹی فرنگیز سے ہوئی۔ جب ایرانیوں اور تورانیوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو افراسیاب نے اپنے داماد سیاوش کو قتل

کودیا۔ جب ایران میں یہ خبر پہنچی تو مشہور ایرانی پہلوان رستم سیاوش کا بدلہ لینے توران گیا اور افراسیاب اور توران کی دھجیاں اڑا کر واپس آیا۔  
۱۹۔ خاتم سلیمان:۔

النَّارُ النَّارُ نَفْسُهُ تَرَا عَالِي رَتَبِهِ

جس کی انگلی میں پہنائے گا سلیمان خاتم

کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان ؑ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کے طفیل تمام جن و ملک و حیور و غیرہ آپ کے تابع فرمان رہتے تھے۔ ایک دفعہ اس انگوٹھی کو صحرہ نامی ایک بدطینت دیو نے چرا لیا۔ حضرت سلیمان ؑ کے ہاتھ سے سلطنت جاتی رہی۔ وہ انگوٹھی اس دیو کے پاس بھی نہ رہی اور سمندر میں گر پڑی جہاں اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ حضرت سلیمان ؑ ایک ماہی گیر شے یہاں ملازم ہوئے۔ اس ماہی گیر نے خوش ہو کر حضرت سلیمان کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی۔ ایک دن آنحضرت کے شسر (ماہی گیر) ایک مچھلی پکڑا کر لے آئے۔ جب آپ کی بیوی نے اس مچھلی کو چیرا تو آپ کی نگم شدہ انگوٹھی نکلی۔ آپ نے اسے پہن لیا اور دوبارہ سلطنت نصیب ہوئی۔ ماہی گیر کی بیٹی حضرت سلیمان ؑ کی ملکہ بن گئی۔ صحرہ دیو کو قراقرم سزا دی گئی۔

۲۰۔ دم عیسیٰ:۔

مر گیا صد مہ یک جنبش لب سے غالب

نا ترائی سے حر لیت دم عیسیٰ نہ ہوا

دم عیسیٰ یعنی حضرت عیسیٰ مسیح ؑ کا سانس ایک مشہور عالم معجزہ تھا۔ جب آپ کسی بیمار یا مژدہ پر دم پکھونکتے تو وہ تندرست اور زندہ ہو جاتا۔

## ۲۱۔ شمع طور سے

شوقِ نظارہ ہے جب سے اُس مرغِ پر نور کا  
ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا

کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰؑ شہرِ مدین سے اپنے وطن مصر کو جانے لگے تو بیابانِ سینا (SINAI) میں جسے بیابانِ تیب بھی کہتے ہیں کوہِ طور پر انہیں ایک روشنی نظر آئی۔ اس وقت غضب کی آندھی چل رہی تھی۔ اس پر حضرت موسیٰؑ دمِ دنگ رہ گئے اور پہاڑ کی طرف چلے۔ وہاں جا کر آپ نے دیکھا کہ پہاڑ کے اوپر ایک ہرے بھرے درخت کو آگ لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آواز آئی: ”اتار بک یا موسیٰ“ یعنی ”اے موسیٰ! میں تیرا رب (خدا) ہوں“ آپ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ جب کچھ اور نظر نہ آیا تو کہنے لگے: ”آر نی“ یعنی مجھے اپنا آپ دکھا۔ لیکن آگ سے جواب ملا: ”ن ترانی“ یعنی ”تو مجھے نہیں دیکھ سکتا“ پھر حضرت موسیٰؑ نے اصرار کیا۔ اس پر خدا نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا جلوہ دکھا یا جس پر آپ بیہوش ہو گئے۔ چنانچہ شمعِ طور سے مراد نورِ خداوندی ہے۔

## ۲۲۔ شق القمر سے

لگا کہ مہرِ مہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو  
یہ ہم کو جلوہ شق القمر دکھاتے ہو

مفسرِ لکھ نے پیغمبرِ اسلام سے کہا: ”زمین پر تو آپ کا جادو (نعوذ باللہ) چل جاتا ہے۔ ہم آپ کے کمال کو تب معجزہ سمجھیں گے جب آپ آسمان پر کوئی کارنامہ کر کے دکھائیں۔ آپ نے فرمایا: ”اچھا“ یہی بات ہے تو تم ہی بتا دو کہ کونسا کارنامہ دکھاؤں“ ایک کافر بلا ”چاند کے دو“

ٹکڑے کر دکھاؤ“ یسن کر آپ نے خدا کا نام لے کر چاند کی طرف انگشت شہادت کے ساتھ اشارہ کیا چنانچہ لوگوں کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا آپ کے اس معجزہ کو شق القمر کہتے ہیں۔

۲۳۔ شجر طوبی : ۵

قلم شارح شجر طوبی سے میرا اعمال نامہ لکھا ہے  
شجر طوبی اس درخت سے مراد ہے جس کا پھل کھا کر حضرت آدم و حوا بہشت سے نکالے گئے۔ حوا کو شیطان نے درغلا یا اور حوا نے حضرت آدم کو ثمر ممنوعہ (منع کیا ہوا پھل) کھلا دیا۔

۲۴۔ صور اسرافیل : ۵

گر لکھوں مضمون اپنے نالہ پر شور کا  
لوں صریح خامہ سے میں کام بانگِ صحر کا  
کہا جاتا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو فرشتہ اسرافیل اپنا نرسنگھا پھونکے گا جس کی آواز کے صدمے سے سب لوگ بیہوش ہونے شروع ہونگے اور پھر آہستہ آہستہ مر جائیں گے۔ نرسنگھا کے لئے عربی زبان میں لفظ ”صور“ ہے۔ چنانچہ صور اسرافیل سے مراد قیامت برپا کرنے والی آواز ہے۔ اسرافیل فرشتہ ہوا کا نام ہے۔

۲۵۔ صبر ایوب : ۵

درفراق تو بجا اے بت محبوبِ کتم صبر ایوب کتم، گر یہ یعقوب کتم  
حضرت ایوب علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ ان کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے رضائے الہی پر شاکر رہ کر صبر کیا۔

## ۲۶۔ عدل نوشیرواں : ۵

زندست نام فرسخ نوشیرواں بعدل گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماںد  
کیقباد شہنشاہ ایران کا بیٹا نوشیرواں بڑا عادل بادشاہ تھا۔ اس  
کے عدل و انصاف کے قصے مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور واقعہ  
اس کے انصاف کا یہ ہے کہ اس نے ایک بڑھیا کی جھوٹی بیٹی کو نہ  
گرایا جس کی موجودگی سے نوشیرواں کے محل میں ٹیڑھا پن پیدا ہو گیا۔  
۲۷۔ عصائے موسیٰ : ۵

معجزہ باد سے ماند عصائے موسیٰ  
شجر خشک بھی ہو جائے تر و تازہ نہاں  
حضرت موسیٰ ؑ کو کوہ طور پر ”ید بیضا“ اور ”عصائے جنت“  
دو معجزے عنایت ہوئے تھے۔ چنانچہ ید بیضا یعنی روشن ہاتھ کا  
معجزہ تھا اور عصائے جنت دراصل شجر طوبیٰ کی ایک شاخ تھی  
جو جبرئیل علیہ السلام نے حضرت موسیٰ ؑ کو خدا کی طرف سے لا کر  
دی تھی۔ یہ عصا (ڈنڈا۔ چھڑی) ہر ایک چیز کی شکل و صورت اختیار  
کر لیتا تھا۔ چنانچہ جب فرعون مصر نے حضرت موسیٰ ؑ کو مصر کے  
جادوگروں سے رک دلوائی چاہی اور انہوں نے رسیوں سے سنپ  
اور اژدہ بنادے تو عصائے موسیٰ ؑ ایک بڑے اژدہ کی شکل  
میں رونما ہوا اور مصری جادوگروں کے تمام سانپوں اور اژدہاؤں  
کو ہڑپ کر لیا۔ یہ دیکھ کر مصری جادوگر حضرت موسیٰ ؑ پر ایمان لے آئے۔

## ۲۸- فرعون مصر:۔

نفس بے مقدر کو قدرت ہو کر تھوڑی سی مٹی  
 دیکھ پھر سامان اس فرعون بے سامان کا  
 فرعون قدیم زمانے میں شاہان مصر کا لقب تھا اور عام لوگ  
 فرعون اس خاص بادشاہ کو کہتے ہیں جس کا نام ”سیتی نیپ تا“  
 تھا اور جو حضرت موسیٰ ؑ کے زمانے میں ہوا ہے۔ اس فرعون نے  
 بنی اسرائیل پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ جب حضرت موسیٰ ؑ اپنی قوم  
 بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر چلے تو فرعون فوج لے کر ان کے تعاقب  
 میں روانہ ہوا۔ فرعون اپنی فوج سمیت دریائے نیل میں غرق ہو گیا۔  
 کہتے ہیں کہ فرعون نے خدائی کا دعوے کیا تھا۔ خدا نے اس کے پیروؤں  
 کو بھی غرق کر دیا اس کے متعلق قرآن کریم میں یہ آیت ہے ”وَاعْرِضْنَا  
 آلِ فِرْعَوْنَ“ اس کے معنی ہیں ”اور ہم نے فرعون کے پیروؤں  
 کو غرق کر دیا“ ”فرعون“ عام طور پر مغرور و متکبر آدمی کے لئے استعمال  
 ہوتا ہے۔

## ۲۹- قم باذن اللہ:۔

ہماری لاش یہ آواز قم باذن اللہ  
 تم آ کے حضرت عیسیٰ ؑ عثت سناتے ہو  
 قم باذن اللہ کے معنی ہیں ”خدا کے حکم سے اٹھ“ کہتے ہیں کہ  
 حضرت عیسیٰ ؑ مردوں کو زندہ کرتے وقت یہ کلمات کہہ کر دم پھونکتے  
 تھے۔ یہ کلمات کہنے اور دم پھونکنے پر مردہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا۔  
 ”دم عیسیٰ ؑ“ بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔



## ۳۔ کوہ کن : ۵

تیشے بغیر نہ سکا کوہ کن اسد  
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

کوہ کن : پہاڑ کا ٹٹے والا۔ ایران کی ملکہ شیریں کے عاشق فرہاد کا لقب کوہ کن ہے۔ شاہ ایران خسرو پرویز نے یہ منظر فرہاد کے سامنے رکھی کہ اگر وہ کوہ بلیستون کو کاٹ کر دودھ کی نہر (جوئے شیر) لے آئے تو شیریں اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ جب فرہاد نے پہاڑ بلیستون کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکال لی اور خسرو پرویز کی شرط پوری ہو گئی تو شاہ ایران نے دعا کر کے یہ افواہ پھیلا دی کہ شیریں مری جی ہے۔ یہ سن کر فرہاد کے دل کو ایسا صدمہ لگا کہ اس نے پہاڑ کو کاٹنے والے تیشے کے ساتھ ہی اپنا سر کاٹ دیا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گویا کوہ کن سے مراد عاشق صادق و جاننا ہے۔

## ۴۔ گنج قارون : ۵

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی  
اگر ہاتھ آئے گا گنجینہ قارون نہ ٹھہرے گا

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل سے تھا۔ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے مصر سے فرار ہونے کے دن اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک ایسے آدمی کو دیکھا جس کا گھوڑا ایسی گھاس پر پلتا ہے کہ اس میں سونے اور چاندی کی سی چمک پیدا ہونے لگتی ہے۔ پس اس نے اس گھاس کو اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ بعد ازاں اس گھاس کے اثر سے اس نے سونے اور چاندی کے کئی خزانے فراہم

کر لئے۔ اور بڑا امیر کبیر آدمی بن گیا۔ حضرت موسیٰ ؑ نے قارون کو خدا کے راستے میں کچھ خیرات کرنے کو کہا۔ لیکن وہ نہ مانا جس کی پاداش میں خدا نے اُسے اس کے خزانوں سمیت زمین میں غرق کر دیا گنج قارون سے مراد بے شمار دولت ہے۔

### ۳۲۔ لیلیٰ و مجنوں :۔

مانع وحشت نرانی ہائے لیلیٰ کون تھا؟

خانہ مجنوں صحرانگرد بے دروازہ تھا

لیلیٰ اور مجنوں عرب کے دو معشوق اور عاشق ہوئے ہیں۔ پہلے دونوں مکتب میں ایک ہی کلاس سے پڑھتے تھے۔ وہاں ان کی آپس میں محبت ہو گئی۔ جب بڑے ہوئے تو ان کی محبت رسوا ہوئی۔ لیلیٰ کے باپ کو برا لگا۔ اس نے لیلیٰ کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ مجنوں لیلیٰ کے فراق میں پاگل ہو گیا۔ مجنوں کا اصل نام قیس تھا۔ یہ عام کے سردار کا بیٹا تھا۔ مجنوں کے باپ نے لیلیٰ کے باپ کے آگے بہت مدت و زاری کی کہ وہ مجنوں سے اپنی بیٹی کا بیاہ کر دے۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ آخر اسی طرح دونوں فراق میں گھل گھل کر مر گئے۔ لیلیٰ اور مجنوں کے عشق سے مراد عشق صادق ہے۔

### ۳۳۔ منصور کا قصہ :۔

حق تو یوں ہے یہ انانیت عجیب غماز ہے

قصہ پہنچایا زبان دار پر منصور کا

منصور ایک بڑے ولی اللہ ہوئے ہیں۔ آپ حلاج یعنی رومی

دھننے والے کا کام کرتے تھے لیکن خدا کے فیض سے آپ پر وحدت

وجود کی منزل وارد ہو گئی اور آپ کو اپنے آپ میں جلوہ حق نظر آنے لگا۔ چنانچہ مستی کے عالم میں آپ "انا الحق" کا نعرہ لگانے لگے۔ یعنی "میں خدا ہوں" کا ورد کرنے لگے۔ ایسا کہتا چو نکہ شریعت اسلام میں گناہ ہے اس لئے آپ کو پھانسی کی سزا دی گئی یعنی دار پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

۳۴۔ مارانِ ضحاک (یادِ فرش کا ویانی)۔

شائد ضحاک کی مانند اک اک اس کی موج

مارِ سپاہِ بن کے ہووئے متحد با خطِ بام

ضحاک نازی (عربی) نے ایران کے بادشاہ جمشید سے مملکت چھین لی۔ اس کے دونوں شانوں (کندھوں) پر دو سانپ لہرایا کرتے

تھے جن کے لئے ہر روز دو آدمیوں انسانوں کا مغز درکار ہوتا تھا۔ لوگ اس ظلم سے تنگ آ گئے ایک دن کا وہ نام کے ایک لوہار کے بیٹے کی بازی

آگئی۔ اس نے اس ظلم کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے اپنی دھونکنی

کو پھیڑ کر اس کا جھنڈا بنالیا (درفش کا ویانی)۔ کا وہ کا جھنڈا، لوگ جوق

درجوق اس کے جھنڈے کے تلے جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ سابق شہنشاہ

جمشید کا بیٹا فریدوں بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ اس بغاوت کا نتیجہ یہ

ہوا کہ ضحاک مارا گیا اور فریدوں کو سلطنت واپس مل گئی۔ بعد میں

ایران کی بہت سی لڑائیوں میں درفش کا ویانی تبرک کے طور پر فوج کے

ساتھ ہوا کرتا تھا۔ آخر یہ جھنڈا امداہن کی فتح کے موقع پر مسلمانوں کے

ہاتھ آ گیا اور نیست و نابود ہو گیا۔

## ۳۵۔ نوشدارو: ۵

نوشدارو سے بھی بہتر ہے دم رنج خمار  
 ساقیایہ شربت فریاد رس جام شراب  
 نوشدارو ایک مقوی اور مفرح معجون کا نام ہے جو کیکاؤس شاہ  
 ایران کے پاس تھی۔ کہتے ہیں کہ اس معجون کے اثر سے مرتا ہوا  
 انسان بھی صحت یاب ہو جاتا تھا۔ رستم نے جب غلطی سے اپنے  
 بیٹے سہراب کو گھائل کر دیا اور وہ دم توڑنے لگا تو اس نے سہراب  
 کی جان بچانے کے لئے کیکاؤس سے نوشدارو منگوا بھیجی مگر  
 کیکاؤس نے یہ معجون بھیجنے سے انکار کر دیا۔

## ۳۶۔ ہاروت ماروت (چاہ بابل) ۵

ہاروت سے واں لاگھوں ہیں شاگرد کہ جس جا  
 وہ چشم فسوں گر سبق آموز فسوں ہے  
 کہتے ہیں کہ خدا نے اپنے دو فرشتوں کو جن کے نام ہاروت اور  
 ماروت تھے دنیا کی سیر کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ فرشتے علم سحیر  
 (جادوگری) میں بڑے ماہر تھے۔ دنیا میں آکر عیش و عشرت میں  
 پڑ گئے اور ایک خوبصورت عورت (جس کا نام زہرہ تھا) کے عشق  
 میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے اُسے اپنا وہ علم بھی بتا دیا جس میں  
 کئی راز خداوندی پوشیدہ تھے۔ زہرہ اس علم کے طویل ستارہ بن

کر آسمان پر چمکنے لگی۔ لیکن ہاروت اور ماروت چاہِ بابل میں اپنے  
گناہ کی پاداش میں لٹکا دیئے گئے۔ وہ آج تک اس کنوئیں  
میں لٹکے ہوئے ہیں۔ چاہِ بابل کے گردا گرد دھواں ہی دھواں  
ہے جس کی تاریکی کی وجہ سے کوئی شخص انہیں دیکھ نہیں سکتا۔

بہ نسبت

